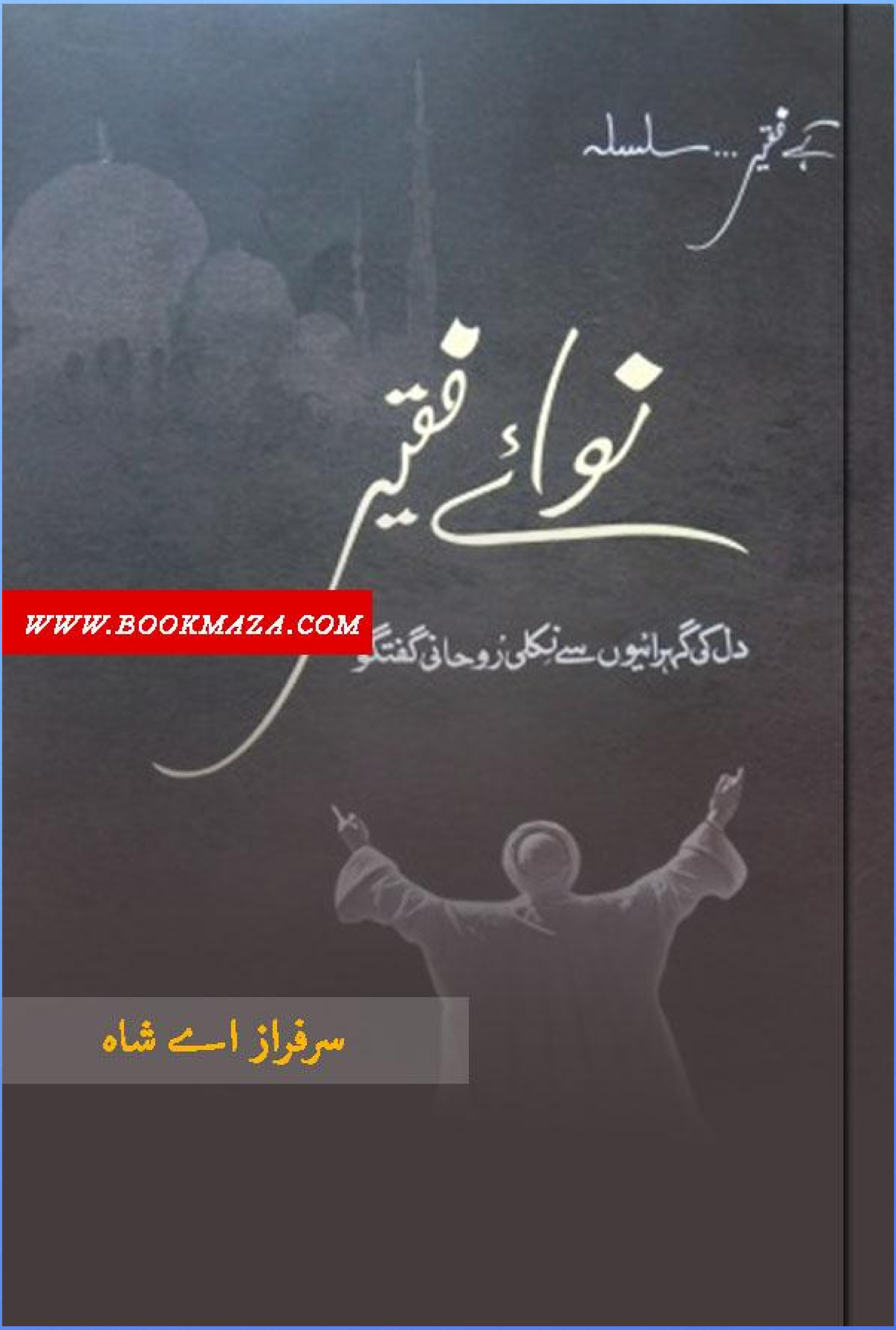


بے فقیر... سلسلہ
نوائے فقیر
WWW.BOOKMAZA.COM
دل کی گہرائیوں سے نکلی رُوحانی گفتگو
سرفراز اے شاہ

حرفِ آغاز

دُنیا کی بھول بھلیوں میں گم انسان جب کسی خوش بخت لمحے میں رازِ قدرت کا کھوج لگانے نکلتا ہے تو اُس پر انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی تو رب تعالیٰ کی معرفت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ معرفت نصیب اُس وقت ہوتی ہے جب دل آلائشوں سے پاک ہو۔ یہی ''نوائے فقیر'' ہے۔ عرفانِ ذات سے عرفانِ حق تک کے سفر کی جانب ایک قدم...... فقیر کی یہ نوا کس حد تک بااثر ہے، اِس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

اِس کتاب کی اِبتدا ایک نظم سے ہے جو میرے چالیس سال پہلے کے ایک افسر جناب ایس ایم نقی صاحب نے لکھی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی داستان بیان کرتی ہے جو نوائے فقیر کا حصہ ہے۔

سرفراز اے شاہ
212- جہانزیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

آپ بیتی

ہم کہاں سے تھے چلے، اور آج پہنچے ہیں کہاں
اپنی دُنیا کیسے بدلی، کِس طرح پہنچے یہاں
نہ کوئی کرتب ہے اپنا، نہ ہی کوئی خاص بات
بس فقط یہ ہے کہ کر لو جو کہے اللہ کی ذات
کیا ہے فرمایا خدا نے، سیدھی سادی بات ہے
جھوٹ مت بولو کیوں کہ خود وہ سچی ذات ہے
جھوٹے وعدے مت کرو اور مال بھی جھوٹا نہ دو
جو بھی وعدہ ہو کیا، ہر حال میں پورا کرو
علم پیدائش سے لے کر، قبر تک حاصل کرو
خَلق کی خدمت کرو، گر ہو سکے خیرات دو
صلہ رحمی حکم ہے، لوگوں کی دل جوئی کرو
اور کبھی غیبت نہ کرنا، خواہ کوئی دشمن بھی ہو
عدل بھی ہے رُکنِ دین، منصف بنو، انصاف دو
حق ادا کر دو سبھی کا، کوئی ہے کوئی بھی ہو
ماں باپ کا حق جو ہے، ہر حال میں پورا کرو
تا کہ پیری میں بزرگوں کو کوئی بھی دُکھ نہ ہو
بعد اِس کے ہیں حقوقِ اللہ، روزے اور نماز
حج بھی تم سے ہو سکے کر لو، کہ ہے وہ بے نیاز
بس صفائی نصف ایمان کا رہے تم کو خیال
یہ سبھی کرتے رہو، کر دے گا تم کو مالامال
فکر فاقہ پھر نہیں ہو گا، یہ ہے پختہ یقین
بے پناہ تم کو ملے گی، دولتِ دُنیا و دین

ایس ایم نقی

11-02-2015

فہرست

نشست نمبر 1

علم کی تقسیم

نشست نمبر 2

نورِ الٰہی

نشست نمبر 3

ہمارے روّیے

نشست نمبر 4

صحبت صاحبانِ علم وادب

نشست نمبر 5

فہم و فراست

نشست نمبر 6

چند رُوحانی نکتے

نشست نمبر 7

صحبت کے اثرات وثمرات

نشست نمبر 8

امر

نشست نمبر 9

حصولِ علم کی ابتدا

نشست نمبر 10

پاکیزہ سوچ کے ثمرات

نشست نمبر 11

حقیقت شناسی

نشست نمبر 12

معرفت کے رنگ

نشست نمبر 13

چھوٹی چھوٹی باتیں

نشست نمبر 14

روشن ضمیری

نشست نمبر 15

سورۃ حشر کے اہم مضامین

نشست نمبر 16

رُوحانیت کے دو قدم

نشست نمبر 17

اللہ کا نور اور حجابات

نشست نمبر 18

جوہر اور ارض

نشست نمبر 19

راہِ حق کی رُکاوٹیں اور بے غرض عبادت

نشست نمبر 20

رُوحانیت میں گائیڈ کی اہمیت

نشست نمبر 21

خلقِ خدا سے محبت

نشست نمبر 22

''حصہ''

نشست نمبر 23

راہِ تصوف میں علم و تربیت کی اہمیت

نشست نمبر 24

وجدانِ حیات

نشست نمبر 25

رب تعالیٰ پر بھروسا

نشست نمبر 26

علم وحکمت

نشست نمبر 27

رُوحانی دُنیا

نشست نمبر 28

خوشبو

نشست نمبر 29

رُوح کی اصل..... بلندی

نشست نمبر 30

دُعا کس طرح مانگیں

نشست نمبر 31

یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

نشست نمبر 32

شگون یا یقین

نشست نمبر 33

تقلید

نشست نمبر 34

اندھیری رات اور چاند

نشست نمبر 35

شعوری اِرتقا

نشست نمبر 36

معرفتِ الٰہی

نشست نمبر 37

باطنی معنی

نشست نمبر 38

علم ظاہر و باطن

نشست نمبر 39

سورہ یٰس کی فضیلت

اورادو وظائف کی تفویض میں شیخ کی نیت کی اہمیت

نشست نمبر 40

اُسلوبِ دُعا

نشست نمبر 41

خلافت کی ضرورت، شیخ کامل اور علم الاسماء

نشست نمبر 1

علم کی تقسیم

ہم سبھی علم کے متلاشی رہتے ہیں خاص طور پر رُوحانیت کے علم کے۔ اخبارات، رسائل یا کتب میں پڑھتے ہیں کہ یہ وظیفہ فلاں کام آجائے گا، اِس سے فلاں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہم وہ وظیفہ نہ صرف خود کرنے لگتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بتاتے ہیں کہ یہ پڑھ لو۔

وہ علم جو رب کی دوستی کے حصول کی بنیاد بنتا ہے اُسے حاصل کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہے کیونکہ علم حاصل کرنے اور تقسیم کرنے میں دو بنیادی Principles کام کرتے ہیں۔

1- Law of Diversity (اُصول تنوع)

2- Law of Evolution (اُصول اِرتقا)

Evolution (اِرتقا) اور Revolution (انقلاب) میں فرق یہ ہے کہ جہاں Abrupt (یک لخت) تبدیلی آتی ہے، وہ Revolution (انقلاب) ہے اور جہاں تدریج کے ساتھ تبدیلی آتی ہے، وہ Evolution (اِرتقا) ہے۔

علم حاصل کرنے اور بانٹنے میں دو بنیادی اُصول طالب علم اور اُستاد کے ذہن میں رہنے چاہییں۔ جب تک ہم اِن دو اُصولوں پر عمل نہیں کرتے، نہ علم بانٹا جا سکتا ہے اور نہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی ذہنی کیفیت اور ذہنی معیار دونوں علم کے حصول اور تقسیم میں بہت Important رول Play کرتے ہیں۔

جب ہم کسی بہت اچھے اُستاد کے پاس جاتے ہیں جو اپنے کام کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں تو وہ یونہی ہمیں علم نہیں دے دیں گے، جیسے ایک زمانے میں ڈاکٹر کے پاس ڈسپنسر اور کمپوڈر ہوتے تھے جنھوں نے لال دوا رکھی ہوتی تھی۔ ہر آنے والے کو وہ وہی لال دوا پکڑا دیتے تھے۔ اگر اُستاد بہت سمجھ دار نہیں ہیں تو وہ اپنے شاگرد کی ذہنی کیفیت اور معیار کو نہیں پرکھیں گے اور جو علم اُن کے پاس موجود ہے، وہ شاگرد کے حوالے کر دیں گے۔ یہ طریقہ بعض اوقات خاصی خطرناک Situation پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح ایک چار ماہ کے شیر خوار بچے کے منہ میں اُس کی ماں بغیر یہ سوچے نوالہ ڈال دے کہ اس کے دانت نہیں ہیں اور یہ نوالہ چبا اور نگل نہیں سکتا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی کا ٹکڑا جو چھ سات سال کی عمر میں بچے کو توانائی بخشتا ہے اور اُسے زندہ رہنے کے لیے قوت عطا کرتا ہے، اب اُس شیر خوار کے حلق میں پھنس جائے گا اور بڑے مہلک نتائج کا

سبب بنے گا۔ لیکن اگر اُسی بچے کو Low density دُودھ دیا جائے تو وہ بڑی آسانی سے اُسے پی اور ہضم کر لے گا اور یہ اُس کی جسمانی نشو و نما کا باعث بنے گا۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک اُستاد محفل میں بیٹھ کر جو علم بانٹ رہا ہے وہ سب کو ہضم ہو جائے اور نہ ہی ارسطو کی کتاب سے سب فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ مجھ جیسا غبی اور Dull آدمی جب ارسطو کی کتاب پڑھے گا تو اِس کا نتیجہ وہی ہو گا جو شیر خوار بچے کے منہ میں نوالہ ڈالنے کا ہوتا ہے۔

ہم صورت حال کو سمجھے بغیر جہاں سے جو ملے اُس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مزید مشکلات کا سبب بنتا ہے۔ رب تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے ہمیں یہ راہ دکھائی کہ ہم مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کریں۔ آپ ﷺ نے کبھی وہ بات کہی ہی نہیں جس پر خود عمل نہیں کیا۔ جس دور میں بھی پیغمبر رب کا پیغام لے کر آئے، وہ اُس دور کے انسانوں کی ذہنی سطح کے مطابق تھا۔ وہ تمام مذاہب جو الہامی ہیں اُن کی اساس توحید پر ہے، وہ اسلام ہے۔ جوں جوں وقت گزرا، انسانی ذہن کی اِرتقا ہوتی چلی گئی۔ اللہ کا پیغام بھی اِسی حساب سے ایڈوانس ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ سٹیل اور Wheel کی جب Invention (ایجاد) ہوئی تو انسانی ذہن کی مکمل نشو و نما ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ کا جو پیغام آپ ﷺ کے ذریعے بندوں تک پہنچا اُس سے دین کی تکمیل ہو گئی۔ اب اِس میں کوئی Addition نہیں ہو سکتی۔ اِس لیے ہم آپ ﷺ کو نبی آخر الزماں ﷺ کہتے ہیں کیونکہ دین مکمل ہو گیا اور اب کوئی اور نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ اگر رب تعالیٰ ہمیشہ دین اسلام ہی اُتارتا رہا تو ہر مذہب میں نماز مختلف کیوں ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ نماز کی بھی دو Dimensions ہیں۔

1۔ نماز کی صورت

2۔ نماز کی اصل

نماز کی صورت تو وقت کے ساتھ ساتھ Principle of evolution کے تحت بدلی لیکن نماز کی اصل یعنی توحید نہیں بدلی۔

اچھا اُستاد ہمیشہ اپنے شاگرد کو ناپ تول کر علم دیتا ہے اور اِس سے پہلے اُس کو خوب پرکھنے کے بعد اُس کی تربیت کرتا ہے۔ اُسے تیار کرتا ہے کہ جو علم وہ اسے دینے والا ہے، شاگرد اُسے Receive کرنے کی پوزیشن میں آ جائے، جیسے آپ ریڈیو یا ٹی وی کا سوئچ آن کر کے اُسے ٹرانسمیشن Receive کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں، اِس کے بعد آپ اپنی مرضی کے چینلز Tune in کرتے ہیں۔ اِسی طرح اُستاد پہلے اپنے شاگرد کو تیار کرتا ہے وہ علم Receive کرنے کے لیے جو وہ اُسے دینے والا ہے۔ اُستاد اپنے شاگرد کی تربیت کرتا اور اُسے سکھاتا ہے کہ تمھیں یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا، بات بات پر لوگوں سے جھگڑا نہیں کرنا، کسی کی کہنی لگ جائے تو اُسے تھپڑ نہیں مارنا، چوٹ لگ جائے تو مسکرا کر کہنا ہے کوئی بات نہیں، گالی کا جواب Smile سے دینا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلانا ہے، دوسروں کی خدمت اِس انداز میں کرنی ہے کہ انھیں پتا ہی نہ چلے کہ آپ نے اُن کی خدمت کی ہے، جھوٹ نہیں بولنا، اوّل تو وعدہ نہیں کرنا اور اگر وعدہ

کر لیں تو پورا کرنا ہے۔

اُستاد اپنے شاگرد کو سوال کرنے سے حتی المقدور منع کرتا ہے۔ (سوال سے مراد علم
ہاتھ پھیلانا ہے۔)

پہلے اُستاد اپنے شاگرد کو Considerate, Helpful اور orthcoming
اُس کی تربیت اِن خطوط پر ہو جاتی ہے تو پھر اُس کی ذہنی استعداد اور ick up
things کو سامنے رکھتے ہوئے اُسے Measured dose میں اُتنا علم دیتا ہے ج
کر سکے۔

سمجھ دار ڈاکٹر مریض کو دوائی Blindly prescribe نہیں کرتا بلکہ اُ
History لیتا ہے کہ کہیں اُسے پینسلین یا کسی بھی قسم کے کیمیکل سے الرجی تو نہیں، اُ
بائیوٹک کو React تو نہیں کرتی۔ اپنے مریض کو Evaluate کرنے کے بعد وہ م
Potency prescribe کرتا ہے۔ مریض بہت Safely وہ دوائی لیتا ہے اور
رفتہ دُور ہونے لگتی ہے۔ اِسی طرح سمجھ دار اُستاد پہلے اپنے شاگرد کو Evaluate کرت
علم شاگرد Absorb کر سکتا ہے اُس کی Measured dose اُسے دیتا ہے۔

اِس راہ میں ضروری ہے کہ دوسروں کے احوال کو اپنے احوال پر محمول نہ کریں۔

ایک پرچون فروش کے پاس بڑا Well-trained طوطا تھا۔ دکان دار بعض
حوالے کر کے ضروری اُمور نمٹانے چلا جایا کرتا۔ کوئی گاہک آتا تو طوطا اُسے دیکھ
بعد تشریف لائیے، دکان دار موجود نہیں۔ ایک ایسا ہی دن تھا، طوطا اکیلا تھا، مالک
ایک بلی دکان میں گھس آئی جسے دیکھ کر طوطا خوف زدہ ہو گیا اور افراتفری میں وہ
مرتبان سے جا ٹکرایا اور وہ مرتبان ٹوٹ گیا۔ دکان دار جب واپس آیا اور اُس نے
سے کانٹوں والا ڈنڈا طوطے کے سر پر مارا جس سے اُس کے سر کے سارے بال اُ
سلوک دیکھ کر صدمے سے خاموش ہو گیا۔ جب پرچون فروش کا غصہ اُترا تو اُس
کوشش کی لیکن طوطا بولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اِسی طرح کئی روز گزر گئے۔ ایک دن
آئے جن کے سر پر بال نہیں تھے۔ طوطے نے جب یہ دیکھا کہ یہ بھی میری طرح
''کیا تم سے بھی کوئی تیل کا مرتبان ٹوٹا تھا؟''

جب انسان دوسروں کے احوال پر اپنے احوال کو محمول کرنے لگتا ہے تو پھر و
یہی سمجھتا ہے کہ اُس سے بھی تیل کا مرتبان ٹوٹا تھا اور اُس کے مالک نے اُس کے
علم کے حصول میں ہم کبھی بھی اپنی کیفیات کو دوسروں کی کیفیت پر مح
Body chemistry اور رُوح کی کیمسٹری دوسروں سے مختلف ہے۔

دوسروں سے مختلف ہوگا۔ یوں کہہ لیجیے کہ ہر ایک کی منزل پر جانے کی راہ دوسرے سے Slightly مختلف ہو گی۔ ایک آدمی Via سرگودھا، دوسرا Via موٹروے، تیسرا Via جی ٹی روڈ اور چوتھا Via سیالکوٹ ہیڈ مرالہ اسلام آباد جاتا ہے۔ اِن سب کو راستے میں جو مناظر اور Landmarks نظر آتے ہیں وہ Similar نہیں بلکہ مختلف ہوں گے، لیکن اِس سب کے باوجود منزل سب کی اسلام آباد ہے۔

اِسی طرح سب شاگردوں کی منزل حصولِ علم ہے لیکن اگر اُستاد ناپ تول اور جانچ پڑتال کے بعد علم دے گا تو اُن کے ذکر، اذکار اور ٹریننگ ایک دوسرے سے Slightly مختلف ہوں گے، اِس لیے انھیں ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔

ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی شخص سے علم سیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے وہ ہماری ٹریننگ کرے گا۔ اگر میں اپنے اُستاد کے پاس جاؤں تو اُن کے لیے بہت Difficult student ثابت ہوں گا کہ پہلے میرے اندر سے منفی سوچیں نکالنے میں میرے اُستاد کی عمر بیت جائے گی، پھر اندر کی غلاظت دھونے میں ایک عمر چاہیے۔ اِسی طرح میرے اندر کی انا کو توڑنے کے لیے طویل عرصہ درکار ہوگا۔ اِسی میں ساٹھ ستر سال بیت جائیں گے اور جب علم لینے کی باری آئے گی تو بلاوا آجائے گا۔ لیکن وہ ٹریننگ بذاتِ خود بہت Valuable ہو جائے گی کیونکہ میں Further گناہوں سے بچ جاؤں گا۔

سوال: مرشد کی طرف توجہ اور اللہ کا تصور، اِسے Explain فرما دیجیے۔

جواب: مرشد کی طرف توجہ سے مراد یہ نہیں کہ ہم ہر وقت مرشد صاحب کا یوں تصور کریں کہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اُن کا ایسے تصور کیا کہ بعد میں پتا چلا کہ مع گاڑی کسی ٹرک میں بیٹھے ہیں۔

مرشد کے تصور سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مرشد ہمیں جو کچھ سکھاتے ہیں، ہم ہر لمحہ اُسے یاد رکھیں۔ اگر میں گناہ کرنے لگوں تو مجھے فوراً یاد آجائے کہ مرشد صاحب نے مجھے اس سے منع کیا تھا، شام کو جب میں اُن سے ملوں گا تو مجھے شرمندگی ہوگی۔

مرشد کی باتوں کو یاد رکھیں، اُنھیں Copy کریں اور اُن کی بتائی ہوئی Guidelines کے مطابق زندگی گزاریں۔ اللہ کا تصور، بہت آگے کی بات ہے، اگر مجھے یہ یاد رہے کہ مجھے کل اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو اُس کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا، اگر میں ہر وقت یہ بات اپنے آپ کو یاد دلانے میں کامیاب ہو گیا تو میری راہ سیدھی ہو جائے گی۔

اِس لیے مرشد صاحب ہمیشہ آپ سے کہیں گے کہ رب کو ہر لمحہ یاد رکھو، دل میں اُس کا ذکر کرتے رہو، رب کو کبھی نہ بھولنے پاؤ، یہ احساس ہمیشہ ساتھ ہو کہ مجھے رب کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔

سوال: اگر کوئی مرید دل ہی دل میں کسی کو مرشد مان لیتا ہے تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ مرشد نے مرید کو Accept کر لیا ہے؟

جواب: بڑا آسان طریقہ ہے۔ اگر میں کسی صاحب کو اپنا مرشد مان لوں تو نہ صرف اُن کی بتائی باتوں کو دل سے

تسلیم کروں گا اور اُن پر عمل کروں گا بلکہ اُن کے اندازِ گفتگو، نشست و برخاست اور مجلسی آداب کو بھی Copy کرنے لگوں گا۔ یہ سب دیکھ کر مرشد کو نہ صرف خوشگوار حیرت ہوگی بلکہ اُن کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگا اور یہی اصل بات ہے کیونکہ اگر استاد شاگرد سے پیار کرنے لگے اور کوئی شاگرد اُستاد کا فیورٹ ہو جائے تو اُستاد کی توجہ اُس پر مذکور ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اُستاد کے بہت قریب چلا جائے تو اُستاد بغیر شاگرد کے کہے اُسے اپنا Mirror image بنانے کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہی تو سب کچھ ہے۔ بیعت کا پتا چلے یا نہ چلے، بیعت کی ہو یا نہ کی ہو، اگر مرشد کی یوں توجہ اور محبت مل گئی کہ وہ شاگرد کو اپنا Mirror image بنانے میں پڑ گئے تو شاگرد کی زندگی سنور گئی۔

سوال: کیا رشتے کے لیے تعویذ پہنا جا سکتا ہے؟

جواب: بھائی! معلوم نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ سودا سمایا ہوا ہے کہ میرے لیے میرا رب اور آپ ﷺ ہی کافی ہیں۔ میں اپنی درخواست آپ ﷺ کے قدموں میں رکھ دوں" کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وآلہ وسلم! آپ ﷺ رحمت اللعالمین ہیں، آپ ﷺ تو غیروں پر کرم فرماتے ہیں، میں گناہ گار ہی سہی، ہوں تو آپ ﷺ کا اُمتی...... مجھ پر نظرِ کرم فرما دیجیے، دعا فرما دیجیے کہ میرا یہ کام ہو جائے۔"

میں آج تک وہاں سے مایوس اور خالی نہیں لوٹا، آپ ﷺ نے ہمیشہ جھولی میں خیرات ڈال دی ہے۔

معلوم نہیں میرا رب پر جاہلوں کا سا اعتماد کیوں ہے کہ میرا رب اِتنا مہربان ہے کہ میری کوئی بات رد نہیں کرتا۔ اِتنے مہربان رب کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کی طرف کیوں دیکھوں؟ کیوں تعویذ پہنوں؟ کیوں جادو ٹونا کراؤں؟

جب رب مجھ پر اپنی مہربانیوں اور رحمتوں کا سایہ کیے ہوئے ہے تو میں اپنے ہر کام اور ضرورت کے لیے اُسی سے ہی کیوں نہ رجوع کروں۔

میں تو آپ کو وہی راستہ بتاؤں گا جو میں آج تک خود Follow کرتا رہا۔ چھوڑیے اِن تعویذوں، جادو، عملیات کو، آپ ﷺ کی دہلیز پکڑ لیجیے اور رب کے حضور سجدہ ریز ہو جائیے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی ایسی ضرورت یا خواہش رہ جائے گی جو دل میں آئے اور پوری نہ ہو۔

سوال: بہت زیادہ ڈپریشن میں انسان کیا کرے؟

جواب: تنہائی میں بیٹھ کر اپنے رب سے گفتگو کرنے لگے، اگر پھر بھی ڈپریشن نہیں جاتا تو آپ ﷺ کا تصور کر کے آہ وزاری شروع کر دیجیے۔

یا رسول اللہ ﷺ! نکال لیجے مجھے اِس مصیبت سے۔

میرا نہیں خیال کہ اِس طرزِ عمل کے بعد کوئی ڈپریشن باقی رہتا ہے۔

سوال: سمجھ نہیں آتی کہ صحیح گائیڈ لائن کہاں سے لیں؟

جواب: ہم نے بچپن میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پڑھی، وہ ہمیں آج بھی ازبر ہے۔ اُس کی باریک سے

باریک Detail بھی ہمارے ذہن سے محو نہیں ہوئی۔ یہ بھی آپ ﷺ کا معجزہ ہے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے Guidance لے لیجیے کیونکہ کوئی معاملہ حیات ایسا نہیں جس کے لیے راہنمائی وہاں سے نہ ملے۔ اتباعِ رسول ﷺ میں ہی ہر مسئلے کا حل پوشیدہ ہے۔

سوال: جب رب اِتنا مہربان ہے تو پھر اُس کا اتنا خوف کیوں؟ کیا اس کی وجہ رب کا جلال ہے؟

جواب: میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ کی طرف اِس یقین کے ساتھ رجوع کریں کہ اُس کی مہربانیوں اور رحمتوں کا سایہ میرے سر پر موجود ہے۔ یہ خوف رب کے جلال کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس بات کا خوف ہے کہ کہیں میرے رب کی مہربانی مجھ سے چھن نہ جائے۔ ایسا رب جو مجھے دشمنوں سے محفوظ رکھتا، قدم قدم پر میری حفاظت کرتا ہے، ایسا رب جو میری اُن خواہشات کو بھی پورا کرتا ہے جن کا خود مجھے بھی علم نہیں، ایسے رب سے تو مجھے پیار، محبت اور عشق کرنا چاہیے اور جس سے انسان عشق کرتا ہے اُس کے رُوٹھ جانے کا خوف بڑا شدید ہوتا ہے۔

میں لوگوں کو رب سے ڈراتا نہیں بلکہ اُس کی مخلوق کے لیے بے پایاں محبت، مہربانیوں اور بے حد و حساب رحمتوں کا احساس دلاتا ہوں۔ صرف ڈر یہ ہوتا ہے کہ ایسا مہربان رب کہیں رُوٹھ نہ جائے۔

سوال: میں بہت Disturbed ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا راستہ بہتر ہے جو میری دُنیا و آخرت سنوار دے؟

جواب: آپ زندگی کی گاڑی کا سٹیئرنگ رب کے ہاتھ میں دے دیجیے۔ زندگی کا بہترین راستہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی پیروی میں ہے۔ کسی کی کچھ پروا نہ کریں کہ کون کیا کہتا ہے، کسی Reward یا Punishment کی پروا نہ کریں۔ بس یہ خیال رکھیں کہ آپ کا کوئی فعل سنت سے باہر نہ جائے۔ زندگی بالکل صحیح سمت میں رواں دواں ہو جائے گی۔ دُنیا بھی آپ کی ہوگی اور آخرت بھی۔

نورِ الٰہی

سوال: سورہ النور کی آیت نمبر 35 میں ارشاد ہوتا ہے:

"اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اُس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے، وہ چراغ ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے، جو نہ پورب کا نہ پچھم کا قریب ہے کہ اُس کا تیل بھڑک اُٹھے اگرچہ اُسے آگ نہ چھوئے۔"

سوال یہ ہے کہ چراغ، فانوس، زیتون کا مبارک پیڑ جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔ اِن سب چیزوں سے کیا مراد ہے؟

جواب: رُوحانیت میں اِس کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ کا اپنا جو نور ہے اُسی نور کے ایک حصے سے تخلیق ہوئے آپ ﷺ، اُسی نور کے ایک حصے سے پاک ارواح تخلیق ہوئیں اور اُسی نور کے ایک حصے سے عام ارواح کی تخلیق ہوئی۔

اللہ کا نور وہ چراغ ہے جو جل رہا ہے اور اپنے نور کو پھیلا رہا ہے۔ نور کو دائروں کی شکل میں یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ چراغ شیشے کے بنے ہوئے فانوس میں ہے اور اُس چراغ میں زیتون کا تیل ہے جو خود بخود بھڑک اُٹھنے کو تیار ہے۔ ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا نور ہی سب کچھ ہے اور کائنات رب کے نور ہی سے روشن ہے۔ کوئی اور نور ایسا نہیں جس نے کائنات کو روشن کیا ہو۔

انسان کا دل اُس شیشے کے فانوس کی مانند ہے۔ اگر وہ شیشہ دھندلایا ہوا ہو تو روشنی پھیل نہیں سکے گی بلکہ اُسی میں قید رہ جائے گی۔

آپ نے لالٹین دیکھی ہوگی جس میں شیشہ لگا ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں جب بجلی نہیں آئی تھی تو محلے اور گلی کے کارنر پر لیمپ ہوتے تھے۔ شام کو ایک آدمی سیڑھی لے کر آتا، شیشوں کو صاف کرتا اور لیمپ روشن کر کے چلا جاتا۔

چراغ کے اردگرد کا شیشہ جتنا اُجلا اور صاف ہوگا، اُس میں سے اُسی قدر روشنی نکلے اور پھیلے گی۔ جب ہم

دل کو آئینے کی مانند صاف کرلیں گے اور چمکالیں گے تو پھر اُس چراغ کی روشنی جب دل پر پڑتی ہے تو یہ روشنی چاروں طرف منعکس ہوتی ہے......اگر اُس دل میں کثافت ہے تو جب تک وہ دُور نہ ہو رب دل میں نہیں رہتا۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دل کی دس کثافتیں بیان کی ہیں جن میں حسد، کینہ، بُغض، حرص، لالچ وغیرہ شامل ہیں۔ جب تک ہم دل کو ہر قسم کی کثافت سے پاک کر کے آئینے کی مانند صاف نہیں کرتے، یہ رب کا ٹھکانا نہیں بنتا۔ جب تک ہم چراغ کا شیشہ صاف نہیں کریں گے، روشنی وہاں سے منعکس نہیں ہوگی۔

روحانیت میں ''فانوس'' سے مراد ''دل'' ہے جسے کہتے ہیں کہ دل میں رب رہتا ہے۔ جب تک دل صاف نہیں ہوگا تب تک نور کا چراغ دل میں روشنی نہیں پھیلا سکے گا۔

یہ جو زیتون کے مبارک درخت کا ذکر ہے کہ اُس کا تیل بھڑک اُٹھنے کو تیار ہے، جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی......اس سے مراد علم اور ایمان ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا جو میری طرف ایک قدم آتا ہے میں اُس کی طرف دس قدم آتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے اُس کے دل میں سوئے ہوئے ایمان کی چنگاری ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے۔ وہ نیکی کی راہ میں ذرا سی پُرخلوص Effort کرتا ہے تو ایمان سر اُٹھاتا ہے اور پوری قوت سے پنپنے لگتا ہے۔ چونکہ ایمان کی کوئی حد نہیں، اس لیے کہا گیا کہ وہ نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔

بھڑک اُٹھنے سے مراد ہے کہ اُس کا تیل بھڑک اُٹھنے کو تیار ہے۔ اور ''بھڑک اُٹھنے کو تیار'' کا مطلب ہے کہ صرف ایسا انسان چاہیے جو ایمان کی راہ پر پہلا قدم اُٹھالے۔ اس کے بعد معاملات چل نکلتے ہیں۔

زیتون کے تیل کی جو مثال ہے، اس ضمن میں عرض کردوں کہ اللہ پاک ہے اور رب کے ساتھ پاکیزگی ہی کا تعلق ہوسکتا ہے، کثافت کا نہیں۔ اگر ہمیں رب کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے تو ہمیں خود کو پاک کرنا ہوگا۔ وہ پاکیزگی صرف جسمانی طہارت اور وضو کی پاکیزگی نہیں بلکہ Intellectual پاکیزگی ہے، ہمیں ذہنی طور پر پاکیزہ ہونا ہوگا تاکہ ہم رب کے ساتھ تعلق قائم کرسکیں۔

سورہ نور میں پاک باز لوگوں پر تہمت لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ ایسا شخص جو پاک باز بیوی یا پاک باز لوگوں پر الزام لگائے اور اُسے ثابت نہ کرسکے، اُس کی سزا 80 کوڑے ہے۔ Intellectual پاکیزگی کا مطلب ہے کہ ہماری سوچ پاک ہو۔ جب ہماری سوچ پاک ہوتو ہم کسی کے بارے میں بدگمان نہیں ہوتے، دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی ستارالعیوب سنت پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے عیوب چھپالیتے ہیں، زبان سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے کسی کی ذات پر حرف آئے، کسی کی بدنامی ہو، کسی کی شہرت کو نقصان پہنچے......

جب ہم ذہنی طور پر پاکیزہ ہوجاتے ہیں تو گناہوں کا سوچتے ہی نہیں اور جب سوچتے ہی نہیں تو گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ کسی بھی عمل کا آغاز سوچ سے ہوتا ہے، اس کے بعد نیت، ارادہ اور عمل وجود میں آتا ہے۔ جب سوچ ہی نہ آئے تو پھر باقی تینوں چیزیں وجود میں نہیں آئیں گی۔

اگر ہم رب کے ساتھ تعلق جوڑنا چاہتے ہیں تو ہمیں ذہنی طور پر اپنی سوچ کو پاکیزہ کرنا ہوگا کیونکہ رب پاک ہے اور پاک سوچ ہی اُس سے تعلق رکھ پائے گی۔

سوال: دُنیاوی ترغیبات اور کٹھن حالاتِ زندگی میں اُلجھا انسان قربِ الٰہی کے حصول کے لیے کیا کرے؟

جواب: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کسی کا قرب کیوں چاہتا ہے؟ ہم اگر کسی کے قریب جانا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

ہم دو اغراض سے کسی کے قریب ہونا چاہیں گے......

پہلی صورت بڑی ناپسندیدہ اور ادنیٰ درجہ کی ہے کہ کوئی شخص بااختیار اور Powerful ہے، اُس کا قرب حاصل کر کے ہم دُنیاوی اغراض پوری کرلیں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ انسان اپنے عادات واطوار اور اخلاق کی وجہ سے ہمیں اتنا اچھا لگتا ہو کہ ہم اُسے Idealize کرتے ہوں اور اُس کی قربت کے خواہش مند ہوں۔

مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ یا تو دُنیاوی اغراض کے حصول یا کسی کے پیار کی وجہ سے کسی کے قریب ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے دل میں رب کے قرب کی خواہش ہے تو پھر یہی ایک طریقہ ہے کہ ہمیں اُس سے پیار ہے۔

اگر دُنیاوی اغراض کے حصول کے لیے رب کے قریب ہونے کی خواہش ہے تو وہ رب تو بن مانگے دُنیا عطا کرتا ہے......اُن کو بھی جو اُسے مانتے ہی نہیں، اُنھیں بھی جو اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں، اُن کو بھی جو فاسق وفاجر ہیں۔ ان کو بھی جو دل سے اُسے اپنا رب مانتے ہیں۔ وہ تو سب کو Look after کرتا ہے۔ سب کو پالنا اُس کی شانِ ربوبیت ہے۔

رب کا قرب پانے کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے کہ ہمیں اُس سے پیار ہے اور جس سے پیار ہو اُس کی چھوٹی چھوٹی بات پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ اُس کی چھوٹی سی چھوٹی خواہش بھی پوری کی جاتی ہے کیونکہ ایسا کر کے خوشی ہوتی ہے۔

اگر ہم رب سے پیار کرتے ہیں تو ہم اُس کے ہر حکم کو یہ سوچ کر Carry out کریں گے کہ کہیں وہ ہم سے رُوٹھ نہ جائے۔ جب ہم اُس کا ہر حکم بجالائیں گے تو نفس ہمارے ماتحت ہوجائے گا کیونکہ جو بندہ رب سے پیار کرتا ہے وہ نفس کی ہر خواہش کو رد کرتا ہے اور اردگرد کی ترغیبات اُسے مائل نہیں کرپاتیں۔ لیکن اگر انسان اتنا کمزور ہے کہ وہ رب سے محبت تو کرتا ہے لیکن گردوپیش کے حالات و معاملات اُسے اپنی طرف راغب کرلیتے ہیں تو اس کا آسان ترین حل یہ ہے کہ ایسا شخص قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کرے۔ تلاوت کرتے ہوئے اُس کی آواز اتنی بلند ہو کہ وہ خود بھی وہ آواز سن سکے۔ وہ اپنی آواز کو غور سے سُنے کہ تلاوتِ قرآن کے الفاظ کیا ہیں؟ وہ کیا سن رہا ہے؟ چار پانچ دن کی پریکٹس کے بعد وہ شخص تلاوت میں ڈوبنے لگے گا۔ اس کے بعد جب وہ تلاوت کرے گا تو اِس کا رابطہ اردگرد کے ماحول اور حالات سے کٹ جائے گا۔

تلاوت کبھی بہت تیزی سے نہ کیجیے۔ قرآن پاک ہمیشہ ترتیل سے پڑھنا چاہیے کہ ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ سمجھ آئے۔ ہم غور سے سنیں کہ پڑھ کیا رہے ہیں۔ جب ہم ایسا کریں گے تو اُتنی دیر کے لیے دُنیا سے ہمارا تعلق منقطع ہو جائے گا اور ہم اللہ کی یاد میں ڈوبنے لگیں گے۔

کچھ لوگ وظائف و تسبیحات اِس لیے کرتے ہیں کہ ہم پر کوئی دُنیاوی مصیبت نہ آئے، ہم دُنیاوی طور پر سکھی رہیں، ہمارے دُنیاوی کام آسانی سے ہوتے رہیں۔ یاد رکھیے! یہ مسلمان کی راہ نہیں بلکہ بے عملی کی راہ ہے۔ مسلمان تو جدوجہد پر یقین رکھتا ہے اور بھرپور محنت کے بعد رب سے دُعا کرتا ہے ''یا باری تعالیٰ! مجھ میں جتنی سکت اور ہمت تھی میں نے کوشش کی، اب معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں۔ تُو اِس کا بہترین نتیجہ مجھے عطا فرما دے۔'' اور اللہ پاک اِس کی محنت سے کہیں بڑھ کر اُسے انعام عطا فرماتا ہے۔

ہم نہ صرف خود بے عملی کی راہ پر چلتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی صاحبِ دُعا کے پاس لے جاتے ہیں کہ دُعا کریں کہ بچہ فرسٹ آ جائے۔ یوں معصوم بچوں کے ذہن پر شروع ہی میں یہ بات جم جاتی ہے کہ اگر میں دُعا کرا لوں تو اچھے گریڈ لے لوں گا۔

میں ہمیشہ گزارش کیا کرتا ہوں کہ خدا کے لیے بچوں کو ایسی جگہوں پر نہ لے جایا کریں بلکہ اُنھیں نصیحت کریں کہ بیٹا! خود محنت کرو۔ اور پھر دُعا کرو کہ یا اللہ! میں نے پوری محنت کر لی تُو اب مجھے اِس کا اچھا رزلٹ دے دے۔'' اِس طرح بچوں کی سوچ مثبت اور صحیح ڈائریکشن میں رہے گی۔

میں بھی یہی کرتا ہوں کہ نماز نہیں پڑھتا، محنت نہیں کرتا لیکن جہاں سن گن مل جائے کہ فلاں اللہ کا بندہ ہے، اللہ اُس کی دُعا قبول کرتا ہے، اُس صاحبِ دُعا سے ملنے جاتا ہوں تو راستے بھر پلان بناتا ہوں کہ واپسی پر فلم دیکھنے جاؤں گا، میکلوڈ روڈ سے مرغ چنے کھاؤں گا۔ جب میں مستجاب الدعوات شخص کے پاس جاتا ہوں تو کہتا ہوں ''جناب! جلدی سے دُعا کر دیجیے کہ میں نماز پڑھنے لگوں......''

ذرا سوچیے! اگر یہ سب دُعا سے ہی ہونا تھا تو پھر کا ہے کی سزا اور کا ہے کی جزا......؟ اگر کسی نے دُعا کر دی اور میں نیک ہو گیا تو جزا دُعا کرنے والے کی، میری کیوں......؟ اگر کسی نے دُعا نہ کی اور میں بد رہا تو پھر سزا بھی دُعا کرنے والے کو ملے، مجھے کیوں؟

بھائیو! راہِ عمل ہماری کوششوں سے منسلک ہے۔ اپنے نفس کو شکست دے کر نیکی کی راہ پکڑنے میں جو محنت ہم نے کی، جو تردد ہم نے کیا، جو تکلیف اُٹھائی، انعامات اُسی کے ہیں۔ دُنیا کے ہر لالچ و ترغیب کو چھوڑ کر رب کی راہ کی طرف چلے تو اجر اُسی کا ہے۔

زندگی میں اگر ہم وہ کامیابی چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف کو ملی تھی تو ہمیں محنت کی روش اپنانا ہو گی۔ عزت، مال و دولت، اقتدار......اُنھیں یہ سب اِس لیے ملا کیونکہ اُنھوں نے اپنے نفس کو شکست دی۔ اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر چلے، محنت اور جدوجہد کی جس کے نتیجے میں رب نے اُنھیں ہر طرح کی کامیابی عطا کی۔ اگر ہم وہی راہ اپنا لیں، رب کو رات کے اندھیرے اور تنہائی میں پکارتے رہیں اور دن میں جان توڑ محنت کر لیں تو پھر ویسی ہی کامیابی ہمیں مل جائے گی جیسی ہمارے اسلاف کو ملی تھی۔

آپ کبھی مستجاب الدعوات آدمی کے ٹھکانے پر خاموشی سے بیٹھ جائیں اور وہاں موجود لوگوں کی دُعاؤں کو Watch کریں۔ یہ بڑی Interesting study ہو گی اور بڑی حیرت انگیز بات سامنے آئے گی کہ زیادہ تر فرائض سے فرار میں کامیابی کی دُعائیں ہوں گی۔

میں دُعا کرنے والوں کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ میرا بیٹا نافرمان ہے، دُعا کر دیں وہ فرماں بردار ہو جائے۔ مجھے کبھی کسی دوست نے یہ نہیں سمجھایا کہ تمھارا بیٹا رب کا بندہ ہے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ رب کا فرماں بردار ہو جائے۔ اسے اپنا فرماں بردار کیوں بنانا چاہتے ہو؟ حالانکہ بیٹے کو فرماں بردار بنانا میری اپنی ذمہ داری ہے۔

میرا بچہ کلاس ٹُو میں پڑھتا تھا تو میں دعا کرانے جاتا تھا کہ وہ پڑھائی میں دل لگانے لگے۔ کسی نے مجھے پلٹ کر یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی ''او عقلمند! تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ وہ پڑھنا چاہتا بھی ہے یا نہیں......؟'' اِس کا حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ٹی وی ڈرامے چھوڑ کر خود کتابیں لے کر بیٹھ جاؤں، بچہ مجھے مطالعہ میں مصروف دیکھے گا تو اُسے خود ہی پڑھائی میں دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

میں صاحبِ دُعا سے جا کر کہتا ہوں دُعا کریں کہ میرا بیٹا نماز پڑھنے لگے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے خود کبھی نماز نہیں پڑھی۔ اگر میں بیٹے کو نمازی بنانا چاہتا ہوں تو پہلے خود مجھے تہجد گزار ہونا پڑے گا...... اگر میرا بیٹا غیر قانونی طور پر دوسرے ملک چلا گیا۔ ایجوکیشن Base پر ویزا لیا لیکن وہاں جا کر جاب کرنے لگا...... میں جا کر مستجاب الدعوات آدمی کے کان کھاتا ہوں کہ آپ دُعا کر دیں اللہ میرے بیٹے کو جھوٹ اور بے ایمانی میں کامیابی عطا فرما دے...... میرے بیٹے نے وہاں چوری کی یا قتل کیا۔ میں صاحب دُعا سے کہتا ہوں، آپ دُعا کر دیں کہ رب تعالیٰ میرے بیٹے کو باعزت بری کر دے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ رب تعالیٰ نے تو چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا رکھی ہے اور خون کا بدلہ خون ہے۔ اگر صاحبِ دعا، صاحب کشف ہے اور اُسے پتا چل گیا کہ بیٹا گناہ گار اور مجرم ہے۔ وہ از راہِ مروت بھرم رکھتے ہوئے واضح طور پر نہیں کہتا کہ آپ کا بیٹا تو مجرم ہے، بلکہ یوں کہتا ہے آپ کے بیٹے نے شاید آپ کو سچ نہیں بتایا کہ وہ قتل میں ملوث ہے۔ میں کہتا ہوں ''بچہ ہے، غلطی ہو گئی۔ آپ دُعا کر دیں کہ وہ باعزت رہا ہو جائے۔'' مجرم بیٹے کے باعزت بری ہونے کی دُعا کرا کر گویا میں یہ کہہ رہا ہوتا ہوں کہ آپ رب سے کہہ دیں کہ وہ اپنے قوانین بدل دے۔ حالانکہ درحقیقت تو خون کا بدلہ خون ہے۔

اگر قربِ الٰہی حاصل کرنا ہے تو ہمیں اپنے رویے ٹھیک کرنا ہوں گے۔

سوال: کیا امیر ہونے کے لیے تعویذ استعمال کیے جا سکتے ہیں؟

جواب: قرآن پاک میں ہے کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ انسان

کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ تعویذ کراتا ہے۔

آپ ﷺ نے ہمیشہ رب تعالیٰ سے دُعا فرمائی ''یا اللہ! مجھے قیامت کے روز مساکین میں سے اُٹھانا۔''

آپ ﷺ چاہتے تو آپ ﷺ کی آنکھ کے ایک اشارے سے کوہِ اُحد سونے کا بن جاتا لیکن آپ ﷺ تو وہ ہستی ہیں جو وصول ہونے والے ہدیے اور نذرانے تک ہمیشہ فوراً تقسیم فرمادیتے اور ہاتھ جھاڑ کر گھر تشریف لے جاتے۔

آپ ﷺ نے تو مساکین جیسی زندگی کو ترجیح دی۔ ہم جو آپ ﷺ کے اُمتی ہیں، غربا سے اِتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟ ہم اِس زندگی سے خوف زدہ ہیں جس کو آپ ﷺ نے ترجیح دی۔ اولیائے کرام بھی اِسی سنت پر عمل کرتے ہوئے فقر کی زندگی گزارتے ہیں۔

سوال: ایک بزرگ مسجد الحرام میں بے حد انہماک سے مشغولِ عبادت تھے۔ خلیفۂ وقت نے کسی سے اُن کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ یہ آلِ خطاب (حضرت عمر فاروقؓ) میں سے ہیں۔ خلیفۂ وقت نے جا کر اُن سے کہا کہ مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔ بزرگ نے کہا ''خانۂ خدا میں بیٹھ کر غیر اللہ سے کچھ کہوں؟'' جب بزرگ مسجد الحرام سے باہر آئے تو خلیفۂ وقت نے اپنا سوال دہرایا۔ بزرگ نے فرمایا، ''آپ میرے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں؟ دُنیا کا کوئی معاملہ یا آخرت کا؟'' خلیفہ نے کہا ''آخرت تو میرے اختیار میں نہیں، دُنیا کا کوئی معاملہ بتائیے۔'' بزرگ نے بڑا خوب صورت جواب دیا ''آخرت آپ کے اختیار میں نہیں اور دُنیا تو کبھی ہم نے اُس سے بھی نہیں مانگی جو دُنیا جہان کا مالک ہے۔''

سوال یہ ہے کہ یہ توکل کا کون سا مقام ہے؟

جواب: یہ مقام توکل کی تیسری گھاٹی ہے جہاں انسان رب کا ہو جاتا ہے۔ وہ رب سے صرف رب مانگتا ہے ''یا اللہ! تُو مجھے اپنی ذات عطا فرمادے۔'' یہ اور بات کہ جس کو رب مل گیا اس کو سب مل گیا۔ دُنیا و آخرت سب اُسی کی ہے۔

سوال: کیا درود پاک یا اللہ کا کوئی خاص نام پڑھنے کے لیے اجازت ضروری ہے؟

جواب: درود پاک پڑھنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ نے خود اِس کی تاکید فرمائی۔ قرآن پاک میں بھی ہے۔

> ''بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ پس اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود اور خوب سلام بھیجا کرو۔''

اِس لیے آپ بے دھڑک درود پاک پڑھیے۔

اللہ کا کوئی ایک نام پڑھنے کے بجائے ہم اُس کے ننانوے نام کثرت سے پڑھا کریں، لیکن اِس میں دُنیاوی اغراض پوشیدہ نہ ہوں۔ ہم رب کے ساتھ Commercial deal نہ کریں کہ میں تیرے اسما کا ورد

کروں تو میرا فلاں کام ہو جائے۔ اور جب وہ کام ہو جائے تو پڑھنا بند کر دیں۔ یہ پسندیدہ فعل نہیں۔ رب تعالیٰ کو اِس لیے یاد کریں اور پکاریں کہ وہ پکارے جانے کے لائق ہے۔ رب کے نام پڑھنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ وہ آقا ہے اور ہم اُس کے غلام۔ آقا کو یاد کرنے اور پکارنے کے لیے کسی اجازت ضرورت نہیں۔

ہمارے روّیے

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت کے ذریعے سکھایا کہ جتنے بھی صاحبانِ علم گزرے ہیں اُن میں سے جن کا علم میں جتنا بڑا مقام تھا اُنھوں نے مشکل نکات کو اُتنا ہی آسان بنا کر پیش کیا۔

انسان علم میں جتنا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اُس کی زبان اُتنی ہی آسان اور عام فہم ہونے لگتی ہے۔ انسان علم میں جتنا یکتا ہوتا چلا جاتا ہے، اُس کی مشکل باتوں کو آسان انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت نکھرتی چلی جاتی ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ علم سے نوازا۔ جوں جوں اُن کا علم بڑھتا چلا گیا، اُن کے بیان میں سادگی اور سلاست آتی گئی۔ انسانی فطرت ہے کہ اگر دلیل سے بات کی جائے تو انسان کچھ ہی دیر میں دلائل سے بور ہو جاتا ہے لیکن اگر اُن دلائل کو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی صورت میں پیش کیا جائے تو سننے والوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی علم کے پیچیدہ نکتوں کو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی صورت میں بیان کیا۔ اِس لیے علما و صوفیا میں اُنھیں بہت نمایاں مقام حاصل ہوا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت ہے کہ ایک یہودی بادشاہ نے ایک مومنہ کو بت کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ جب خاتون نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ شرک ہے تو بادشاہ نے غصے میں آ کر اُس خاتون کے شیر خوار بچے کو آگ میں ڈال دیا۔ ماں نے اپنے بچے کو آگ میں جلتے دیکھا تو اُس کا ایمان ڈگمگا گیا اور وہ ماماتا سے مجبور ہو کر سجدہ کرنے کو تیار ہو گئی۔ جونہی وہ سجدہ کرنے لگی تو آگ میں پڑے بچے کی آواز آئی "امی جان! آپ اپنا ایمان نہ گنوائیں کیونکہ میں اِس آگ میں جل نہیں رہا بلکہ یہ آگ میرے لیے اُسی طرح گلزار ہو گئی ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلزار ہو گئی تھی۔"

اِس حکایت میں ایمان پر ثابت قدمی کے ساتھ ساتھ ایک اور نکتہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے اور وہ ہے ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف سفر۔ اِس کی مثال یوں دے سکتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کا سب سے پہلا سانس ماں کے پیٹ میں لیتا ہے۔ پہلی بار اُس کا دل بھی وہیں دھڑکتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ایک بہت تنگ جگہ پڑا ہوتا ہے، وہیں رب کی قدرت سے اُسے خوراک مہیا ہوتی ہے، وہیں وہ سانس لیتا ہے اور اُس کا دل دھڑکتا ہے۔ وہیں اُس کی Movement ہوتی ہے۔ بچہ اُسی تنگ سی جگہ کو کل کائنات اور محفوظ جگہ جان رہا ہوتا ہے حالاں کہ وہ وہاں سمٹ کر لیٹا ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں پھیلا نہیں سکتا لیکن پھر بھی اُس جگہ کو محفوظ اور Comfortable سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس تنگ جگہ سے وہ کئی بلین گنا زیادہ وسیع جگہ پر آتا ہے تو پُرانی محفوظ جگہ چھوٹ جانے کے غم میں روتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہوش سنبھالنے کے بعد اِس دُنیا کی رعنائی، خوب صورتی اور دل کشی دیکھ کر اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ جگہ جسے چھوڑنے پر وہ رو رہا تھا، بہت تنگ تھی جب کہ یہ دُنیا تو بہت وسیع ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ اِس دُنیا سے دل لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں کی مصروفیات، مشاغل، دلچسپیاں اُسے اِس قدر بھا جاتی ہیں کہ پھر اُس کا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

جب سانس پورے ہو جاتے ہیں تو مجھ جیسے گناہ گار روتے ہوئے یہاں سے جاتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے نیک اعمال کیے اور زندگی بھر رب کو راضی کرنے میں لگے رہے وہ خوشی خوشی جاتے ہیں۔ جنھیں رب نے اپنا قرب عطا کر دیا، وہ زندگی میں اِسی انتظار میں رہتے ہیں کہ میں کب اِس جہان سے جاؤں تا کہ میری اپنے دوست، اپنے رب سے ملاقات ہو سکے۔

جس جہان کو چھوڑ آیا وہ تو بہت ہی چھوٹا تھا۔ جہاں مرنے کے بعد آیا اُس کی نہ حد ہے نہ حساب۔ وہاں جا کر تھوڑا سا فرق پڑتا ہے کہ اگر اعمال نیک ہوں تو انسان جنت میں چلا جائے گا بصورت دیگر صورت حال خاصی مختلف ہو گی۔

ہمارے اعمال کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں پتا نہیں چل سکتا۔ جو تلوار نیام یا غلاف میں ہو اُس کی اصلیت کیا ہے؟ کس شکل کی ہے؟ یہ پتا لگانا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ نیام کی شکل سے ہم تلوار کی شکل کا کچھ اندازہ لگا لیں گے لیکن اصلیت جاننے کے لیے صاحبِ کشف ہونا ضروری ہے۔

وہ رُوح جو ہمارے جسم میں بند ہے اُس رُوح کی کیفیت کیا ہے؟ وہ کیفیت فیصلہ کرے گی کہ اگلے جہان جا کر اِس کا انجام کیا ہونا ہے۔ جس طرح نیام میں بند تلوار کا پتا نہیں چلتا اِسی طرح جسم میں بند رُوح کی اصلی کیفیت ہم پر واضح نہیں ہوتی۔ اگر ہم پر اصل حالات منکشف ہونے لگیں تو پتا چل جائے گا کہ نیام میں بند تلوار لوہے، سٹین لیس سٹیل کی ہے یا لکڑی کی۔ اگر تلوار سٹین لیس سٹیل کی بنی ہے تو ہر کوئی تعریف کرے گا، اگر لکڑی کی ہے اور اُس پر لوہے کا رنگ روغن کیا ہے تو اُسے غصے سے زمین پر مار دیا جائے گا۔ اِسی طرح ہماری رُوح کا حال ہے کہ جب ہم یہاں اچھے اعمال کرتے ہیں تو ہماری رُوح پھلتی پھولتی اور توانا ہوتی ہے۔ جب ایسی رُوح جسم سے نکلے گی تو اِس کا ٹھکانا جنت ہو گا ورنہ مختلف انجام سے دوچار ہو جائے گی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہو گا کہ وہ کیسے اعمال ہیں جن سے رُوح پھلتی پھولتی اور توانا ہوتی ہے۔ کثافتیں دُور ہونے کے نتیجے میں رُوح لطیف ہو جائے گی۔ رُوح کی لطافت کے لیے ضروری ہے کہ ہم عبادات اور نیکی کا ایک Combination اپنے لیے تیار کر لیں۔ اِس کے لیے ہمیں کسی Intelligence کی ضرورت نہیں بلکہ رب نے ہمیں وہ Combination پہلے ہی تیار کر کے دیا ہے قرآن پاک اور سنت کی صورت۔

اگر ہم باریکی سے دیکھیں گے تو بہت سی ایسی چیزیں ہمیں دکھائی دینے لگیں گی جو ہمارے نظریات وتصورات سے مختلف ہوں گی۔ آپ ﷺ نے اپنی روزمرہ زندگی یا دن کو تین حصوں میں یوں تقسیم کیا ہوا تھا کہ تمام فرائض ومعاملات بااحسن وخوبی سرانجام پاتے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہتا تھا۔

ہم میں سے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ عرب ممالک میں لوگ سنت نماز ادا نہیں کرتے، صرف فرض نماز ادا کرنے کے بعد واپس چلے آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے، آپ ﷺ کا یہ معمول رہا کہ فرض نماز مسجد میں ادا کرتے کیونکہ فرض نماز باجماعت ادا کرنے کی فضیلت ہے لیکن باقی عبادات مخفی تھیں۔ میرا گمان ہے کہ شاید عرب میں اِسی روایت پر عمل ہوتا ہے۔

آپ ﷺ فرض عبادات کے سوا باقی سب عبادات تنہائی میں کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں Major emphasis دوسروں کے ساتھ سلوک پر نظر آتا ہے، دوسروں کے ساتھ لین دین اور Attitude and behaviour toward others پر بہت زور ہے۔ آپ ﷺ دوسروں پر بہت مہربان تھے۔ آپ ﷺ صرف اپنی اُمت کے لیے ہی مہربان نہ تھے بلکہ دشمنوں کے لیے بھی اُسی قدر مہربان تھے۔ ہم جو عبادات کرتے ہیں یقیناً اُس کا اجر وثواب ملتا ہے۔ ہمیں عبادت کرنی چاہیے کیونکہ عبادت رب کا ہم پر حق ہے کیونکہ وہ ہمارا خالق و رب ہے اور رب بھی ایسا جو بے پناہ مہربان اور معاف فرمانے والا ہے۔

عبادت رب کا وہ حق ہے جو ضرور ادا ہونا چاہیے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں، حج بھی کیا ہوا ہے، پھر بھی بہت مشکلات ہیں۔ ہمیں Clear ہونا چاہیے کہ جو عبادات ہم کرتے ہیں وہ تو رب کا ہم پر حق ہے کیونکہ وہ سب سے عظیم ہے، ہمارا پالنے والا اور خالق ہے، لائق عبادت ہے۔ جو مصیبت آرہی ہے اِس کے بارے میں تو رب نے قرآن میں بتا دیا کہ انسان پر کوئی مصیبت نہیں آتی سوائے اُس کے اپنے ہاتھ کے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ہم یہ سوچ کر عبادت کریں کہ یہ رب کا حق ہے کیونکہ وہی لائق عبادت ہے۔ لیکن جو طرزِ عمل ہمیں جنت کی طرف لے جائے گا وہ، وہ ہے جس کے بارے میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہمیں Major emphasis نظر آتا ہے۔ وہ ہے ہمارے وہ رویے اور طور طریقے جو ہم خلقِ خدا کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نیکی ہے۔ اگر ہمارے رویے قرآن کی بتائی ہوئی حدود کے مطابق ہیں اور اِس کے ساتھ ساتھ ہم آپ ﷺ کے Set کیے ہوئے معیار کے قریب پہنچ جاتے ہیں یا کم از کم سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ نیکی ہے۔

عبادت اور نیکی کا Combination ہماری رُوح کو لطافت کے اُس مقام پر لے جائے گا کہ جب وہ ہمارے جسم کی قید سے آزاد ہوگی تو اُس رُوح کو جنت کا مقام ملے گا۔ اگر ہم یہ Combination قائم نہیں کر پاتے تو معاملہ مختلف ہوگا......اور اِس سے رب کی پناہ مانگنی چاہیے۔

سوال: جب انسان گناہوں سے دُوری اختیار کرلے اور توبہ کرلے لیکن پھر بھی دھتکارا جائے اور ناکامی کا سامنا کرے تو کیا یہ اُس کے گزشتہ گناہوں کی سزا ہوتی ہے؟

جواب: توبہ دراصل نام ہی اُس عمل کا ہے کہ جو غلطیاں، کوتاہیاں اور گناہ ماضی میں ہوئے اُن کے لیے اللہ کے حضور معافی مانگ لی جائے اور عہد کیا جائے کہ میں آیندہ ایسا نہیں کروں گا۔ گزشتہ گناہوں کی معافی اور آیندہ گناہوں سے بچنے کا وعدہ توبہ کہلاتا ہے۔

جب رب سے ہم صدقِ دل سے معافی مانگ لیتے ہیں تو وہ رب اِتنا مہربان ہے کہ سوائے شرک کے بندے کے باقی گناہ معاف کرتا جاتا ہے، درگزر کرتا رہتا ہے۔ جب ہمارے کسی جُرم یا گناہ کو معاف کردیا گیا تو پھر اُس پر سزا کا کوئی سوال ہی نہیں۔

جو شخص اللہ کے حضور توبہ کرلیتا ہے، اُس کی نہ صرف پچھلی خطاؤں کی سزا معاف ہوجاتی ہے بلکہ آیندہ اگر وہ اپنے وعدے پر قائم رہے تو اُس پر انعامات کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اولیائے کرام میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کسی دور میں نامی گرامی ڈاکو رہے، معاشرتی بُرائیوں میں مبتلا رہے لیکن پھر اُنھوں نے سچے دل سے توبہ کی اور اُس پر قائم بھی رہے تو رب تعالیٰ نے اُنھیں اعلیٰ مقام عطا فرمایا۔

رب اِتنا وسیع الظرف ہے کہ جب وہ کسی کو معاف کردیتا ہے تو پھر اُسے سزا نہیں دیتا۔ جب بندہ دھتکارا جاتا ہے تو وہ مجھ جیسے لوگوں کی کم ظرفی ہے۔ اگر کسی سے غلطی ہوجائے تو ہم بظاہر کہہ دیتے ہیں "میں نے آپ کو معاف کیا" لیکن وقتاً فوقتاً اُسے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ سنتِ رب تو یہ ہے کہ جب کسی شخص نے معافی مانگ لی تو اُسے اِس طرح معاف کردیا جائے کہ ہمارے دل سے یہ خیال تک نکل جائے کہ کبھی اُس شخص سے کوئی غلطی بھی ہوئی تھی۔ طعنہ دینا تو بہت دُور کی بات ہے۔

سنتِ رب تو یہ ہے کہ اگر ہمارے قصوروار نے آکر صرف اِتنا ہی کہہ دیا I am sorry، مجھ سے غلطی ہوگئی تو ہم ایک لفظ کہے بغیر بہت خوش دلی سے اُسے معاف کردیں، فوراً خاموشی اختیار کرلیں کہ کوئی بات نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب انسان رب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہے، معافی مانگ لیتا ہے تو رب بڑی خوش دلی سے معاف فرما دیتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اِس سنت پر عمل کریں۔ یہ ہمارے ظرف کا معاملہ ہے کہ معاف کردینے کے بعد ہم کبھی اُس غلطی کا ذکر نہ کریں، نہ تنہائی میں، نہ کسی کے سامنے اور نہ ہی اُس شخص کے سامنے جس نے غلطی کی تھی۔

جہاں تک ناکامیوں کی آپ نے بات کی...... ہماری ناکامیاں ہماری بے عملی کا نتیجہ ہوتی ہیں سوائے چند Exceptional cases کے جہاں ہم کسی ایسے کام کے لیے کوشش کررہے ہوتے ہیں جو ہمارے لیے مفید نہیں ہوتا۔

ہم اپنی محدود عقل وعلم کی وجہ سے کسی شے کو اپنے لیے فائدہ مند سمجھتے ہیں لیکن رب چونکہ تمام ظاہر وپوشیدہ کو جانتا ہے اِس لیے وہ اپنے رحیم وکریم ہونے کے صدقے ہماری اُن کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ کیوں کہ کامیابی کی صورت میں ہمیں نقصان پہنچے گا۔

اِس Exceptional case کے علاوہ ناکامی ہماری تقدیر نہیں بلکہ بے عملی اور بے تدبیری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ناکامی عام طور پر آتی ہی اُس وقت ہے جب ہم کوشش کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

اللہ نے ہمیں جو عقل وعلم عطا کیے ہیں اُن سے کام لیتے ہوئے اگر ہم مومن کی سی تدبیر وفراست اختیار کریں تو رب تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا فرما دیتا ہے۔

آپ نے کردار کشی کی بات کی۔ بدقسمتی سے ہم بحیثیت قوم ابھی Transition میں ہیں اور جو چیز بھی Transition میں ہو وہ مختلف قسم کے Attacks کے لیے Vulnerable ہو جاتی ہے۔ اِس Transition میں ہونے کی وجہ سے ہمارے یہاں کچھ غلط عادات در آئی ہیں جیسے غیبت جسے ہم Gossip کا نام دیتے ہیں۔ (حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ غیبت کرنا گویا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔) اِسی طرح ہم سب کو یہ حدیث ازبر ہے جس کا مفہوم ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کیے آگے بیان کر دے۔ اِس کے باوجود ہم سنی سنائی باتیں بغیر تحقیق کے آگے پھیلاتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اِس سے معاف فرمائے کہ ہم اپنے بھائیوں اور خود اپنے اُوپر ظلم کریں کیونکہ کسی کی کردار کشی کر کے ہم اپنی ذات پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔

جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بھی Comment کرتا ہے تو بزرگوں کا کہنا ہے کہ دراصل وہ خود اپنی ذات کے بارے میں Comment کر رہا ہوتا ہے، کیونکہ ہم اُسے اپنی ذات کے آئینے میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی کی بُرائی کرتے ہیں تو درحقیقت خود اپنی بُرائی کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اِس لعنت سے دُور رہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ رب ستار العیوب ہے، ہمارے عیوب کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے احوال یہاں تک دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہے کہ کس نے کیا کھایا، کسی کے بارے میں کیا سوچا۔ اِس کو بھی عیاں نہیں ہونے دیتا۔ اللہ جو یہاں تک ہماری پردہ پوشی کرتا ہے، ہم کیوں نہ اُسی کی سنت پر عمل کریں اور اپنے بھائیوں کے معاملات دوسروں پر ظاہر کرنے کے بجائے پوشیدہ رکھیں۔ اِس کا فائدہ ہمیں یہ ہوگا کہ اللہ پاک اِس دُنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی ہمارے عیوب پر پردہ ڈال دے گا۔ دوسروں کی عیب پوشی کر کے دراصل ہم اپنے ساتھ نیکی کر رہے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو غیبت سے محفوظ رکھے اور توفیق بخشے کہ ہم اپنے بھائیوں کی پردہ پوشی کر سکیں۔

آمین!

نشست نمبر 4

صحبت صاحبانِ علم وادب

انسانی زندگی میں صحبت کمال کی چیز ہے۔ ہم ہمیشہ سنتے رہتے ہیں کہ انسان جس صحبت میں بیٹھتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

"انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔"

رُوحانیت میں صحبت یا حلقۂ احباب یا وہ لوگ جن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہو، بہت اہم گردانے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ادنیٰ چیز کسی اعلیٰ چیز کے ساتھ منسلک ہو جائے تو اُس کا Status بھی بدل جاتا ہے جیسے لکڑی یا موم بتی اگر اپنی جگہ پڑی رہے تو بے کار شے سمجھی جائے گی کیوں کہ اُس کا مصرف کوئی نہیں لیکن اگر اُسی موم بتی کو ہم شعلہ دکھا دیں تو وہ جل اُٹھتی ہے اور اپنے ارگرد کے علاقے کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ اُس کی Utility ہے کہ اُس نے اُس جگہ کو ایک مخصوص حد تک روشن کر دیا۔ اسی طرح لکڑی کو جلا لیں تو وہ ہمیں سردی سے بچانے کے کام آئے گی، روشنی پھیلائے گی، کھانا پکانے کے کام آئے گی۔

آگ بذاتِ خود خطرناک شے ہے لیکن اِسے ایک کیتلی اور پانی کی صحبت میسر آ جائے تو یہ چائے اور انواع واقسام کے کھانے تیار کرنے کے کام آتی ہے۔ اِس کی Utility بڑھ جاتی ہے۔

روٹی کا ایک نوالہ اگر ہم پلیٹ میں رکھ چھوڑیں تو اُس کا نہ صرف کوئی مصرف نہیں رہے گا بلکہ دو تین دن بعد اِس پر Fungus لگنا شروع ہو جائے گی اور وہ نوالہ مُضرِ صحت ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہی نوالہ پہلے کھا لیتے تو ہضم کے لیے اُسے Acid مل جاتا جو خوراک کو قابلِ ہضم بنا دیتا۔

جہاں اُس نوالہ سے Life-giving chemicals مل جائیں گے وہیں اُس نوالے کے بے کار ہونے کی صورت میں Fungus لگ جانے سے مُضرِ صحت ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ نوالہ بروقت کھا لیا جاتا تو جزوِ صحت بن سکتا تھا۔

صاحبانِ علم وادب کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کی شخصیت ایک نیا رنگ اختیار کرنے لگتی ہے اور وہ رب کی طرف رُجوع کرنے لگتا ہے۔ رب تعالیٰ نے جتنی چیزیں بنائیں اُن میں طبقات اور درجے رکھے۔ سب سے ادنیٰ درجے پر جمادات ہیں...... وہ چیزیں جو بے جان ہیں جیسے پہاڑ، پتھر، چٹانیں وغیرہ۔ یہ زندگی کی ادنیٰ ترین شکل ہے کیوں کہ اِن میں کوئی حرکت نہیں۔ اِس کا Decay تو ہے مگر ارتقا نہیں...... یہ چیزیں بڑھتی نہیں،

بہتر شکل اختیار نہیں کرتیں لیکن زوال پذیر رہتی ہیں...... زندگی کی وہ شکل جس میں اِرتقا نہ ہو صرف Decay ہو۔ وہ ادنیٰ ترین شکل ہے۔

اِس سے بہتر درجے کی زندگی نباتات کی شکل میں ہے۔ زندگی کی اِرتقا کا اگلا مرحلہ یا اسٹیج حیوانات کی ہے اور سب سے افضل زندگی انسان کی شکل میں ہے۔

انسان اگر ایسی صحبت اختیار کر لے جو اُسے رب سے دُور لے جائے، Materialistic بنا دے، وہ شاید وقتی طور پر تو قابلِ تحسین ہو جائے لیکن انجام کار وہ اپنے زوال کو چلا جائے گا۔ لیکن اگر انسان ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو صاحبانِ علم و ادب ہوں تو پھر انسان اُس راہ پر چل نکلتا ہے جو اُسے روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ اُس بلندی کی طرف لے جانے لگتی ہے جو اُسے رب کے قرب کا اہل بنا دیتی ہے۔

جب ہم اِس راہ پر چلتے ہیں تو ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے، کچھ کھونے کے خدشات اور احساس زیاں (جو False ہوتا ہے حقیقی نہیں) سر اُٹھانے لگتا ہے۔ یہ وسوسے شیطان ڈالتا ہے۔ ہمارا نفس سرکشی کرتا ہے۔

مجھ جیسا کمزور انسان جو گناہوں کا شیدائی ہے، جسے گناہ کی زندگی بہت لبھاتی ہے وہ تقدیر یا Destiny کا Argument استعمال کرتا ہے کہ صاحب! Destiny بھی تو کوئی چیز ہے اور کہتا ہے

I am destinied for this. I am absolutely helpless.

جب کوئی کہتا ہے کہ تم نیکی کی راہ پر کیوں نہیں چلتے تو میں کہتا ہوں کہ صاحب! تقدیر کا جبر بھی تو کوئی چیز ہے۔ میری Destiny (تقدیر) Set ہے۔ میں جو بھی کر لوں، جاؤں گا تو اُسی طرف جو تقدیر میں لکھا ہے۔

جبر و اختیار کمال کی چیز ہے۔ جہاں جبر ہے وہاں نہ کوئی سزا ہے نہ انعام۔ جبر کے نتیجے میں ہونے والے عمل پر گرفت نہیں۔ اِس کی بہترین مثال شاید یہ ہے کہ جب ہم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ خیالات جو عام حالات میں ہمارے قریب سے بھی نہیں گزرتے وہ خود بخود در آتے ہیں۔ خود بخود در آنے والے خیالات پر رب تعالیٰ گرفت نہیں کرتا لیکن وہ خیالات جنھیں ہم Consciously, Deliberately اور Through effort ذہن میں لاتے ہیں، اُن پر گرفت ہے۔

ہمارے پاس اختیار ہے کہ ہم غلط نہ سوچیں اور جب ہم یہ اختیار استعمال نہیں کرتے تو اِس پر گرفت ہے۔ لیکن جہاں ہم مجبور ہیں اور کوشش کے باوجود غلط خیالات پر قابو پانے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر ہم گرفت سے آزاد ہیں۔ غلط کام کر کے یہ بہانہ گھڑنا کہ صاحب! میں کیا کروں...... میری تقدیر میں یہی لکھا تھا، Lame excuse ہے۔

جبر و اختیار کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ پارکنسن کے مریض کے جسم میں رعشہ ہو تو اُس کا جسم ہلتا رہتا ہے۔ چائے کا کپ یا پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ میں ہو تو چائے اور پانی چھلک جاتا ہے۔ میز پر چھینٹے پڑتے ہیں، کپڑے خراب ہو جاتے ہیں لیکن ہم اُسے شرمندہ کرنے کے بجائے دلاسہ دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں۔ آپ فکر نہ کریں یہ سب ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہی حرکت کوئی شخص جان بوجھ کر کرے جان بوجھ کر

گلاس یا کپ یوں ہلائے کہ پانی یا چائے چھلک کر سب کچھ خراب کر دے تو نہ صرف ایسی حرکت کرنے والے کو خود شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ دیکھنے والے بھی اُسے کچھ زیادہ اچھا تصور نہیں کرتے۔

جہاں جبر ہے وہاں پشیمانی نہیں لیکن جہاں اختیار ہے وہاں اگر کوئی ایسی حرکت کریں گے تو پشیمانی بھی ہو گی اور دوسروں سے بات بھی سُننی پڑے گی۔

اگر انسان جبر و قدر کے سامنے اِتنا ہی مجبور ہوتا تو وہ رب جو خالق ہے وہ بطور خالق ہم سے زیادہ ہم سے واقف ہے۔ قدر و جبر اُسی کی طرف سے ہوتا تو ہماری اصلاح کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کبھی نہ بھیجے جاتے۔ وہ اِن پیغمبروں کے ذریعے اپنا دین ہم پر نازل نہ فرماتا۔ لیکن اِس کے برعکس رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ ﷺ تک جتنے پیغمبر بھی بھیجے سبھی ایک ہی پیغام لے کر آئے اور وہ پیغام آپ ﷺ کے دورِ نبوت میں مکمل ہو گیا۔ اب قیامت تک کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ دین اسلام میں کسی Addition یا Alteration کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ ﷺ نبی آخر الزماں ہیں۔ دین قرآن پاک کی شکل میں ہمیں مکمل طور پر Pass on کر دیا گیا ہے۔

یہ دین درحقیقت ایک Paradigm، ایک مکمل سانچا ہے اور رب چاہتا ہے کہ انسان اِس سانچے میں ڈھل جائے اور بہترین انسان بن جائے۔ رب تعالیٰ نے ہمیں وہ سانچا دے دیا اب ہمیں اِس میں ڈھلنا ہے۔ اگر ہم اِتنے ہی مجبور ہوتے تو پھر وہ Paradigm یا سانچا ہمیں کیوں دیا جاتا؟

رب تعالیٰ نے سوائے تقدیرِ معین کے Hardly پانچ سے دس فی صد حصے کے باقی تمام اختیارات ہمیں دے دیے۔ چوں کہ ہمیں اختیار حاصل ہے اور ہم اِس اختیار کو استعمال کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہیں اِس لیے اِس کی جزا و سزا ہے۔

سوال: اگر انسان روزگار میں حد درجہ مصروف رہنے کی وجہ سے دیگر فرائضِ زندگی پورے نہ کر سکے لیکن اِس کے باوجود بندگی کی خواہش رکھتا ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب: کسی مفکر نے کہا تھا ”جو لوگ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں وہ درحقیقت فارغ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ حقیقتاً مصروف رہنے والے ہیں وہ اپنا وقت اِس طرح Organise کر لیتے ہیں کہ اُن کے سبھی کام ہونے لگتے ہیں اور ایسے لوگوں کو وقت کی کمی کے بجائے کام کی کمی کی شکایت رہنے لگتی ہے۔“ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہمارے لیے ایسا بہترین نمونہ ہے جس کی روشنی میں ہم اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے وقت کو اِس طرح تقسیم کیا ہوا تھا کہ تمام اُمور باحسن و خوبی سرانجام پا جاتے۔ اگر ہم بھی اپنے دن کو مختلف اُمور کی مناسبت سے مختلف حصوں میں تقسیم کر لیں تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔

انسان کو اپنی ڈیوٹی ایمان داری اور بااحسن طور پوری کرنی چاہیے۔ روزگار ہو یا فیملی لائف سب کو ایمان داری سے وقت اور توجہ دیں۔ پھر جسم کا بھی ہم پر حق ہے، اِس کو آرام دینا چاہیے۔ رب کا ہم پر حق ہے اُس کی بھی عبادت کی جانی چاہیے۔

اگر ہم اپنا وقت Properly تقسیم کر لیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں جن بزرگ (سید یعقوب علی

شاہ رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس حاضر ہوتا تھا وہ بہت سختی سے فرمایا کرتے تھے کہ ڈیوٹی پہلے ہے، اِس میں کوتاہی نہ کرو۔ میں صرف دفتری اُمور کی انجام دہی کو ہی ڈیوٹی سمجھتا تھا لیکن انھوں نے بتایا کہ ڈیوٹی میں روزگار کے معاملات، فیملی لائف، دوست احباب، رشتہ دار اور عبادات سب شامل ہیں۔ اور جسم کا بھی حق ادا کرنا ہے، اِسے آرام دینا ہے۔

خود میں نے ایک لمبا عرصہ دفتر میں روزانہ چودہ گھنٹے کام کیا۔ اتوار کو بھی چھٹی نہیں کی، حتیٰ کہ عید والے دن بھی آفس کا کام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا بنایا ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو جسم روٹین کے مطابق Adjust ہو جاتا ہے۔

میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے کئی کئی روز بستر پر لیٹ نہیں پاتے تھے۔ انھوں نے اپنی لائبریری میں ایک Easy chair رکھی ہوئی تھی، جب تھک جاتے تو اُسی پر پندرہ بیس منٹ آرام کر لیتے اور فریش اُٹھتے۔ آخری لمحے تک وہ کام کرتے رہے۔ اُن کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ وفات کے وقت اُن کی عمر اُٹھاسی (88) برس تھی۔ اُنھوں نے بہت سی کتب لکھیں جو پوری دُنیا میں بطور اکنامکس سبجیکٹ پڑھائی جاتی ہیں۔ اُن کی تحریر کردہ ایم اے اکنامکس کی کتب پاکستان میں بطور ٹیکسٹ بک نصاب میں شامل ہیں۔

یاد رکھیے! انسان معمولات اور مصروفیات کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیتا ہے۔ اگر آپ اپنے معمولات اور وقت کو تھوڑا Organise کر لیں تو آپ کا جسم آپ کا ساتھ دے گا اور رفتہ رفتہ آپ یوں ایڈجسٹ کر لیں گے کہ روزگار کے ساتھ دیگر اُمور بھی بااحسن طور سرانجام دے سکیں گے۔

سوال: اگر کسی کے اندر ایسی بے چینی ہو کہ جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے تو اِس کی کیفیت کو کیا نام دیا جائے؟

جواب: جیسا کہ کچھ دیر پہلے بات ہوئی کہ زندگی درجہ بدرجہ ہے۔ اِسی طرح رب تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت، جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیتیں دوسرے سے مختلف بنائی ہیں۔ اِن کی ڈگری Man to Man مختلف ہو جاتی ہے۔

رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار غور و فکر کی دعوت دی ہے ...... یہ غور و فکر انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تمام جان داروں کی طبیعت میں تجسس موجود ہے، فرق صرف ڈگری کا ہے۔ کسی میں کم تجسس ہے تو کسی میں زیادہ۔

تجسس ہمیں غور و فکر پر اُکساتا ہے۔ جب ہم اپنی اِس جبلت کو Satisfy نہیں کر پاتے، اردگرد کی چیزوں پر غور و فکر نہیں کر پاتے، قرآن پاک اور رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کے بجائے ہم بے معنی باتوں میں وقت گنوانے لگتے ہیں تو ہمارے اندر بے چینی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یوں احساس ہونے لگتا ہے جیسے ہم کسی شے کی تلاش میں ہیں۔ جب بھی طبیعت میں ایسی بے چینی پیدا ہو تو ہمیں غور و فکر میں ڈوب جانا چاہیے۔ ایسے میں اگر قرآن پاک کی کسی آیت یا سورۃ پر غور و فکر کرنے لگیں تو کچھ ہی عرصے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ نت نئے معنی کھلنے لگے ہیں اور طبیعت میں کسی تلاش کی بے چینی کم ہونے لگتی ہے۔

اسی طرح راہِ سلوک میں سیر کے ذریعے رب کی قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کی بہت اہمیت ہے۔ سفر میں انسان جتنا مشاہدہ کرتا ہے کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ اِس لیے آپ دیکھیں گے کہ فقیر اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ سفر کے دوران ہونے والا مشاہدہ اُنھیں رب سے قریب تر کر دیتا ہے۔

میں ہمیشہ ایک بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں کہ جوں جوں رب کی قدرت کا مشاہدہ گہرا ہونے لگتا ہے توں توں رب سے عشق ہوتا چلا جاتا ہے اور جونہی عشق ہوتا ہے، یہ خوف جنم لیتا ہے کہ کہیں میرا محبوب، میرا رب مجھ سے رُوٹھ نہ جائے۔ کیونکہ جس سے عشق ہو اُس کے رُوٹھ جانے کا خوف بڑا شدید ہوا کرتا ہے۔ اِس لیے پھر انسان رب کے چھوٹے چھوٹے احکامات بھی جبراً نہیں بلکہ بہت خوشی سے Carry out کرتا ہے اور یہی عمل اس کے لیے دُنیا و آخرت میں باعث نجات بن جاتا ہے۔

فہم وفراست

ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ وہ اپنے جمال وکمال اور اپنی خوبیوں کا اظہار دوسروں پر کرے اور سب لوگ اُس کی تعریف کریں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کے کمال کا اظہار اُس کے لیے تعریف اور خوبی کا سبب ہی بنے۔ بعض اوقات یہ حسد اور مخالفت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے درویشوں کے یہاں اس احتیاط کی تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے جمال وکمال کا اظہار خود نہ کیا جائے البتہ اگر قدرت کی طرف سے اس کا اظہار ہو جائے تو اور بات ہے۔ اِسی طرح فہم وفراست کا اظہار از خود نہ کیا جائے لیکن اگر حالات اِس کا اظہار کر دیں تو اور بات ہے۔

ایمان کے تین درجے ہیں:

1۔ ایمان بالغیب

2۔ ایمان بالتقلید

3۔ ایمان بالاستدلال

جو لوگ اللہ کی راہ پر چلتے اور اُس کے حکم کے مطابق غور وفکر سے کام لیتے ہیں، اللہ اُن پر نت نئے راز کھولتا چلا جاتا ہے، اسرارِ قدرت کے نت نئے پرت اُن پر عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں ایک سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ ایک نکتے پر غور کرنے سے نئے نکتے سامنے آنے لگتے ہیں۔ اِس کی مثال یوں ہے کہ جیسے نسلوں کی افزائش ہوتی ہے۔ ایک فکر، ایک معرفت، دوسری فکر اور معرفت کے ساتھ ملتی ہے تو تیسری فکر ومعرفت جنم لینے لگتی ہے۔ تیسری معرفت ایک نئی معرفت سے ملتی ہے تو ایک اور معرفت وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک Continuous process ہے جو فقیر کے انتقال تک جاری رہتا ہے۔ اِس میں بریک تب آتا ہے جب نفس کی خواہشات غلبہ پانے لگتی ہیں۔ اُس وقت غور وفکر اور نئے نکتوں کے کھلنے کا سلسلہ بند ہونے لگتا ہے۔

جب انسان غور وفکر کرتا رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں نت نئے نکتے سامنے آتے رہتے ہیں تو پھر اس میں مومن کی سی فہم وفراست پیدا ہونے لگتی ہے، لیکن اِس فہم وفراست کو بہتر ڈگری کی طرف لے جانے کے لیے بھی غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔

یہ دُنیا رب تعالیٰ کی ایک Potpurri ہے۔ جس طرح Potpurri میں مختلف انواع کی پتیاں جمع ہوتی ہیں اسی طرح یہ Potpurri (دُنیا) رب تعالیٰ کی ایسی خوش رنگ تخلیق ہے جس میں بہت Diverse چیزیں لوگوں کو ملتی ہیں۔ بچوں کا ایک کھیل ہے Jigsaw Puzzle، جس میں چھوٹے بڑے Pieces (ٹکڑے) ہوتے ہیں۔ بچوں کی ذہانت بڑھانے اور Problem کو Solve کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے اُن کے سامنے یہ Game رکھی جاتی ہے۔ بچے اِن چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ کر ایک Shape دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں اُن کی ذہانت اور مسئلہ کو حل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس Jigsaw Puzzle میں اگر ایک Piece بھی غلط جگہ پر رکھ دیا جائے تو شکل مکمل نہیں ہوتی۔ کائنات جہاں اتنی رنگین وخوش رنگ ہے وہاں یہ Jigsaw Puzzle بھی ہے۔ رب تعالیٰ اپنے اس Jigsaw Puzzle کو مکمل شکل دیے ہوئے ہے۔ اس لیے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے Piece کو اپنی جگہ جمایا ہوا ہے۔ اِس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان مکمل نہیں، ہر انسان میں کوئی منفرد خوبی اور کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ ہر انسان کی اپنی علیحدہ علیحدہ خوبیاں اور خامیاں ہیں۔

جس طرح ہم گیئرز کو اکٹھا کر کے مشین کو چلاتے ہیں۔ Male and Female گیئرز اور Pieces کو جوڑ کر مشین بناتے ہیں۔ اِسی طرح ہر انسان دوسرے کی خامیوں میں اپنی خوبیاں شامل کر کے ایک مکمل شکل بناتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جن کو رب نے فہم وفراست عطا کی، اُن کے پاس عموماً اتنا رزق یا جمع پونجی نہیں ہوتی کہ کاروبار شروع کر سکیں۔ جن کے پاس مالی وسائل ہوتے ہیں اُن کے پاس عقل وتعلیم نہیں ہوتی۔ یہ سب جب ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو Complement کر دیتے ہیں۔ یوں دُنیا کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔

ایسے ہی ایک صاحب تھے جن کو رب تعالیٰ نے فہم وفراست بہت عطا کی لیکن وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ پریشان رہتے تھے۔ ایک روز وہ شہر سے باہر گئے تو دیکھا کہ ایک قافلہ چلا آرہا ہے اور اُونٹوں پر سامان لدا ہے۔ اُونٹوں کی لمبی قطار گھنٹے دو گھنٹے بعد ختم ہوئی اور آخری اُونٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اُن صاحب نے اُس آدمی سے کہا کہ اِتنا بڑا اُونٹوں کا قافلہ کسی امیر سوداگر کا لگتا ہے۔ وہ آدمی بولا ''وہ سوداگر میں ہی ہوں اور اِن تمام اُونٹوں پر گیہوں لدا ہوا ہے۔ اُونٹوں کی دائیں طرف سو کلوگرام گندم اور بائیں طرف سو کلوگرام ریت ہے۔'' اُن صاحب نے پوچھا ''اے سوداگر! ریت کا کیا کریں گے آپ؟'' سوداگر بولا ''سو کلو گندم کو Balance کرنے کے لیے دوسری طرف ریت ڈالی ہے۔'' اُن صاحب نے کہا ''اگر آپ دونوں طرف گیہوں ڈال دیتے تو اُونٹوں کی نصف تعداد کے ذریعے گیہوں دوسری جگہ منتقل ہو سکتے تھے اور یوں اُونٹوں کے چارے اور پانی کا خرچ بھی نصف رہ جاتا اور انھیں سنبھالنا بھی آسان ہو جاتا۔'' سوداگر بولا ''آپ تو بہت عقل مند انسان ہیں۔ آپ کے پاس تو یقیناً مجھ سے بھی زیادہ اُونٹ ہوں گے۔ میں آپ سے وہ اُونٹ خریدنا چاہوں گا۔'' وہ صاحب بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگے ''جناب! میرے پاس تو ایک اُونٹ بھی نہیں۔

میں تو دو وقت کی روٹی کی تلاش میں ہوں۔'' یہ سن کر سوداگر نے کہا ''صاحب! میں ایسی عقل و دانش سے باز آیا جس سے دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہو۔ میں بے وقوف ہی بھلا!''

رب تعالیٰ اس کائنات کو ہر طرح کے انسانوں سے چلاتا ہے۔

Law of Nature کے چار ذیلی قوانین (Sub-laws) میں سے ایک Law of Diversity (قانونِ تنوع) بھی ہے۔ فقیر یا درویش، جن کے پاس علم، عقل اور فہم وفراست ہوتی ہے وہ عموماً دُنیاوی مال و زر سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ یہ اور بات کہ رب تعالیٰ اُن کا بھرم رکھتا ہے۔ اُن کی جیبیں خالی ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ امیر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے مال و زر سے نوازا ہے لیکن وہ اپنی حرکتوں، شکل اور باتوں سے یوں دکھائی دیتے ہیں کہ شاید اُن کو دو وقت کی روٹی تک بھی مشکل سے میسر آتی ہے۔

رب تعالیٰ اپنے بندوں کو یوں ہی ممتاز کرتا ہے۔ یہ ایک Known fact ہے۔ آپ ﷺ کا قد مبارک درمیانہ تھا لیکن آپ ﷺ طویل قامت لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہوتے تو اُن میں سب سے بلند دکھائی دیتے۔

فقیر، درویش یا صاحبانِ علم کو کبھی لوگوں میں کھڑا دیکھیے تو وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا لیکن لوگوں کو لگتا ہے کہ وہ بہت امیر ہیں۔ اُن کی دُنیاوی تعلیم کم ہوتی ہے لیکن رب اُنھیں کچھ ایسی Projection دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ دکھائی دیتے ہیں۔

رب تعالیٰ جن بندوں کو عزیز رکھتا ہے اُنھیں اپنے طریقے سے نوازتا ہے۔ ہمارا معیار کچھ اور ہے، رب کا کچھ اور۔ ہمارا دوسروں کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ کسی کے پاس مال و زر کتنا ہے؟ کتنا بڑا عہدہ ہے؟ رب دیکھتا ہے کہ میرے بندے کا اخلاق کتنا بلند ہے۔ اخلاق سے یہاں مراد ہے "Character"۔ آپ ﷺ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ میں کردار کے معنوں میں 'اخلاق' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں......

وہ فقیر جو کُٹیا میں بیٹھے ہیں، اُن کے پاس وقت کے حکمران اور اُمرا بھی جاتے ہیں تو جوتا باہر اُتار دیتے ہیں اور واپس آتے ہوئے اُن کی طرف پشت نہیں کرتے۔ یہ رب کا انعام ہے کہ اپنی مخلوق میں اپنے فقیر کو بلند کر دیتا ہے۔

مال و زر کی بات ہو رہی ہے تو عرض کر دوں کہ ایک بڑے نامور فقیر جو مجذوب تھے، زیادہ تر جذب کی کیفیت میں رہتے، وہ بہلول مجذوب کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہارون الرشید کے دور میں ایک روز جب وہ درخت کے نیچے بیٹھے تھے تو حاکمِ وقت ہارون الرشید کی سواری وہاں سے گزری۔ ہارون الرشید نے اپنے وزیر سے کہا ''اشرفیوں کی ایک تھیلی بہلول صاحب کی نذر کر دو۔'' وزیر نے جب بہلول صاحب کو وہ ہدیہ پیش کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے وہ تھیلی یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مجھے اس کی حاجت نہیں۔ تب ہارون الرشید خود چل کر آیا اور تھیلی قبول کرنے کی درخواست کی کہ آپ کا ایک ایک بال قرض میں جکڑا ہے وہ اس سے ادا ہو جائے گا۔ یہ سن کر بہلول صاحب نے بہت کمال کا جواب دیا'' کہ جو رب تمھیں یہ مال دینے پر

قادر ہے کیا وہ مجھے یہ نہیں دے سکتا......! میں تم سے کیوں لوں...... لے جاؤ اِسے۔'' جنھیں رب یہ فہم وفراست سکھاتا ہے اُن میں ایسی ہی بے نیازی آجاتی ہے۔ اُن کا رب کے ساتھ ایسا تعلق جڑ جاتا ہے کہ وہ کتنے ہی مجبور کیوں نہ ہوں، صرف اور صرف رب کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی کسی غیر اللہ سے اُمید نہیں لگاتے کسی غیر اللہ کی طرف اپنے مسائل کے حل کے لیے نہیں دیکھتے۔

بات علم و دانش اور فہم وفراست کی ہو رہی تھی۔ اِسے حاصل کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے ''غور و فکر''۔

غور و فکر دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے:

1- ہم ذاتِ الٰہی پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔

2- ہم اسرارِ الٰہی اور کارخانہ قدرت پر غور کر سکتے ہیں۔

آپ ﷺ نے ذاتِ الٰہی پر غور و فکر سے منع فرمایا کیونکہ ذاتِ الٰہی اتنی وسیع ہے کہ ہماری محدود عقل وہاں تک نہیں پہنچ پائے گی اور ہم ہوش و حواس سے عاری ہو جائیں گے۔ اس لیے ذاتِ الٰہی نہیں بلکہ اسرارِ الٰہی پر غور کیا جائے۔ رب تعالیٰ کی تخلیقات اور نظامِ کائنات پر غور کیا جائے۔

غور و فکر کے لیے ہمیں ایک Starting point چاہیے...... یا تو اس پر عمل کر لیا جائے کہ جس نے خود کو پہچانا اُس نے رب کو پہچان لیا یا پھر ہم قرآن پاک کی آیات، حروف اور الفاظ پر غور کرنا شروع کر دیں اور اس پر غور کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم کثرت سے تلاوتِ قرآن کریں۔ یہ قرآن پاک کا معجزہ ہے کہ کثرت سے تلاوت کرنے سے عربی نہ جاننے کے باوجود ہم پر قرآن کے معانی کھلنے لگتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم وظائف و تسبیحات کے پیچھے بھاگتے ہیں جب کہ قربِ الٰہی کے حصول کا آسان ترین راستہ قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت ہے۔

بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ صاحب کا فرمان ہے ''قرآن پاک کی تلاوت سے ہر لفظ سے نہ صرف ہزار سال کی عبادات کے برابر ثواب ملتا ہے بلکہ اس کے Equivalent (برابر) بدیاں ہمارے نامۂ اعمال سے کاٹ دی جاتی ہیں۔''

نفلی عبادات میں افضل ترین عبادت کثرت سے تلاوتِ قرآن پاک کرنا ہے۔ اس سے ہم پر فکر کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور یہ راہیں ہمیں رب کے قرب اور دوستی کے حصول تک لے جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق بخشے کہ ہم قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کر پائیں۔

سوال: حالتِ سُکر کسے کہتے ہیں؟

جواب: فقیر یا درویش پر دو کیفیات طاری ہوتی ہیں:

1- حالتِ سُکر

2- حالتِ صحو

حالتِ صحو میں فقیر اپنے ہوش و حواس میں ہوتا ہے، اُسے اپنی ذات اور ذہن پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔

سالک حالت صحو میں رہتا ہے۔ زندگی میں دو چار بار ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ حالت سکر میں چلا جائے۔

حالت سکر وہ ہے کہ جب فقیر کا اپنے ذہن پر کنٹرول ختم ہو جائے اور اُس کی زبان سے کچھ الفاظ بغیر سوچے سمجھے ادا ہونے لگیں۔ جب اپنی ذات پر کنٹرول ختم ہو جائے تو پھر ہوش وحواس میں نہ ہونے کی وجہ سے اُسے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب فقیر حالت سکر میں ہو تو اُس سے دُور رہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ حالت صحو میں تو وہ سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے جس کا نقصان نہیں ہوتا لیکن حالت سکر میں کہی گئی بات ٹلتی نہیں بلکہ فوری طور پر پوری ہو جائے گی۔ فقیر حالت سکر میں چونکہ جوش میں ہوتا ہے اور اُس کی زبان سے عموماً ایسے الفاظ نکلتے ہیں جن سے نقصان ہی ہوتا ہے۔

ہم بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ فقیر سے دُور رہنا بہتر ہے کیونکہ پتا نہیں چلتا کہ وہ اِس وقت کس حالت میں ہے۔ عقل مند لوگ فقیر سے دُور رہتے ہیں کہ کہیں وہ چڑ نہ جائے اور حالت سکر میں جا کر کچھ کہہ نہ دے۔

سوال: کیا حالت سکر میں فقیر دُعا بھی دے سکتا ہے؟

جواب: یقینی طور پر...... حالت سکر میں فقیر کی زبان سے نکلنے والے الفاظ رب پورے کر دیتا ہے کیونکہ اُس وقت وہ اُس حالت یا کیفیت میں ہوتا ہے کہ جہاں وہ رب کے عشق میں کھویا ہوتا ہے اور یک جائی کی حالت میں ہوتا ہے۔

لیکن Safe راستہ وہی ہے کہ فقیر سے دُور رہا جائے۔ اُس سے کم سے کم گفتگو کی جائے۔ آپ اُس کے پاس جائیے، ایک آدھ جملے میں اپنے مطلب کی بات کیجیے اور اُٹھ کر واپس آ جائیے۔ فقیر آپ سے بہت پیار کرے گا۔ کیونکہ فقیر حالت استغراق میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ کمپنی کے بجائے غور وفکر کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

جب ہم فقیر کے سر پر سوار رہتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ لمبی بات کر کے فائدہ اُٹھا لیں گے تو ہماری اس حرکت سے فقیر اندر سے Annoy ہو رہا ہوتا ہے۔

فقیر سے جتنی مختصر سے مختصر ترین بات کی جا سکتی ہو، کیجیے، پھر دیکھیے کہ کس طرح آپ کو فائدے ملتے ہیں۔

سوال: بندہ گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نفس پھر بھی کنٹرول میں نہیں آتا۔ کوئی وظیفہ ہے اِس کے لیے؟

جواب: اللہ کے دین میں گناہ وثواب اور جزا وسزا کا Concept ہے۔ جہاں اختیار ہے وہاں سزا ہے، لیکن جہاں جبر ہے وہاں سزا نہیں خواہ وہ جبر قدر یا تقدیر کا ہو یا حالات کا۔

مسلمان کو یہاں تک اجازت دی گئی کہ اگر جان کا خطرہ ہو تو وہ جان بچانے کے لیے یہ تک کہہ سکتا ہے کہ میں مسلمان نہیں۔ اگر جان بچانے کے لیے خوراک نہ ہو تو گھوڑے کا گوشت اِس قدر کھا سکتے ہیں کہ جس سے جان بچ جائے۔ شراب ممنوع ہے لیکن اگر کسی بیماری کا علاج الکوحل میں ہو تو اُتنی مقدار میں پینے کی اجازت دی گئی ہے جس سے وہ بیماری دُور ہو جائے ...... یہ حالات کا جبر ہے...... سزا اختیار کی ہے، جبر کے تحت کوئی سزا نہیں۔

اب اگر نماز مجھ پر فرض کی گئی ہے تو میں نمازی ہونے کے لیے اگر لوگوں سے دُعائیں کراؤں یا وظائف

پڑھوں تو کمال دُعا یا وظیفہ کا ہے اور نماز کا انعام بھی اُسی دُعا اور وظیفہ کو ہی ملنا چاہیے۔ نماز سے ہٹنے کے لیے میں نے وظیفہ پڑھ لیا تو گناہ بھی وظیفہ کو ہونا چاہیے نہ کہ مجھے۔

رب تعالیٰ نے مجھے فرض عبادات کا حکم دیا ہے اور گناہوں سے بچنے کے لیے نفس سے لڑنے کی تلقین کی نہ کہ وظیفہ پڑھنے کی۔ نفس سے لڑنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو چاہے اُس سے 180 ڈگری Opposite ہم چل پڑیں۔ نفس سے لڑنے کی یہ کوشش بہت اہم گنی جائے گی اور اِس کا ثواب ملے گا۔

ہم ایسے دور میں ہیں جہاں ہم ہر مسئلے اور معاملے کے حل کے لیے وظیفہ کرنا چاہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے بھی محض دُعا اور وظیفہ سے ہی کام لینا چاہتے ہیں حالاں کہ اُن کی تربیت بحیثیت والدین ہم پر فرض ہے۔ مسلمان اپنے فرائض کی انجام دہی سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ مسلمان تو اپنے فرائض تن دہی سے انجام دیتا ہے خواہ وہ فرائض عبادات سے متعلق ہوں یا دیگر ذمہ داریوں کے بارے میں۔

مختلف لوگ مختلف دُعائیں کرانے آتے ہیں۔ ایک بہت خوبصورت اور دلچسپ دُعا سے میرا واسطہ پڑا۔

ایک شخص میرے پاس آیا اور پوٹھوہاری لہجے میں کہا۔

''تُسیں مارے لئی دُعا کرو۔''

میں نے کہا کہ ''کیا دُعا کروں؟''

شخص: ''میں جس کاروبار نوں ہتھ لاناں، او تباہ ہو جاندا، اوہدے وچ Loss بہوں ہوندا۔ تساں دعا کرو، میرے کاروبار وچ فائدہ ہو جاوے۔''

میں: ''آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟''

شخص: ''کاروبار تاں کجھ نئیں کردا۔''

میں: ''آپ کیا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔''

شخص: ''مارے کو کیہہ پتا کہ کیا کاروبار کراں۔ تساں ای دسو۔''

میں: ''میں تو اَن پڑھ آدمی ہوں۔ کاروبار کے بارے میں جاننا تو میرے بس میں نہیں۔ آپ کسی سے پوچھ لیں۔''

شخص: ''تساں ای دسو کہ کیہدے کولوں پتا کراں۔''

میں: ''آپ اپنے جاننے والوں میں سے کسی سمجھ دار آدمی سے پوچھ لیں۔''

شخص: ''مارے ٹوں کس طراں پتا لگ سی کہ کون سمجھ دارا اے تے کون بے وقوف؟''

میں: ''آپ ایسا کریں کہ انٹرنیٹ پر چیک کر لیں کہ کون سا کاروبار آپ کر سکتے ہیں۔''

شخص: ''تساں دسو میں انٹرنیٹ تے کس طراں جا ساں؟''

میں: ''بہت آسان کام ہے۔ کسی انٹرنیٹ کیفے پر چلے جائیں۔ وہ فی گھنٹہ دس پندرہ روپے چارج کریں گے۔ آپ وہاں جا کر گوگل میں Enter کریں۔

Businesses for New Entrepreneurs ایک لمبی لسٹ آ جائے گی۔ اُس میں سے پانچ چھ کاروبار کے نام Select کر کے میرے پاس لے آئیے۔ میں دُعا کر کے عرض کر دوں گا کہ کون سا کاروبار آپ کے لیے Best suited ہے۔"

شخص: "پر مارے کوں تو انٹرنیٹ استعمال کرناں نئیں اوناں۔"

میں اُن صاحب کو Run down نہیں کر رہا۔ اللہ مجھے معاف فرمائے۔ وہ صاحب مجھ سے بہتر شخص تھے۔ اُن کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ مسلمان کا رویہ نہیں کہ کوشش اور محنت کی راہ چھوڑ دے اور دُعاؤں اور وظائف پر تکیہ کرنے لگے۔

اِسی طرح ایک روز ایک صاحب نے ایسی دُعا کرائی جسے میں نے بہت انجوائے کیا۔ وہ بہت Decent, Sobre اور Good looking نوجوان تھا۔ کہنے لگا "شاہ صاحب! دُعا کر دیجیے کہ میں CSS میں پاس ہو جاؤں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "پاس ہونے کا تعلق تو آپ کی محنت سے ہے۔ رب تعالیٰ بڑا مہربان ہے، جتنی ہم محنت و کوشش کرتے ہیں اُس سے کئی گنا بڑھا کر اجر ہمیں عطا فرما دیتا ہے۔ آپ جتنی محنت کریں گے اُس سے بڑھ کر نتیجہ آپ کو مل جائے گا۔" نوجوان نے کہا "محنت تو میں کر رہا ہوں، آپ دُعا کر دیجیے کہ میں پاس ہو جاؤں۔" میں نے پوچھا "رزلٹ کب ہے؟" بولا "نومبر 2014ء میں۔" میں نے کہا "ابھی تو بہت وقت ہے۔ ابھی تو Exam بھی نہیں ہوا۔ آپ رزلٹ سے ایک ہفتہ پہلے آ جایئے گا میں ضرور دُعا کر دوں گا۔" نوجوان بے ساختہ بولا، "وہ تو مجھے پتا ہے کہ آپ رزلٹ سے ایک ہفتہ پہلے دُعا کرتے ہیں لیکن میں اِس لیے جلدی آ گیا کیوں کہ میرا خیال ہے کہ آپ اُس وقت تک زندہ نہیں ہوں گے۔"

اُس نوجوان کی بات کو میں نے واقعی بہت انجوائے کیا۔

I love that man.

دُعاؤں کے سلسلے بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم اپنے اپنے معیار قائم کر لیتے ہیں۔ میں تو آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ نفس کو وظائف سے زیر نہ کیجیے بلکہ نفس کی مخالفت کر کے اُسے قابو کیجیے۔ نفس جو کہے اُس سے 180 ڈگری برعکس کیجیے۔ نفس قابو میں آ جائے گا۔

چند رُوحانی نکتے

سوال: کیسے پتا چلے گا کہ ہم متوکل ہو گئے ہیں یا بے حس؟

جواب: متوکل اور بے حس میں پہلا بنیادی فرق یہ ہے کہ بے حس انسان پر کسی قسم کے حالات یا کسی کا دُکھ درد اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ شخص کسی کا احساس کیے بغیر اپنی راہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص توکل کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو تب تک وہ اِتنا رقیق القلب ہو چکا ہوتا ہے کہ کسی کا درد دیکھ کر اُس پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

متوکل ہونا بہت پائے کی بات ہے جب کہ بے حس ہونا اُس کے 180 ڈگری Opposite کیفیت کا نام ہے۔ متوکل وہ نہیں ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہتا ہے کہ اللہ میرے منہ میں لقمہ توڑ کر ڈال دے گا بلکہ متوکل وہ ہے جو اپنے تیئں ہمت و سکت کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے۔ اِس کوشش کے نتیجے میں رب کی طرف سے جو بھی عطا ہو جائے...... کامیابی یا ناکامی...... دونوں کو بڑی خوش دلی سے تسلیم کر لیتا ہے۔

متوکل کو جو مل جائے وہ اُس پر خوش اور قانع ہو جاتا ہے، اُس میں حرص نہیں ہوتی۔ توکل کا اعلیٰ ترین مقام وہ ہے جہاں انسان راضی بہ رضائے الٰہی ہو جاتا ہے۔ وہ اِسی میں خوش رہتا ہے جس میں اُس کا رب راضی ہو...... متوکل وہ ہے جو صرف رب سے اُمید لگائے ہوئے ہو، جو کسی غیر اللہ سے توقع نہیں رکھتا اور نہ ہی غیر اللہ سے سوال کرتا ہے۔ متوکل وہ ہے جو یہ کہے اور دل سے سمجھے کہ میرے لیے تو صرف میرا رب ہی کافی ہے۔

رب تعالیٰ ہم سب کو بے حسی سے بچائے۔ یہ انسانی صفات میں سے نہیں۔ آپ نے اگر خود کبھی شکار کھیلا ہے تو آپ کو تجربہ ہو گا یا پھر آپ نے ٹی وی پر مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب جانوروں کے ریوڑ پر شیر حملہ آور ہوتا ہے تو سب جانور اپنی جان بچانے کے لیے تھوڑا سا دوڑتے ہیں اور جب شیر شکار کر لیتا ہے تو اس کے بعد دوبارہ پہلے ہی کی طرح سب جانور گھاس چرنے لگتے ہیں۔ یہ جانوروں کی بے حسی ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی جان بچانے کے لیے رُکتے نہیں۔

سوال: لاہور میں کون کون سے اولیاء اللہ ایسے ہیں جو وصال کے بعد بھی صاحب امر ہیں؟

جواب: میں اِس کا اہل نہیں کہ کسی صاحبِ علم یا صاحبِ امر کے بارے میں کسی قسم کی رائے کا اِظہار کر سکوں۔ چونکہ یہ سب مجھ سے کہیں بہتر ہیں اِس لیے میرے لیے سب ہی بہت بڑے ہیں۔ زندگی یا بعد از وصال کون

صاحبِ امر یا صاحبِ تصرف ہیں، یہ بتانے کے لیے اُن سے بڑا یا کم از کم اُن کے پائے کا ولی اللہ ہونا ضروری ہے جب کہ میں گناہ گار ترین شخص سے بھی زیادہ گناہ گار ہوں۔

میرا تو مشورہ یہی ہوگا کہ آپ جب بھی کسی مزار پر جائیں تو یہی سمجھ کر جائیں کہ وہ مجھ سے کہیں بڑے ولی اللہ ہیں اور مجھ سے کہیں بلند مقام پر فائز ہیں۔ میں اُن میں سے بہت چھوٹا ہوں اور اُن سے اکتسابِ فیض کے لیے جا رہا ہوں۔

ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ پانی بلندی سے نشیب کی طرف بہتا ہے، نشیب سے بلندی کی طرف نہیں...... جب تک ہم کسی کو بڑا نہیں سمجھیں اور مانیں گے تب تک اُن سے اکتسابِ فیض اور حصولِ علم نہیں ہو سکے گا۔

سوال: کیا سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی رُوح بھی صاحب امر ہے؟

جواب: صاحبو! سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے مرشد ہیں۔ اگر وہ کچھ نہ بھی ہوتے اور میں نے اُنھیں اپنا مرشد مان لیا ہوتا تو اللہ، اُس کے رسول ﷺ، تمام پیغمبروں اور صحابہ کرامؓ کے بعد وہ میرے لیے سب سے بڑے انسان ہوتے۔

جب تک مرید اپنے مرشد کو عظیم نہیں سمجھتا، اُن کی تقلید نہیں کر سکتا اور جب تک وہ کسی کی تقلید نہیں کرتا، کسی مقام پر نہیں پہنچ پاتا۔

اولیائے کرام علم کے مختلف مدارج پر فائز ہوتے ہیں۔ ولی اللہ کے مقام کا اِنحصار علم پر ہوتا ہے۔ اُس کے پاس موجود علم کی بنیاد پر ہی پتا چلتا ہے کہ ولی اللہ صاحب امر کے مقام پر ہے صاحبِ دُعا یا صاحبِ کشف کے مقام پر ہے۔

اُن اولیائے کرام میں بھی ایسے صاحبانِ علم گزرے ہیں جن کے پاس بے پناہ علم تھا، دُنیا سے چلے جانے کے باوجود اُن کے تصرفات جاری ہیں۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کوئی بھی صاحبِ علم جب تک زندہ ہوتا ہے تو اِتنا بڑا صاحبِ تصرف نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد اُن کے تصرفات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آپ کار یا موٹر سائیکل چلا رہے ہوں اور گاڑی کو نیوٹرل کر دیں تو اُس کی سپیڈ فوری طور پر بڑھ جاتی ہے۔ اِسی طرح صاحبِ علم جب تک دُنیا میں ہوتا ہے اُس کا علم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ ایک کنٹرول میں ہوتا ہے۔ جب تک کار کے Accelerator پر آپ پاؤں رکھے ہوتے ہیں سپیڈ نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ کیوں کہ اُسے انجن کے Revolutions کنٹرول کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جونہی اُسے نیوٹرل کرتے ہیں تو گاڑی کی سپیڈ ایک دم بڑھے گی اور پھر Slow down ہونا شروع ہو جائے گی۔ اِسی طرح صاحبِ علم اگر اپنی زندگی میں صاحب تصرف ہیں تو انتقال کے بعد اُن کے تصرفات بڑھ جائیں گے اور اُن میں زور پیدا ہو جائے گا۔

جب میں کہتا ہوں ''صاحبِ تصرف'' تو اِس میں ''صاحبِ امر'' بھی آ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا تصرف ہے کہ رب بندے سے یوں راضی ہو جاتا ہے کہ اُس کی کہی ہوئی ہر بات کو پورا کر دیتا ہے۔ اِس میں اُس بندے کا کوئی کمال نہیں۔ یہ صرف اور صرف رب کی رحمت کی بدولت ہوتا ہے۔ رب نہ چاہے تو کوئی کسی بھی مقام پر فائز کیوں نہ ہو، رب کی قدرت کے سامنے مجبور ہے۔ صرف رب ہے جو جو چاہتا ہے، ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ جب کسی بندے سے ایسا راضی ہوتا ہے کہ وہ بندہ جو بھی کہے، رب کی حیا اور وضع داری اُس بندے کی زبان سے نکلی ہر بات پوری کر دیتی ہے۔

البتہ یہ یاد رکھیے کہ عالم الغیب صرف رب ہے۔ وہ جسے جتنا چاہتا ہے علم عطا کر دیتا ہے لیکن غیب کا وہ علم جس میں وقت کا تعین ہو جائے، وہ علم رب کسی کو عطا نہیں کرتا۔ جہاں وقت کے تعین کی بات آئے گی وہاں ولی اللہ مجبور ہو جائے گا۔

سوال: کیا فی زمانہ بھی جب کوئی ولی اللہ اپنے کسی مرید کو کوئی خاص علم عطا کرنا چاہتے ہیں تو پہلے سند کی تصدیق کراتے ہیں جیسا کہ چراغِ دہلی صاحب کیا کرتے تھے؟

جواب: علم دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ علم ہے جو فقیر ہر ایک کو دے دے گا۔ ایک عالم لوگوں کو یہ بتاتا ہے کہ What is what? یہ یقیناً ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اِس لیے علما کا درجہ و مقام بہت بلند ہے۔ لیکن فقیر یہ بتاتا ہے کہ اِس علم کو Implement کیسے کرنا ہے۔ علم کی Theory علما جب کہ اُس کا پریکٹیکل فقرا بتاتے ہیں۔

فقیر اپنے پاس آنے والوں کو علم سے بھی نوازتا ہے اور اُن کی تربیت بھی کرتا ہے لیکن اُس کا انداز اِتنا غیر محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو احساس تک نہیں ہونے پاتا کہ اُسے علم دیا جا رہا ہے، اُس کی تربیت کی جا رہی ہے۔

چونکہ یہ سب بہت غیر محسوس انداز میں ہو رہا ہوتا ہے۔ اِس لیے مرید بور ہو کر مرشد سے دُور نہیں بھاگے گا بلکہ Attract ہوگا۔ کیوں کہ مرشد کا علم دینے اور تربیت کرنے کا انداز غیر محسوس اور Pleasant (خوش گوار) ہوتا ہے۔

یہ جو تصدیق کرانے کا قصہ ہے ایک بار میں نے کسی نشست میں عرض کیا تھا کہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مرشد جناب حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ سے عشق تھا۔ مرشد کو بھی اُن سے پیار تھا۔ جناب نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ صاحب اُنھیں وہ علم عطا کرنا چاہتے تھے جو انسان کو اللہ سے قریب کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اُنھیں ولی اللہ بنانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو ایک تھال میں کچھ کھانے کی چیزیں پیالیوں میں رکھ کر حضرت چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا۔ چراغ دہلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غور سے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا اور برتن خالی کر کے تھال واپس کر دیا۔ جب حضرت امیر خسرو صاحب رحمۃ اللہ علیہ واپس آئے تو حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے پوچھا ''چراغ دہلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ کہا آپ سے؟'' امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ''نہیں، بس کھانا اپنے برتن میں ڈال کر خالی برتن واپس دے

دیے۔" تب حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "امیر خسرو! میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تمھیں ولایت دے دوں لیکن منظوری نہیں ہوئی۔ یہ تمھاری تقدیر میں نہیں ہے۔"

یہ قصہ بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب خاص علم کسی کو دینا مقصود ہو تو پہلے اُس کی تصدیق کر لی جاتی ہے۔ تصدیق کرنے کے دو طریقے ہیں:

- اگر دونوں Duties (علم دینا اور اُس کی تصدیق کرنا) ایک ہی آدمی کے پاس ہیں تو وہ تصدیق کے لیے آپ کو کہیں نہیں بھیجے گا بلکہ نگاہوں سے آپ کو پرکھ لے گا کیوں کہ Approval دینا بھی اُسی کا کام ہے۔ یوں آپ کو پرکھنے کے بعد علم دے دیا جائے گا۔
- دوسرا طریقہ وہی ہے جس کا کچھ دیر پہلے ذکر ہوا کہ اگر صاحبِ علم کے پاس دونوں نہیں بلکہ صرف ایک ڈیوٹی ہے تو وہ آپ کی تربیت کرتا رہے گا لیکن جب آپ کو ولایت دینا چاہے گا تو اُس کے لیے Approval لینے کے لیے آپ کو متعلقہ آدمی کے پاس بھیجے گا۔

جس طرح کرکٹ یا کسی بھی گیم کے Protocols ہوتے ہیں کہ ٹریننگ کیسے ہوگی؟ کھلاڑی کو پرکھا کیسے جائے گا؟ اِس پرکھ کی بنیاد پر اُسے فرسٹ الیون میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اِسے طریقہ کار کہہ لیجیے یا پروٹوکول۔

اِسی طرح رُوحانیت کے اپنے Protocols، قواعد وضوابط اور قوانین ہوتے ہیں جن پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ آپ نے زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی لوگوں کے رویے کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب انسان اِس انتظار میں رہے کہ مجھے کیا ملا اور کیا نہیں؟ مجھے کچھ ملا بھی یا نہیں؟ تو اُسے کچھ نہیں ملتا۔ یہ اِس راہ کی ایک خاص بات ہے کہ جو اِس راہ سلوک پر اِس لیے آیا کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے، مجھے رب کی دوستی مل جائے، رب مجھ سے خوش ہو جائے اور مجھے اپنے دوستوں میں شامل کر لے، ایسے شخص کو بہت جلدی سب کچھ مل جاتا ہے۔

اِس راہِ سلوک میں کسی کو کیا ملا؟ کتنا ملا؟ اِس کا پیمانہ کہیں دستیاب نہیں۔ ہم موٹر سائیکل یا کار کو دوڑاتے ہیں۔ سپیڈومیٹر ہمیں کار کی رفتار کے بارے میں Indicate کرتا رہتا ہے۔ ہم سکول یا کالج میں پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں میں کلاس V میں ہوں، میں نے میٹرک کر لیا ہے، انٹر، بی اے، ایم اے کر لیا ہے۔ ہمارے پاس پیمانہ موجود ہوتا ہے جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو ہم Blind ہو جاتے ہیں کہ کس رفتار سے سفر کر رہے ہیں۔ صرف پائلٹ کو جہاز کی سپیڈ کا علم ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر ہم کار میں سفر کر رہے ہوں تو سڑک کے اطراف میں لگے Poles اور درخت جس تیز رفتاری سے ہمیں گزرتے دکھائی دیتے ہیں اُس سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اِس وقت کار کی Roughly speed کیا ہوگی۔ لیکن ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے Window سے باہر دیکھیں تو چونکہ آس پاس کوئی Indicator یا ریفرنس موجود نہیں ہوتا جس سے جہاز کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکے۔ اِس لیے ہمیں ہوائی جہاز ایک جگہ ٹھہرا محسوس ہوتا ہے، حالاں کہ وہ ساڑھے پانچ، پونے چھ سو میل (900، 1000 کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا ہوتا ہے۔

اِسی طرح رُوحانیت میں کوئی ریفرنس نہ ہونے کی وجہ سے انسان خود کو ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لیکن اِس کو ہم یوں Judge کر سکتے ہیں کہ جب ہم اِس راہ پر آئے تھے اُس دن ہماری عادات واطوار کیا تھیں؟ ہماری سوچ کی نہج کیا تھی؟ نفع نقصان کے بارے میں ہمارے کیا رویے تھے؟ دوسرے ہمیں جو دُکھ، تکلیف دیتے اور نقصان پہنچاتے تھے تو ہم کیسے React کرتے تھے؟ مال دنیا ہم دوسروں پر خرچ کر پاتے تھے یا نہیں؟

ہمارے پہلے دن کے احوال اور جس روز ہم نے خود کو چیک کیا، اُس دن کے احوال میں کیا فرق ہے؟ اگر مرشد صحیح ہے تو وہ کام ہی ہماری سوچ پر کرتا ہے۔ ہماری سوچ کو درست کرتا ہے کیوں کہ سوچ ہی عمل کی اِبتدا ہے۔ اگر ہم اپنی سوچ کو ٹھیک نہیں کرتے تو ہمارا عمل ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ سمجھ دار مرشد میرے یا آپ کے سوچنے کے انداز کو تبدیل کرتا ہے جس سے ہمارے رویے میں تبدیلی آنے لگتی ہے اور جب رویے تبدیل ہونے لگیں تو ہم خلقِ خدا میں ہر دل عزیز ہونے لگتے ہیں۔ جب کبھی بھی آپ کے اندر سے آواز اُٹھے کہ ہمیں اِس راہ میں کچھ ملا ہی نہیں تو ہم ذرا اپنا جائزہ لیں کہ جس روز میں اپنے مرشد صاحب کے پاس جا کر بیٹھا تھا اُس روز میرے Attitudes toward others کیا تھے؟ دوسروں کے ایکشن کے جواب میں میرے Reactions کیا تھے۔ اور آج کیا ہیں؟ اگر اُن میں بہتری آئی ہے تو سمجھ لیجیے کہ مرشد آپ پر کام کر رہا ہے اور اگر تبدیلی نہیں آئی تو پھر مرشد آپ پر کام نہیں کر رہا۔

فرق اصل میں روّیوں، عادات اور عمل میں آتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کشف وکرامات کو اِس راہ میں ترقی کی کسوٹی نہ سمجھیں۔

میرا دل بھی چاہتا ہے کہ میری گاڑی کا پٹرول بچ جائے، میں اُڑ کر اسلام آباد پہنچ جاؤں لیکن میرے مرشد صاحب نے ابھی تک تو مجھے کچھ دیا نہیں، اس لیے مجھے گاڑی سے ہی اسلام آباد جانا پڑتا ہے۔

ایک بار میں کراچی گیا تو سمندر پر جا کر پانی پر چلنے لگا تو ایک لائف گارڈ نے آ کر مجھے بچایا کہ "عقل کرو، یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا کہ "اپنے مرشد کو آزما رہا ہوں کہ مجھے پانی پر چلنا سکھایا یا نہیں۔"

مرشد کو کرامات کی بنیاد پر نہ پرکھیے۔ علم کی راہ میں کرامات بہت ناپسندیدہ شے ہیں۔ کرامات بہت بڑی Distraction ہیں، انسان کو راہ سے ہٹا دیتی ہیں۔ کرامات سے دُور رہیے اور اگر کبھی کوئی کرامت سرزد ہو بھی جائے تو پلٹ کر نہ دیکھیے اور کہیے "بھائی! چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔" کرامات کو اہمیت دینے سے انسان بھٹک جاتا ہے۔

ہم تو ولی اللہ کو پرکھتے ہی اِس بات پر ہیں کہ وہ مستجاب الدعوات ہیں یا نہیں......! آنے والے وقت کی خبر دے دینا کوئی بڑی بات نہیں......! آنے والے وقت کی خبر تو کتے اور بلیاں بھی دے دیتے ہیں۔ سادھو جو مشرک ہے وہ بھی آنے والے معاملات کی خبر دے دے گا۔ کرامات یا آنے والے وقت کی خبر دینا کوئی اِتنی بڑی بات نہیں۔ اِس سے منہ موڑ لیجیے، اِن سے دُور ہو جایئے۔

صاحب امر ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ اہم صرف ایک بات ہے کہ مجھے رب کا قرب حاصل ہوا یا نہیں......! رب میرا ہوا یا نہیں......! اہم صرف رب ہے باقی سب Distractions ہیں۔ ان میں کچھ نہیں رکھا، اِن کی حقیقت سوائے مداری کی شعبدہ بازی کے کچھ نہیں۔ نظر اس پر رکھیے کہ میرے مرشد نے میری تربیت کی ہے یا نہیں...... اگر تربیت کی ہے تو میرے رویوں میں مثبت تبدیلی آنی چاہیے، اگر رویوں میں تبدیلی نہیں آئی تو سمجھ لیں کہ تربیت نہیں ہوئی۔ یہ رویے ہی ہیں جو انسان کو رب کے قریب لے جاتے ہیں یا ناپسندیدہ بنا دیتے ہیں...... رویوں کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

سوال: کیا مرشد اپنے مرید کو علمِ لدنی یا خاص علم عطا کرنے کے لیے کسی خاص پروٹوکول یا اجازت کا پابند ہوتا ہے؟

جواب: جن لوگوں کا حصہ مرشد کے پاس ہوتا ہے اُن کی شکل رب کی طرف سے مرشد کو دکھادی جاتی ہے کہ اس شخص کو علم دینا ہے۔ لیکن مرشد کبھی اُس شخص کو تلاش نہیں کرتا بلکہ اُس شخص کو خود چل کر مرشد کے پاس جانا پڑتا ہے۔

یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ مرشد کو کوئی شخص کسی وجہ سے پسند آجائے تو وہ اُسے علم سے نواز دے گا۔ لیکن اگر ولایت اُس کی تقدیر میں نہیں لکھی تو کم از کم صاحبِ علم اُسے ایسا بنا دے گا کہ وہ دوسروں میں نمایاں ہو جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت امیر خسرو کو ولایت تو عطا نہیں کر سکتے تھے لیکن اُنھیں سلام عطا کر دیا کہ جو میرے پاس آئے، پہلے اُنھیں سلام کرے۔ یہ مرشد کی اپنے مرید سے محبت کا ایک اِظہار ہے۔ اگر ولایت کسی شخص کی تقدیر میں نہیں لیکن وہ مرید مرشد کو پسند ہے تو وہ اُسے کسی اور انداز میں نواز دیتا ہے۔ واسطہ Important یوں ہو جاتا ہے کہ پانی اور آگ ایک دوسرے کی ضد ہیں، اگر ہم پانی کو آگ پر ڈالیں تو آگ بجھ جاتی ہے...... وہی پانی جو آگ کو بجھا دیتا ہے اگر اُسی پانی کو ہم کیتلی میں ڈال کر آگ پر چڑھا دیں تو نہ صرف وہ آگ کو بجھا نہیں پاتا بلکہ اُلٹا آگ اُس پر اثر انداز ہو جاتی ہے اور وہ کھولنے لگتا ہے۔ یہ جو پانی کی فطرت میں تبدیلی واقع ہوئی کہ آگ کو بجھانے کے بجائے خود اُس سے متاثر ہو کر اُبلنے لگا اِس کی وجہ یہ ہے کہ آگ اور پانی کے درمیان برتن یعنی کیتلی آ گئی ہے۔ اگر کہیں واسطہ مضبوط ہے اور وہ آپ کے اور دُنیا کے درمیان آ گیا تو یہ واسطہ فطرت بدل دے گا اور انسان کو اُس مقام پر لے جائے گا جہاں پانی بجائے آگ کو بجھانے کے پانی سے اثر قبول کر کے اُبلنے لگا۔ آپ کا وہ مضبوط واسطہ آپ کو گناہوں اور بُرائیوں سے دور لے جائے گا۔

سوال: مرشد کا مقام باپ سے بلند کیوں ہے؟

جواب: رب نے باپ کا وہ مقام رکھا کہ اگر باپ اپنے بچوں میں سے کسی سے ناراض ہو گیا تو رب بھی اُس سے ناراض ہو گیا اور جس سے باپ راضی ہوا اُس سے رب راضی ہو گیا۔ جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ سے

مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا باپ کی رضا میں رب کی رضا ہے اور باپ کی ناراضگی میں رب کی ناراضگی ہے۔ (جامع ترمذی 1899)

لیکن باپ سے مرشد کا مقام اِس لیے بلند ہے کہ ہم نے Biological father کو خود نہیں چنا۔ وہ نیچر کی طرف سے ہے، وہ عطا ہے۔ لیکن مرشد کو ہم نے By choice پایا اور جو چیز ہم By choice حاصل کرتے ہیں وہ ہماری اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ چونکہ مرشد کو ہم نے Free will پر چنا اِس لیے اِس انتخاب کی پوری ذمہ داری ہمیں قبول کرنا ہوگی۔ مرشد کا چناؤ کرتے وقت بہت محتاط رہیں، جذباتی نہ ہوں۔ کیونکہ اگر یہ واسطہ کمزور ہوگا تو پھر وہ ہمارے اور آگ کے درمیان حائل نہیں ہو پائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق بخشے کہ ہم صحیح آدمی کو مرشد کے طور پر چن سکیں۔ آمین!

صحبت کے اثرات وثمرات

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ شعروادب سے گہرا شغف رکھتے تھے اور ادبی شخصیات کے ساتھ اکثر اُن کی محفلیں جمی رہتیں جس کی وجہ سے وہ اکثر گھر سے غائب رہتے۔ بیگم اِس پر خاصی برہم رہتیں۔ ایک بار کئی روز کی غیر حاضری کے بعد گھر تشریف لائے تو بیگم نے غصہ میں آکر مٹی کی ہنڈیا شیخ سعدی کے سر پر دے ماری۔ اُس کا پیندا ٹوٹ گیا اور باقی ہانڈی طوق کی طرح اُن کی گردن میں جا پڑی۔ تب انھوں نے مصاحبوں سے کہا ''یہ سنت ہے جو ٹوٹ کر میرے گلے پڑ گئی۔''

سقراط محفل میں بیٹھے مادے کی ماہیت اور روّیوں کے حوالے سے مختلف نکتے سلجھایا کرتے اور بحث کیا کرتے۔ گھر پر توجہ دینے کا وقت نہ ملتا۔ Earnings اِتنی کم تھیں کہ دو وقت کی روٹی بمشکل ملتی۔ ایک روز گھر آئے تو بیگم پہلے بہت گرجی پھر پانی کی بالٹی اُن کے سر پر اُلٹ دی۔ سقراط نے ہنس کر کہا ''اتنا گرجنے کے بعد برسنا تو لازم تھا۔''

اِسی طرح ایک فقیر کو اُن کی بیگم ہر وقت بے نقط سنایا کرتیں۔ ایک بار مرید بھی وہاں موجود تھے اور حیران تھے کہ ایسی زبان برداشت کرنا کسی انسان کے لیے آسان نہیں لیکن فقیر اِس قدر تلخ روّیے پر بھی مسکرا رہے تھے۔ مریدوں نے وجہ دریافت کی تو فقیر نے کہا ''میاں! تمھیں نہیں پتا کہ بیگم کی اِسی قسم کی تندخوئی نے تو مجھے صبر کا خوگر بنایا اور صبر کی خوبی کی وجہ سے مجھے ولایت نصیب ہوئی۔''

دیکھا جائے تو یہ سب واقعات تقریباً ایک سے ہیں لیکن کیفیات یا ردعمل کے اِظہار کا طریقہ سب کا جُدا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق چونکہ شعروادب سے تھا، اُن کا ردِعمل وہی تھا جو ایک شاعر کا ہو سکتا ہے۔ شاعر لفظوں سے کھیلتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا ''یہ سنت ہے جو ٹوٹ کر میرے گلے پڑ گئی ہے'' بظاہر خاصی گستاخی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو سمجھ آتی ہے کہ اُن کا مقصد گستاخی ہرگز نہیں تھا جب کہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ نہ وہ شادی کرتے اور نہ وہ ہنڈیا ٹوٹ کر اُن کے گلے کا ہار بنتی۔

سقراط دانش ور آدمی تھے۔ نکتے سے نکتہ نکالنا اُن کی فطرت میں تھا۔ اُنھوں نے نکتہ نکالا کہ بیگم پہلے گرج رہی تھیں۔ جب پانی سر پر انڈیلا تو نیا نکتہ نکالا کہ ''اتنا گرجنے کے بعد برسنا تو لازم تھا۔''

فقیر نے بیگم کی تندخوئی کو اپنے ہی انداز میں لیا کہ یہ تندخوئی اور سخت بیانی برداشت کرتے کرتے صبر کی عادت ہو گئی جو اُنھیں ولایت کے مقام پر لے گئی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے کے خواص مقام اور موقع کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور ہر انسان ایک ہی چیز کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ انگور اگر کسی حد تک کچا ہے تو اُسے کھائیں تو ذائقہ تُرش اور کھٹا ہو گا۔ یہی انگور اگر بیل پر پوری طرح پک جائے تو وہی کھٹا رس میٹھا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ Over-ripe ہو جائے تو وہی میٹھا رس سرکے میں بدل جاتا ہے۔ اگر اُس سرکے کو ہم کافی دیر تک ایک علیحدہ جگہ پر سٹور کر دیں اور اُس پر گرمی پڑتی رہے تو اُس میں بیکٹریا پیدا ہو جائے گا اور اُس میں خمیر آ جائے گا۔ اُس کی Fermentation ہو جائے گی اور وہ حرام قرار پائے گا کیوں کہ وہ شراب بن جائے گا۔ پھل ایک ہی ہے لیکن کیفیات بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کی تاثیر، خاصیت، اثر اور فوائد تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب ہم کسی کی کہی ہوئی بات کو سنتے ہیں تو اُس پر ہمارے روّیے مختلف ہو سکتے ہیں۔ مجھ جیسا جذباتی انسان جو سطحی انداز میں چیزوں کو لیتا ہے، وہ صرف الفاظ کو دیکھ کر فوراً حکم دے گا کہ اُن صاحب نے یہ بات غلط یا صحیح کی ہے...... اگر آپ جیسا پڑھا لکھا علم والا انسان وہی جملہ سُنے گا تو اپنا ری ایکشن فوری طور پر نہیں دے گا بلکہ غور کرے گا کہ درحقیقت کہا کیا گیا ہے۔ وہ الفاظ کے بجائے کہنے والے کے اصل مطلب پر نظر رکھے گا۔

اگر دانش ور اِس جملے کو سُنے گا تو بجائے اپنا ردعمل ظاہر کرنے کے اُس پر غور کرنے لگے گا کہ اُس بات میں کیا کیا نکتے پوشیدہ ہیں...... اگر کوئی ولی اللہ یا صاحبِ علم اُس جملے کو سُنے گا تو اُس پر غور کرے گا اور غور کے بعد اگر وہ اِس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ بات کچھ زیادہ پائے کی نہیں ہے یا کہنے والے کی نیت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی تو وہ آرام سے کہہ دے گا ''صاحب! یہ جملہ میری سمجھ میں نہیں آیا، جن صاحب نے یہ کہا یقیناً انھوں نے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہو گا اور اِس کے معنی اچھے ہی ہوں گے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے۔'' یہ مثبت روّیہ کہلائے گا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک روز Gravitational force کو Explain کر رہے تھے کہ تمام اجرامِ فلکی فضا میں آزادانہ تیر رہے ہیں، کسی چیز سے بندھے یا لٹکے نہیں۔ یہ قدرت کا ایک شاہکار ہیں۔ تب ایک صاحب جو میری طرح علم سے بے بہرہ تھے، کہنے لگے ''جناب! ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی چیز فضا میں آزادانہ تیرتی رہے۔'' مولانا روم نے جواب دیا ''زمین کا خلا میں تیرنا یا معلق رہنا Gravitational force کا نتیجہ ہے کیوں کہ زمین پر چھ طرف سے Gravitational force (کشش ثقل) Equal quantum میں پڑ رہی ہے۔ اِس Equal force نے اِسے قائم کر رکھا ہے۔ اِس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ انڈے کو توڑ کر دیکھیں۔ اُس کی زردی عین درمیان میں معلق نظر آتی ہے۔ آپ انڈے کو جتنا بھی ہلا لیں زردی کبھی ایک سائیڈ پر نہیں جائے گی۔

بات ہو رہی تھی ہر چیز کے خواص کی...... ایک ہی چیز جو ایک جگہ کفر کہلاتی ہے، دوسری جگہ اُس کا مقام اور موقع تبدیل ہونے سے وہی چیز کچھ اور کہلاتی ہے۔ شراب ایک جگہ حرام ہے لیکن اگر کبھی صرف بقدر ضرورت

بطورِ دوا استعمال کی جائے تو جائز ہے۔ جھوٹ بولنا منع ہے لیکن ایسا سچ جس سے شر پھیلتا ہو اُسے Avoid کرنا اور چھپا لینا جائز ہو جاتا ہے۔

جب ہم علم سے متعلق چیزوں کو دیکھتے ہیں تو پھر ہمیں اِس قانون و قاعدے کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر سچ حقیقت بھی ہو لیکن ہر حقیقت سچ ضرور ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی شخص کو شراب پیتا دیکھیں اور کہیں کہ وہ شراب پی رہا تھا تو یہ سچ ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ حقیقت ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر نے اُسے اُس کی کسی بیماری کی وجہ سے ایک مختصر مقدار میں شراب کی تاکید کی ہو اور جب وہ شخص شراب بطورِ دوا پی رہا ہو تو مجھ جیسا شخص اُس کے پاس چلا جائے اور اُسے شراب پیتا دیکھ لے۔ حالاں کہ وہ حقیقت نہیں لیکن سچ ضرور ہے۔

جب ہم کوئی بات دیکھتے ہیں تو بے شک وہ سچ ہی کیوں نہ ہو اُس کی حقیقت کو جانے بغیر ہم کسی شخص کے بارے میں رائے قائم کرنے کے سزاوار نہیں۔ اور نہ ہی ہمیں یہ حق ہے کہ اِس حقیقت کو جانے بغیر دوسروں تک پھیلا دیں۔

سوال: تصوف میں حضرت علیؓ کی دہلیز تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟

جواب: ہم اپنی کم علمی اور جذباتیت کی وجہ سے کسی کا ایک جملہ سن کر فوراً ری ایکشن دیتے ہیں کہ یہ جھوٹ اور شرک ہے لیکن کوئی بھی سمجھدار انسان غور کیے بغیر کبھی ردِعمل ظاہر نہیں کرتا۔ رُوحانیت میں ایک جملہ "محاورتاً" استعمال کیا جاتا ہے، صرف کسی بات کو Explain کرنے کے لیے کہ مرشد کو رب کا درجہ دینا چاہیے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مرشد کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے اور بغیر کوئی Question کیے فوراً Follow کر لینا چاہیے۔ اُن کی بات کو اپنی عقل Apply کیے بغیر مان لینا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ مجھ جیسا انسان جب کسی نیک انسان کے پاس جاتا ہے تو تب ایک ہی وقت میں دو مختلف Forces کام کر رہی ہوتی ہیں۔

1۔ نفس

2۔ مغربی تعلیم یا عقل

یہ دونوں Forces مجھے اپنے مرشد کی بات تسلیم کرنے سے روکتی ہیں۔ میں اُن کی بات کو اپنے نفس اور مغربی تعلیم کی کسوٹی پر پرکھوں گا حالاں کہ نہ میرے پاس وہ علم نہ عقل اور نہ ہی فہم و فراست ہے جو مرشد کے پاس ہے۔ اِس لیے اُن کی بات میری فہم سے بالاتر ہو جائے گی۔ میری عقل اور نفس مجھے اُکسائیں گے کہ یہ غلط بات ہے۔ میری عقل یا نفس یہ گائیڈ نہیں کریں گے کہ مرشد صاحب نے میری عقل و فہم سے اُونچی بات کی ہے۔ جب ہم کسی کی بات ادھوری مانتے ہیں تو اُس کے مطلوبہ نتائج نہیں ملتے لیکن جب ہم کسی کی بات Whole-heartedly مانتے ہیں تو اُس کے نتائج ضرور پیدا ہوں گے خواہ وہ غلط ہی ہوں لیکن ادھوری بات ماننے سے رزلٹ پیدا نہیں ہوتا۔

مرشد کو رب ماننے کی بات تمثیلاً کہی جاتی ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ مرشد کی بات کو بلا چون و چرا خاموشی

سے مان لیا جائے بشرطیکہ مرشد Genuine اور واقعی صاحبِ علم ہو۔ جب ہم مرشد کی پیروی کرتے ہیں (بشرطیکہ مرشد صاحبِ علم ہو) پھر وہ ہمیں اُس راہ پر لے جائے گا جو رب سے قریب کر دیتی ہے۔ درحقیقت مرشد ہمیں اندرونِ لاہور کی پُرپیچ گلیوں سے نکال کر موٹروے کے Start پر لا کھڑا کرے گا اور کہے گا یہ وہ سڑک ہے جو اسلام آباد کو جاتی ہے۔

مرشد آپ کو اُس راہ پر لا کھڑا کرتا ہے جو اللہ کی راہ ہے، جو رب سے قریب کر دیتی ہے اور جو ہمیں ایک مسلمان سے مومن میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اشفاق احمد صاحب نے اِسے یوں Explain کیا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو رب کو مانتا ہے اور مومن وہ ہے جو رب کی مانتا ہے۔ مرشد ہمیں جس راہ پر لا کھڑا کرتا ہے وہ ہمیں مسلمان سے مومن بنا دے گی۔ ہم اللہ کو ماننے سے اللہ کی ماننے لگیں گے۔ اور یہ وہ راہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اِس پر چلتے چلتے انسان حضرت علیؓ کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم وہ مومن ہیں جن کی ساری زندگی اللہ کے احکامات کے تابع ہے اور جو آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق شہرِ علم کا دروازہ ہیں۔ جب ہم حضرت علیؓ کے فرمودات پر عمل کرنے لگتے ہیں تو Advance Training، علم اور ایجوکیشن ہمیں حاصل ہونے لگتی ہے۔ جس راہ پر حضرت علیؓ ہمیں چڑھا دیتے ہیں وہ راہ ہمیں آپ ﷺ تک لے جاتی ہے۔ وہ راستہ ہمیں علم کے شہر تک لے جاتا ہے اور جب ہم آپ ﷺ کی دہلیز تک چلے گئے تو پھر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سنت کی تقلید شروع ہو جاتی ہے اور یہ تقلید رب سے ملا دیتی ہے۔

اِس لیے کہا جاتا ہے کہ تصوف ایک ایسی سیڑھی ہے جو ہمیں رب سے قریب کر دیتی ہے۔ اگر ہم نے مرشد کو اپنی عقل و فہم اور علم استعمال کیے بغیر Follow کر لیا، اپنے نفس کی خواہشات کو Consider کیے بغیر بلا چون و چرا اپنے مرشد کی باتوں کو تسلیم کر لیا تو پھر ہم علم کے اُس مقام پر آ جائیں گے جہاں حضرت علیؓ کے فرمودات کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے لگیں گے۔ جب ہم نے ایسا کر لیا تو پھر ہم آپ ﷺ کی دہلیز پر پہنچ جائیں گے۔ جب ہم آپ ﷺ کی دہلیز تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ﷺ ہمیں اُس راستے پر چڑھا دیتے ہیں جو ہمیں رب تک لے جاتا ہے۔

سوال: اللہ تک پہنچنے اور تزکیہ نفس کے لیے جو مسائل درپیش ہوتے ہیں اُن پر روشنی ڈال دیجیے۔

جواب: دو چیزیں ہمیں خراب کرتی ہیں۔

1۔ عقل یا مغربی تعلیم

2۔ نفس کی خواہشات

تزکیہ نفس کے لیے آسان ترین کام یہ ہے کہ ہم اپنے نفس کی ہر خواہش کی مخالفت کریں۔ جب ہم ایسا کرنے لگتے ہیں تو تزکیہ نفس خود بخود ہونے لگتا ہے۔ نفس کہتا ہے، بہت سردی ہے، نماز کے لیے کیسے اُٹھو گے،

پندرہ منٹ بعد اُٹھ جانا۔ میں نفس کی بات مانتا ہوں، بستر کی گرمی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اِسی دوران میری آنکھ لگ جاتی ہے اور طلوع آفتاب کے بعد میں بیدار ہوتا ہوں۔ اِسی طرح نفس اُکساتا ہے کہ تم جسمانی طور پر بہت کمزور ہو، روزہ نہیں رکھ سکو گے، نڈھال ہو کر گر جاؤ گے۔ میں یہ نہیں دیکھتا کہ مجھ سے کہیں کمزور لوگ روزہ رکھے ہوئے ہیں اور میں روزہ چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس جو کہے، ہم اُس کے 180 ڈگری Opposite چلے جائیں۔ نفس کی سو فیصد مخالفت کر لیجیے، خود بخود تزکیہ نفس ہو جائے گا۔

سوال: مجذوب اور سالک کسے کہتے ہیں؟

جواب: مجذوب اِصطلاحی معنوں میں اُس شخص کو کہتے ہیں جو عشقِ الٰہی میں اپنے ہوش وحواس سے عاری ہو چکا ہو۔ اُس کے پاس سوائے عشقِ الٰہی کے کچھ نہ رہ گیا ہو۔ جو ہر وقت رب کے عشق میں ڈوبا رہے۔

کہا جاتا ہے کہ مجذوب سے جتنا دُور رہا جائے اُتنا ہی بہتر ہے کیوں کہ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ بہت کم مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ مجذوب سے لوگوں کو فائدہ ہو۔ ایسا شخص جو ہمہ وقت عشقِ الٰہی میں ڈوبا ہو لیکن ہوش وحواس قائم رکھے ہوئے ہو، اُسے سالک کہا جاتا ہے۔ سالک کبھی خلقِ خدا سے چڑ بھی جائے تو ایسی بات زبان سے نہیں نکالتا جس سے خلقِ خدا کو نقصان ہوتا ہو۔

سوال: رب کو اپنی کون سی صفت زیادہ پسند ہے؟

جواب: رحمٰن ہونا۔

سوال: ہم نوجوانوں کو کس طرح Spirituality (رُوحانیت) کی طرف مائل کر سکتے ہیں؟

جواب: دو چیزیں ہیں:

1۔ علم

2۔ فہم وفراست یا عقل

علم ہمیں سکھاتا ہے کہ کیا چیز اچھی اور کیا بُری ہے۔ علم ہمیں اِس میں Differentiate کرنا سکھاتا ہے اور عقل سکھاتی ہے کہ اچھوں میں اچھا کیا ہے......! علم ہمیں Vision دیتا ہے......!

انسان وہی سیکھتا ہے جو اس کے معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے۔ جب ہم Place of residence تبدیل کرتے ہیں، ایک سے دوسرے کلچر میں، تو ہمیں سوسائٹیز میں کافی فرق دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم تعلیم یافتہ ہیں، ہمارے پاس Vision اور عقل ہے تو ہم اچھے اور بُرے کو پہچان پائیں گے۔ اچھی بات یا عقل کی بات مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے جہاں سے ملے وہاں سے اُسے لے لے۔

ہم جس کلچر میں رہ رہے ہوں وہاں سے اچھی باتیں Pick کر لیں اور بُری باتیں Drop کر دیں تو گویا ہم نے کھوئی ہوئی وراثت وصول کر لی۔

ہمیں چلوں، مجاہدوں کی طرف نہیں جانا چاہیے لیکن اسلام میں ایک Meditation ایسی ہے جو آپ کو

کھونے نہیں دے گی اور اُس میں کوئی فروعی بھی مسائل نہیں آئیں گے۔ وہ ہے سنت کی اِتباع۔ قرآن کی کتابی شکل وہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور اُس کی عملی شکل آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہے۔ اگر ہم نے آپ ﷺ کی سنت کی اِتباع کر لی تو ہم بہت آسانی سے قرآن پر عمل کرنا شروع کر دیں گے اور یہی راہِ نجات ہے۔

سوال: عشق تو صرف ایک ہی ہستی سے ہو سکتا ہے پھر اللہ اور آپ ﷺ دونوں سے عشق کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ سے پیار کیسے ہوتا ہے؟

جواب: رب سے تو ہم Communicate نہیں کر سکتے۔ وہاں One-sided communication ہوتی ہے۔ نماز پڑھتے ہیں تو رب سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو رب کو سُن رہے ہوتے ہیں۔ یہ One-way communication ہے۔ ضروری ہے کہ درمیان میں ایک Instrument یا ہستی ہو تاکہ Two-way communication ممکن ہو سکے۔ وہ آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ اپنے اُمتیوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور اُن کی فطرت سے واقف ہیں۔ آپ ﷺ نے خود تکلیفیں اُٹھا کر اُمت کی فطرت کے مطابق عملی نمونہ چھوڑا۔ جب تک ہم آپ ﷺ سے عشق نہیں کریں گے، آپ ﷺ کی تمام باتوں کو من وعن نہیں مان سکیں گے، جب تک آپ ﷺ سے پیار اور عشق نہیں ہوگا، تب تک ہم آپ ﷺ کی ہر بات اُس طرح نہیں مان سکیں گے جس طرح ماننے کا حق ہے۔ یہ اور بات کہ آج ہم آپ ﷺ سے پیار کرنے کے باوجود آپ ﷺ کی ایک بات بھی نہیں مانتے۔ جب ہم آپ ﷺ سے عشق کرتے ہیں تو ہمیں رب کی Communication کی سمجھ آنے لگتی ہے۔ تب ہمیں پتا چلتا ہے کہ رب کو ہماری نیکیوں اور عبادات کی ضرورت نہیں، وہ اِن چیزوں سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔ رب نے صرف ہماری بہتری کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور مختلف کتب بھیجیں۔ جب ہمیں سمجھ آ جاتی ہے کہ رب نے ہمیں جو کچھ بھی کرنے کو کہا اُس میں خود ہماری ہی بہتری ہے تو پھر ہمیں رب سے از خود پیار ہونے لگتا ہے۔

سوال: مرشد کی تعلیم و تربیت سے مرید کی ایک سائیڈ تو روشن ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی Massive retaliation کی وجہ سے وہ Mentally stable نہیں ہو پاتا۔ ایسے میں گناہ سے بچنے کے لیے وہ کیا کرے؟

جواب: ایک زمانے میں جب میں گورنمنٹ میں کام کر رہا تھا تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی جاب Advertise ہوئی جس کے لیے میں نے Apply کر دیا۔ جب بورڈ نے ذہن بنا لیا کہ مجھے لینا ہے تو انٹرویو میں بورڈ کے چیئرمین نے مجھ سے کہا ''We have mind to take you'' لیکن میں آپ سے ضرور کہنا چاہوں گا "In private sector, rewards are very high but penalties are also equally high". ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کام جن کے Rewards بڑے High ہیں وہاں Penalties بھی ہوتی ہیں۔ یہ Penalty ہمارا نفس ہے۔ جہاں ہم سے ذرا سی Slip ہو گئی وہاں ہماری

Penalty شروع ہوگئی۔ یہ Rewards ہیں ہی اس لیے کیونکہ ہم اپنے نفس سے لڑتے ہیں۔

علم، ٹریننگ، صحبت...... اِن تین چیزوں سے جب ہم کچھ سیکھتے ہیں اور ہماری ایک سائیڈ Develop اور روشن ہونے لگتی ہے تو دوسری سائیڈ کو ہمیں خود ہی کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔

کسی نے ایک بار مجھ سے سوال پوچھا کہ عیسائی کہتے ہیں ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اب ہم قیامت تک گناہوں سے پاک ہو گئے اور ہم آزاد ہیں۔ جو کرتے رہیں ہمیں سزا نہیں ملے گی کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔''

اِسی طرح مسلمانوں میں یہ Concept رُجحان پا گیا کہ ہم فلاں پیر صاحب کے مرید ہیں، ہمیں کیا فکر، وہ ہمیں بچا لیں گے۔ یہ Concept کہ میرے مرشد مجھے بچا لیں گے، ٹھیک نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ بروزِ حساب باپ بیٹے کے اور بیٹا باپ کے کام نہیں آئے گا۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جواب خود دینا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ کسی کی سفارش کر سکے سوائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو شافع محشر ہیں۔ اِس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیعت کرنے کے بعد میں جو چاہوں کرلوں، پکڑا نہیں جاؤں گا۔

دراصل مرشد اور بیعت کے اصل Concept کو ہم بھول گئے اور ہم نے اسے اپنے فائدے کے مطابق اپنی سوچ کے ذریعے Improvise کر لیا۔ اصل Concept یہ تھا کہ جب ہم کسی صاحبِ علم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور اُن کے پاس جا کر بیٹھنے لگتے ہیں اور اپنی کیفیات اُن سے بیان کرتے ہیں کہ صاحب! میں رشوت کے پیسے کو انکار نہیں کر پا رہا تو وہ صاحبِ علم آپ کو سمجھاتے بھی ہیں اور ذکر الٰہی کی صورت میں کوئی ایسی Exercise بھی کرنے کو کہتے ہیں کہ جس کی وجہ سے آپ رشوت کے پیسے سے محفوظ رہ سکیں۔ مرشد آپ کو دھیان بٹانا سکھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب رشوت کے پیسے ٹیبل پر رکھے ہوں تو یہ پڑھنا شروع کردو۔ اِن پیسوں کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ یوں رشوت لینے اور گناہ کرنے سے بچ جاؤ گے۔

آپ جن صاحبِ علم کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں جو آپ کو علم سکھاتے اور آپ کی ٹریننگ کرتے ہیں، اُن کی صحبت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن سے اپنی ایسی کیفیات کا ذکر کریں جو گناہ کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہیں۔ وہ آپ کو کوئی نہ کوئی ذکر یا طریقہ اُس نفسانی خواہش سے دُور رہنے کا بتا دیں گے۔ وہ کمزور لمحہ بیت جائے تو انسان گناہ سے بچ جاتا ہے کیونکہ گناہ At a spur of the moment سرزد ہوتا ہے۔ انسان Planned گناہ بہت کم کرتا ہے۔ اگر صاحبِ علم نے آپ کو Momentary خواہش سے بچا لیا اور آپ Impulsive نہیں ہوئے تو آپ گناہ سے بچ جائیں گے۔

نشست نمبر 8

امر

ہم سب ''امر'' بارے جاننے میں متجسس ہوتے ہیں کہ امر ہے کیا؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ رُوح امرِ ربی ہے۔

ایک روز شام کے گورنر سے کسی نے پوچھا ''دُنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور اور سخت چیز کیا ہے؟'' اُنھوں نے کافی دیر غور کرنے کے بعد کہا ''اِس کا جواب شاید میں نہ دے سکوں، صرف حضرت علیؓ ہی اِس کا جواب دے سکتے ہیں۔'' لہٰذا ایک ہرکارہ مدینہ منورہ روانہ کیا گیا جس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں جا کر سوال پیش کیا۔ اُس وقت حضرت علیؓ کے صاحبزادگان حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور ایک اور صاحبزادے (جو دوسری بیگم سے تھے) بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؓ نے سوال سُن کر فرمایا کہ یہ اِتنا آسان ہے کہ اِس کا جواب تو یہ بچے بھی دے سکتے ہیں۔ قاصد نے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ سے سوال پوچھا تو اُنھوں نے کمال جواب دیا کہ ''دنیا کی سب سے طاقت ور اور سخت چیز لوہا ہے لیکن لوہے کو آگ پگھلا دیتی ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ لیکن اِسی آگ کو پانی ٹھنڈا کر دیتا ہے یوں پانی آگ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ لیکن ہوا اُسی آگ کو جلا لیتی ہے یوں ہوا پانی سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ ہوا کو چلانے پر دو فرشتے مامور ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں تو ہوا چلنے لگتی ہے۔ یوں وہ فرشتے ہوا سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اُن دونوں فرشتوں پر حضرت جبرائیل علیہ السلام سردار ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام امرِ ربی کے ماتحت ہیں۔ جو حکم اُنھیں رب کی طرف سے ملتا ہے وہ اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یوں امر ربی زیادہ طاقت ور ہے۔'' آخر میں حضرت امام حسنؓ نے ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا ''اور وہ امر رب نے ہمیں عطا فرمایا ہے اور اُس سے ہم اِس دُنیا کو چلا رہے ہیں۔''

کچھ اولیاء اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صاحبِ امر ہیں۔ رب تعالیٰ اُنھیں اتنا عزیز رکھتا ہے کہ وہ جو کہہ دیں رب اُسے پورا کر دیتا ہے لیکن امر کی اصل حقیقت کا اندازہ حضرت امام حسنؓ کے جواب سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو بندے رب سے اِتنے قریب ہو گئے اور اُس کو اِتنے عزیز ہو گئے کہ رب بھی اُن سے پیار کرنے لگا، وہ بندے اگر بغیر سوچے سمجھے بھی کوئی بات کہہ دیں تو رب اُن کی بات ٹالتا نہیں۔ رب اِتنا وضع دار اور حیا

والا ہے کہ اپنے رحیم و کریم ہونے کے صدقے اُن کی کہی بات پوری کر دیتا ہے اور یوں وہ بندے ''صاحب امر'' کہلانے لگتے ہیں۔

سوال: ایک سنت آپ ﷺ کی ظاہری شکل و صورت سے مشابہت ہے جب کہ دوسری سنت آپ ﷺ کے طرزِ اخلاق و معاملات کو اپنانا ہے۔ کیا ایک ہی سنت پر عمل کافی ہے یا دونوں پر عمل ضروری ہے؟

جواب: اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ یہ طرزِ حیات اور Code of conduct ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو زندگی گزارتا دیکھنا چاہتا ہے۔

اگر ہم کسی چیز کو صرف Theoretically ہی بیان کرتے رہیں تو یہ احتمال رہتا ہے کہ شاید کوئی اسے پوری طرح نہ سمجھ سکے کیونکہ کچھ لوگ زیادہ فہم و فراست کے مالک ہوتے ہیں۔ جب کہ کچھ میری طرح عقل و علم سے بے بہرہ۔

اگر سائنس کے Lessons صرف کلاس میں بیٹھ کر لیتے رہیں تو ہم اُنھیں اپنے انداز میں سمجھتے ہیں لیکن اگر اُنہی اسباق یا موضوعات کو Demonstrate کر دیا جائے، اُن کا پریکٹیکل کروا دیا جائے تو ہم بہتر طور پر سمجھ جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ ہمارا خالق ہے۔ اُس سے بہتر ہمیں کوئی نہیں سمجھتا۔ رب نے قرآن نازل کیا اور ساتھ ہی آپ ﷺ کی صورت میں ہمیں پریکٹیکل Demonstration دے دیا تا کہ ہم سمجھ سکیں کہ رب ہم سے کیسی زندگی چاہتا ہے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ عملی قرآن ہے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ بالکل ویسی ہے جس طرح زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک پہلو کم اہم اور دوسرا زیادہ اہم ہے۔ آپ ﷺ اعلانِ نبوت سے قبل ہی اہلِ مکہ میں صادق و امین پکارے جاتے تھے۔ آپ ﷺ کی اعلانِ نبوت سے پہلے کی زندگی بھی لوگوں کے لیے قابلِ تقلید اور ایک نمونہ تھی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ لین دین، برتاؤ Behaviours and attitudes toward others بعینہٖ وہی رکھے جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ ہم سنت کی تقلید کریں اور کوشش کریں کہ ہر سنت کی پیروی کریں۔ میں آپ سے یہ کہہ تو رہا ہوں لیکن خود ایک سنت پر عمل نہیں کر پا رہا۔ میں نے داڑھی نہیں رکھی۔ اِس کے علاوہ بھی آپ مجھے دیکھیں تو مجھ میں بہت سی کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں گی۔

میں وعظ و نصیحت نہیں کر رہا۔ لیکن چونکہ سوال کیا گیا ہے تو عرض کر رہا ہوں کہ ہم آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزاریں تا کہ دُنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔

کم یا زیادہ اہم کی بات ہے ہی نہیں...... آپ ﷺ کا ہر عمل ہی بہت اہم ہے۔

سوال: آپ کی کتاب ''فقیر رنگ'' میں قرض کی ادائیگی کی دُعائیں ہیں۔ کیا وہ سب پڑھ سکتے ہیں؟ اجازت کی ضرورت تو نہیں؟

جواب: اُن میں سے ایک دُعا تو آپ ﷺ نے بتائی ہے۔ آپ ﷺ رحمت المسلمین نہیں بلکہ رحمت اللعالمین ہیں۔ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی چیزیں سب کے لیے ہیں اور ہم نے دیکھا بھی ہے کہ مغربی اقوام نے آپ ﷺ کی تعلیمات کی پیروی کی اور اللہ نے اُنھیں دُنیا میں عروج عطا فرمایا۔ آپ ﷺ کی پیروی جو بھی کرے گا فلاح پا جائے گا۔ یہ اور بات کہ جو کلمہ گو نہیں اُسے دُنیا میں ہی اجر مل جائے گا۔ آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں جب کہ کلمہ گو اور آپ ﷺ کے اُمتی کو آخرت میں بھی اجر ملے گا۔

آپ ﷺ کی بتائی ہوئی دُعا کوئی بھی پڑھ لے، چاہے اُمتی ہو یا نہ ہو...... اُسے فائدہ ہو جائے گا۔

جب UK جاتا ہوں تو وہاں دُعا کے لیے Locals بھی آتے ہیں اور امریکی بھی۔ اُن میں عیسائی اور یہودی بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی مادری زبان انگریزی ہے، اِس کے سوا اُنھیں کوئی زبان نہیں آتی۔ کوئی درجن بھر یہودیوں اور عیسائیوں کو میں نے رومن عربی میں کچھ قرآنی آیات، سورتیں، بالخصوص سورہ الفاتحہ و سورہ اخلاص اور پہلا کلمہ لکھ کر دیا۔ وہ اُسے صبح شام پڑھتے ہیں، رب تعالیٰ نے اُن پر خاص رحمتوں کا نزول کیا۔ وہ کلامِ الٰہی کا ورد کرتے ہیں۔ جو شخص صبح شام ایک سو ایک بار کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا ہے، اُسے نہیں پتا کہ وہ مسلمان ہو چکا۔ اِسی طرح ایک غیر مسلم شخص جو دن میں تین بار قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے، ایک بار اُن کے ساتھ ایک ایسی خاتون آئیں جو سٹریچر پر تھیں، وہ آئیں اور دُعا کرا کے چلی گئیں۔ میں تو کسی سے نہیں پوچھوں گا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ آنے والا اُسی رب کا بندہ ہے جس کا میں ہوں۔ میرے نزدیک یہ سب سے مضبوط رشتہ ہے۔

کافی عرصے بعد وہی صاحب جن کا نام Cliff تھا، آئے اور ایک ای میل جیب سے نکالتے ہوئے کہنے لگے۔ "Mr Shah! Do you remember a lady came to you on stretcher?" چونکہ وہ واحد خاتون تھیں جو اسٹریچر پر آئی تھیں اِس لیے مجھے یاد رہ گیا تھا۔ میں نے کہا "Yes, I do remember." وہ بتانے لگے۔ "She is perfectly alright now. She has sent to you an e-mail." اُنھوں نے مجھے وہ ای میل پڑھنے کو دی۔ جس میں لکھا تھا کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے اب بالکل ٹھیک ہوں اور اب اپنے گارڈن کی خود Gardening کرتی ہوں۔ مزید لکھا تھا کہ میں نے آج رُوحوں سے بات کی۔ حضرت مریمؑ کی رُوح آ گئی۔ (ارواح اس طرح آتی ہیں یا نہیں؟ یہ ٹھیک ہے یا غلط؟ میں محض ایک واقعہ آپ کو سنا رہا ہوں۔ اِس میں میرے عقائد کو دخل نہیں۔) میں نے حضرت مریمؑ کی رُوح سے پوچھا ''Cliff صبح دوپہر شام قرآن پاک پڑھتا ہے، ایک Muslim spiritualist نے ایسا کرنے کو کہا ہے، کہیں وہ غلط تو نہیں کر رہا؟'' حضرت مریمؑ نے جواب دیا ''وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔''

اِس سے آگے بھی مختلف سوال جواب تھے جن کا تعلق میری ذات سے تھا۔ اگر وہ بُرے ہوتے تو آپ کے سامنے بیان کر دیتا۔

بات یہ ہے کہ قرآن پاک غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں لیکن اِس کے انعامات رب تعالیٰ اپنے وعدے کے
مطابق اُنھیں دُنیا میں ہی عطا کر دیتا ہے۔ اُن کے لیے آخرت میں کوئی اجر نہیں۔ ہم تو اللہ کے کرم سے
آپ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ آپ وہ دُعا ضرور پڑھیے۔

سوال: اکثر ذہن میں عزیزوں کی وفات کے بارے میں اُلٹے اُلٹے خیالات آتے رہتے ہیں، اِن سے چھٹکارا کیسے پایا جاسکتا ہے؟

جواب: کچھ چیزیں فطری ہیں۔ آپ ﷺ کے فرمان کا مفہوم ہے کہ فطرت کے خلاف دُعائیں قبول نہیں
ہوتیں۔ اگر میں کہوں کہ یا اللہ! سورج مغرب سے طلوع ہوا کرے تو یہ خلافِ فطرت دُعا ہے جو قبول نہیں ہوگی۔
دعا کے سلسلے میں تین چیزیں ہیں:

1۔ دُعا سُنی جائے ......رب فرماتا ہے میں دُعا سننے والا ہوں۔
2۔ دُعا قبول ہو جائے ......اللہ نے فرمایا میں دُعا قبول کرتا ہوں۔
3۔ دُعا کا پورا ہونا۔

رب تعالیٰ فوری طور پر دعا سُن بھی لیتا ہے، قبول بھی کر لیتا ہے، لیکن وہ دُعا اپنے وقت پر پوری ہوتی ہے۔
رب کا اپنا ایک نظام ہے جس پر وہ کائنات چلا رہا ہے۔ یہ نظامِ کائنات بڑا Organised ہے جس طرح
آرکسٹرا میں ہر ساز اپنے وقت پر بج رہا ہوتا ہے، ایک وقت میں تمام ساز نہیں بجتے کیونکہ ساز ترتیب سے بجتے
ہیں تو سُر پیدا ہوتا ہے، اِسی طرح رب کی کائنات میں بھی ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ دعا سُنی بھی جاتی ہے،
قبول بھی ہوتی ہے لیکن پوری تب ہوتی ہے جب رب کے نظامِ کائنات میں Fit ہو رہی ہوتی ہے۔

1990ء میں کسی فنکشن میں چیف جسٹس سے ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے ''مجھے پوتے کی بڑی خواہش
ہے۔'' میرے پاس دماغ ہے نہیں، میرے منہ میں جو آیا کہہ دیا ''رب تعالیٰ آپ کو ایک ہی پوتا عطا فرمائے گا
جو آپ کے بیٹے امجد کے ہاں ہوگا۔'' کہنے لگے ''بڑا بیٹا؟'' میں نے کہا ''اُن کے ہاں نہیں ہوگا۔'' خوش ہونے
کے ساتھ ساتھ قدرے اداس ہو گئے۔ حالاں کہ انہیں یہ یقین رکھنا چاہیے تھا کہ یہ آوارہ آدمی ہے اس کے جو
منہ میں آیا کہہ دیا۔ کافی سال گزر گئے، چھوٹے بیٹے امجد کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ 2009ء
میں مٹھائی کا ڈبہ لے کر گھر آ گئے ''شاہ صاحب! آپ نے کہا تھا امجد کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ انیس سال بعد کل
اللہ نے اُسے بیٹا دیا ہے۔'' میں نے کہا ''بڑی مہربانی آپ کی۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ اِن انیس سالوں میں آپ
نے مجھے کتنی گالیاں دیں کہ شاہ صاحب بڑے ولی اللہ بنے پھرتے ہیں۔ کہتے تھے اللہ پوتا دے گا، آج تک تو
ایسا ہوا نہیں''۔ یہ بات سن کر وہ ہنسے۔

بات یہ ہے کہ دُعا تو تب ہی قبول ہو گئی تھی لیکن وہ پوری 19 سال بعد ہوئی۔ اِس تمام عرصے میں اُنھوں
نے معلوم نہیں میرے بارے میں کس کس سے کیا کیا کہا۔ لیکن جو کہا صحیح کہا۔ میں بھی سیدھا کیوں نہیں کسی
سے کہتا ''بھائی! میں کون سا نیک آدمی ہوں۔ مجھ سے کیوں دُعا کرا رہے ہو۔'' میرا تو نفس پھلتا پھولتا ہے

جب کوئی بھولا بھٹکا سلام کرنے یا دُعا کرانے آ جائے کہ شاید اُسی کو دیکھ کر دو چار اور آدمی دُعا کرانے کے لیے
آ جائیں۔

بات چلی تھی خیالات سے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان کو مختلف قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں۔
خیالات کا یوں در آنا ہمارے لیے بہت بڑی رحمت ہے کیونکہ ہم بہت سی نا آسودہ خواہشات کو خیالوں میں پورا ہوتا
دیکھ لیتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس خیالی پلاؤ پکانے کی بھی کوئی صورت نہ ہو تو شاید ہماری بے چینی بہت بڑھ جائے۔
خیالات کا آنا ایک فطری عمل ہے، اِس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ صرف ایک کام کر لیں کہ جب اُلٹے
خیالات آئیں تو لاحول پڑھ کر خود کو سمجھائیں کہ میں جس رب کا بندہ ہوں وہ ہمیشہ قائم و دائم رہنے والا ہے۔ رب
کے ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جس خوبصورت طریقے سے پالتا
اور اُن کی حفاظت کرتا ہے، یہ سب اُسی کا حصہ ہے۔ جس طرح اُس نے موت کو زندگی پر مامور کیا، یہ سب اُسی کا
حصہ ہے۔ موت ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ جو چیز واقع ہو کر رہے گی اُس سے گھبرانا کیا......!
اِس لیے فقیر لوگ نہ صرف موت سے خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ وہ موت کا انتظار کرتے ہیں کہ میری اپنے
دوست سے ملاقات ہو جائے۔

نیک بندے ہر وقت اپنے رب سے ملاقات کے لیے بے تاب اور منتظر رہتے ہیں اور مجھ جیسا انسان ہر
وقت خوف زدہ رہتا ہے کہ مجھ سے دُنیا کی رنگینیاں نہ چھن جائیں۔ اس لیے فقیر اِس دُنیا کو دل میں بساتا نہیں
اور اُس کی رنگینیوں میں کھوتا نہیں۔ وہ دُنیا میں رہتا ہے لیکن موت سے پیار کرتا ہے۔

آپ کو جب بھی اُلٹے اُلٹے خیالات آئیں، پریشان نہ ہوں لاحول پڑھیں اور خود سے کہیں کہ اِتنے
مہربان رب کے ہوتے ہوئے مجھے کاہے کا غم!

سوال: یوڈی کلونز اور بہت سی پرفیومز جن میں الکوحل ہو، کیا اُن کا استعمال درست ہے؟

جواب: علما کا خیال ہے کہ Alcoholic پرفیوم استعمال نہ کریں۔ Non-alcoholic پرفیومز بھی مارکیٹ
میں دستیاب ہیں۔ آپ وہ استعمال کر لیں۔

اب تو تمام پرفیوم مینوفیکچررز Alcoholic پرفیومز کے ساتھ ساتھ Non-alcoholic پرفیومز بھی
بناتے ہیں۔ جن کی Fragrance بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہم وہ پرفیوم لے لیں جن پر Non-alcoholic
کی Stamp لگی ہو یا عطر اور Water-based پرفیوم لے لیں۔

سوال: حج کے ایام میں تمام مکاتیب فکر کے لوگ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔

جواب: خانہ کعبہ کی اپنی ایک حیثیت ہے، ہم اپنے محلے کی مسجد کو خانہ کعبہ پر محمول نہیں کر سکتے۔ میرے پاس علم
نہیں ہے، میں ایک بے کار شخص ہوں، میں دیانت داری سے عرض کر رہا ہوں کہ مجھے آج تک یہ پتا نہیں چلا
کہ اسلام میں کوئی ایسا School of thought بھی ہے جس کا ہم عام طور پر ذکر کرتے ہیں۔
میرے نزدیک تو اسلام وہ ہے جو قرآن پاک میں بیان ہوا اور جس کا عملی نمونہ آپ ﷺ نے پیش کیا۔

میں تو جب سفر میں ہوتا ہوں تو جو مسجد راستے میں آتی ہے اُس میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی خیال نہیں آیا کہ یہ کس School of thought کی مسجد ہے۔

کوئی ہاتھ چھوڑ کر نماز ادا کر رہا ہے، تو یہ بھی سنت طریقہ ہے۔ کوئی سینہ کے قریب ہاتھ باندھتا ہے تو یہ بھی سنت ہے۔ کوئی ناف پر ہاتھ باندھتا ہے تو یہ بھی سنت ہے۔ کوئی بلند آواز میں ''آمین'' کہتا ہے تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے زور سے بھی ''آمین'' فرمایا۔ البتہ ایک احتیاط ضروری ہے کہ جب امام صاحب قرأت کر رہے ہوں تو آمین Differently کہہ دیں تاکہ ایسا نہ لگے کہ امام صاحب نے جو سورۃ تلاوت فرمائی ہے ''آمین'' اُس کا حصہ ہے۔

باقی کوئی دل میں آمین کہے یا بلند آواز میں، سب درست ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے بہت سے مواقع پر ایسا فرمایا۔

میرا علم اسلام کے بارے میں یہیں آ کر ختم ہو جاتا ہے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور آپ ﷺ نے عملی زندگی کس طرح گزاری۔ مجھے تو بس یہیں تک علم ہے اس لیے میں کچھ زیادہ نہیں کہہ پاؤں گا۔

آپ سے بھی یہی گزارش ہے۔ ہم قرآن پاک اور آپ ﷺ کی سنت کی پیروی کر لیں تو بخش دیے جائیں گے اور ہماری نجات ہو جائے گی۔

سوال: آج کا انسان جگہ جگہ سکون کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: انسان جسم ورُوح کا مجموعہ ہے۔ جسم ورُوح کی طرح اِس کے اندر دو بہت اہم لطائف بھی ہیں:

1۔ قلب

2۔ نفس

جب ہم نفس کی ماننے لگتے ہیں تو ہمارا قلب یا ضمیر ہمیں جینے نہیں دیتا۔ ہمیں سوئی چبھوتا رہتا ہے کہ یہ صحیح راستہ نہیں ہے۔ جب کسی شخص کے اندر دو رُخ پر ہوائیں بیک وقت چلیں گی تو اُس کے کپڑے بھی اُڑیں گے اور اُن ہواؤں سے آوازیں بھی پیدا ہوں گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہوائی جہاز لینڈ کرتا ہے تو لینڈ کرنے کے آدھ منٹ تک اُس کے انجن بہت شور کرنے لگتے ہیں۔ آدھ منٹ بعد خاموش ہو جاتے ہیں۔

انجن کا اُصول یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے سے ہوا کو Suck کرتا ہے اور Tail سے ہوا Compress ہو کر بڑے پریشر سے باہر نکل جاتی ہے جسے Thurst کہتے ہیں۔ لیکن جب جہاز لینڈ کر رہا ہوتا ہے تو 150، 160 یا 180 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتے ہوئے رن وے کو Touch کر رہا ہوتا ہے۔ اگر اِس تیز رفتاری پر بریک Directly اپلائی کر دی جائے تو Breaks اِتنی Heat up ہو جائیں گی کہ آگ لگ جائے گی۔ اِس لیے ہم جہاز کو روکنے کے لیے انجن سے مدد لیتے ہیں اور انجن کے اُصول (منہ سے ہوا لینا اور Tail سے Compress کر کے نکالنا) کو Reverse thurst دے دیتے ہیں، یوں ہوا Tail سے نکلنے کے بجائے

سامنے سے نکلنے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاز رُکنے لگتا ہے اور اُس کی سپیڈ بھی ٹوٹ جاتی ہے لیکن شور بے تحاشا پیدا ہوتا ہے۔

جب انسان کے اندر دو مخالف ہوائیں بیک وقت چلتی ہیں تو انسان ڈگمگانے بھی لگتا ہے اور بے سکونی کی شکل میں اُس کے اندر شور بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

اگر ہم قلب یا ضمیر کی آواز سنتے رہیں تو پُرسکون حالت میں رہتے ہیں۔ آپ نے فقیر کو ہمیشہ پُرسکون اور خوش دیکھا ہوگا حالاں کہ نہ اُس کے پاس پہننے کو پورا کپڑا، نہ کھانے کو مناسب غذا اور نہ رہنے کو پوری چھت لیکن اِس سب کے باوجود فقیر خوش اس لیے رہتا ہے کیوں کہ وہ اپنے ضمیر (قلب) کی آواز پر دھیان دیتا ہے۔ وہ زندگی اِس طرح گزارتا ہے، جس طرح رب نے حکم دیا ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے نہ Elbow کا استعمال کرتا ہے نہ حرص میں مبتلا ہوتا ہے۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ اُس دل میں رب کبھی نہیں رہتا جہاں کینہ، حرص، غرض، لالچ، نفرت، بُغض، حسد، انتقام اور غصہ رہتا ہے۔ اس لیے دل کو ایسی آلائشوں سے پاک کر لینا چاہیے تاکہ وہاں رب رہ سکے اور جہاں رب رہے گا وہاں بہت سکون ہوگا۔

سوال: کیا پاکستان مستقبل میں سعودیہ اور ایران کے درمیان Bridge (پُل) کا کام کر سکے گا؟

جواب: رب تعالیٰ نے ہمیں جو اختیارات عطا فرمائے ہماری زندگی اُنہی کے استعمال کے مطابق گزرتی ہے۔

جب کوئی شخص، کنبہ، قوم یا ملک حرص و لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں تو بے وقار ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا تب ہوتا ہے جب وہ اپنے وسائل سے بڑھ کر زندگی گزارنے لگتے ہیں، چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے لگتے ہیں۔

ہم بھی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے لگے اور اس عادت نے ہمیں بھکاری بنا دیا۔ ہمیں جب بھی کوئی ملک کچھ دیتا ہے تو اِس میں اُس کی اپنی غرض پوشیدہ ہوتی ہے اور وہ اِس امداد کا معاوضہ ہم سے وصول کرتا ہے۔

دو ملکوں کے درمیان Bridge کا کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم باوقار ہو جائیں اور باوقار ہم تب ہوں گے جب ہم اُوپر والا ہاتھ بن جائیں گے کیونکہ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق اُوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ہم اُس وقت باوقار ہو جائیں گے جب ہمارے پاؤں چادر کے مطابق پھیلنے لگیں گے اور ہم اپنے وسائل کے مطابق جینا سیکھ لیں گے۔ اور جب ہم باوقار ہو جائیں گے تو دو ملکوں کے درمیان Bridge بننے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔

آپ تو نوجوان لوگ ہیں، میں زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب پاکستان بڑی شان اور وقار کی علامت تھا۔ یہ ہمارا پاکستان تھا کہ شاہ ایران ہر تیسرے ماہ یہاں آ کر اپنے ملک سے متعلق مشورے ہم سے لے کر جاتا تھا۔ یہی پاکستان تھا کہ جس کے شہریوں کے لیے کئی ملکوں میں داخلے کے لیے ویزے لازمی نہ تھے۔ ہم ایران اور ترکی ویزے کے بغیر بھی جا سکتے تھے۔

دُنیا کے اٹھانوے فی صد ملکوں میں ہمیں ویزا On landing مل جاتا تھا۔ ایئر پورٹ کے امیگریشن

ڈیسک پر پاسپورٹ پیش کرتے تو اُس پر Stamp لگا دی جاتی۔ یہی پاکستان تھا جس کے نام سے ہم نے انڈیا کو لرزتے دیکھا۔ میں نہ تو کوئی جذباتی بات کر رہا ہوں اور نہ ہی مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے۔ ایسا وقت اِس ملک پر آیا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ وہ زمانہ بیت گیا۔ ہم نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیا اور یوں اِس حال کو آ پہنچے۔

دُعا فرمایئے کہ ہم اقوامِ عالم کی نظر میں دوبارہ باوقار ہو جائیں پھر ہم ضرور انشاء اللہ Bridge کا کام کریں گے۔

حصولِ علم کی اِبتدا

ہم اکثر علم حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن کنفیوژن یہ ہوتی ہے کہ کون سا علم حاصل کیا جائے۔ رب تعالیٰ اور آپ ﷺ نے جس علم کو حاصل کرنے کی تلقین کی اور جس علم کا حصول ہر مرد و عورت پر فرض کیا گیا اُس علم میں Differentiation نہیں ہے کہ یہ دینی ہے یا دُنیاوی علم۔

دراصل ہر وہ علم جس سے انسان کو فائدہ ہو وہ صحیح علم اور علم نافع ہے۔

ہم عموماً علم کو حصولِ روزگار کا ذریعہ سمجھتے ہیں حالاں کہ علم کا حصولِ روزگار سے کوئی تعلق نہیں۔ علم تو ہمارے اندر Vision پیدا کرتا ہے اور ہمارے Mental horizon (ذہنی اُفق) کو Broad (وسیع) کرتا ہے۔

علم سے ہمیں یہ پہچان آ جاتی ہے کہ کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ علم ہمیں سکھاتا ہے کہ اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے کے بعد ہم اچھے کو Adopt (اختیار) کر لیں اور بُرے کو Drop (چھوڑ) کر دیں۔ یہ علم ہی ہے جس سے انسان میں فہم و فراست اور عقل و تدبر پیدا ہوتا ہے اور جب عقل و تدبر اور فہم و فراست پیدا ہو جائے تو انسان کو اچھے میں سے سب سے زیادہ اچھا پرکھنے کا ہُنر آ جاتا ہے۔ اس میں یہ Urge عقل پیدا کرتی ہے۔

علم رب تعالیٰ نے تخلیق کیا۔ اُسی نے عرش پر سے علم کی نہریں بہا دیں۔ ہم علم کی اُنہی نہروں سے استفادہ کرتے ہیں۔

انسان مکمل نہیں۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ ہم اپنی کم علمی اور کج فہمی کی وجہ سے تھوڑے کو بہت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جہاں ہمیں تھوڑے کو بہت سمجھنا چاہیے وہاں ہم بہت کو تھوڑا جانتے ہیں۔

رُوحانیت میں سخی کی تعریف یہ ہے کہ جب وہ کسی کو کچھ دے تو زیادہ بھی تھوڑا لگے اور جب کسی سے کچھ لے رہا ہو تو تھوڑا بھی زیادہ لگے۔ لیکن ہم اپنی کج فہمی کی وجہ سے تھوڑے کو ہمیشہ زیادہ سمجھتے ہیں۔

Yougoslavian زبان کا ایک Proverb ہے کہ دُنیا کو کسی علم یا عقل والے نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کسی علم سے بے بہرہ یا پاگل شخص نے نقصان پہنچایا۔ دُنیا کو ہمیشہ کم عقل اور کم علم لوگوں سے نقصان پہنچا۔

جہالت خوف ناک چیز ہے لیکن کم علمی اس سے کہیں زیادہ خوف ناک ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوف ناک بات یہ ہے کہ انسان کے پاس علم کم ہو لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو انتہائی قابل سمجھے۔

سب سے زیادہ علم رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ رب نے آپ ﷺ کو علم سے پوری طرح نوازا۔ رب نے آپ ﷺ کو رُموز و اسرارِ کائنات تک عطا فرما دیے۔

حروفِ مقطعات کیا ہیں......؟ یہ کائنات کے اسرار کے رُموز ہیں جو آپ ﷺ کو عطا کر دیے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو علم کا شہر اور حضرت علیؓ کو اِس شہر کا دروازہ کہا۔

ایک روز میں ایک سوال پڑھ رہا تھا جو لوگوں کے سامنے یوں پیش کیا گیا۔ سترہ اُونٹوں کو تین آدمیوں میں اِس طرح تقسیم کریں کہ اُن میں سے ایک آدمی کو پچاس فی صد اُونٹ، دوسرے کو ایک تہائی اور تیسرے کو 1/9th اُونٹ ملیں۔

اِس طرح 17 اُونٹوں کی تقسیم کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ یہ معاملہ حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کریں۔ جب معاملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے پیش ہوا تو اُنھوں نے اپنے غلام قنبر سے فرمایا کہ میرا اُونٹ ان سترہ اُونٹوں میں شامل کر دو۔ یوں اٹھارہ اُونٹ ہو گئے۔ اس کا پچاس فی صد یعنی نو اُونٹ ایک آدمی کے حوالے کر دیے۔ جس آدمی کا ایک تہائی حصہ تھا اُسے چھ اُونٹ دے دیئے اور جس کا 1/9th حصہ تھا اُسے دو اُونٹ دے دیے اور اپنا اُونٹ واپس اصطبل بھیج دیا۔

یہ علم ہے جو انسان کو عقل کے اِس مقام پر لے جاتا ہے کہ انسان ناممکن گتھیاں بھی سلجھانے لگتا ہے لیکن اِس علم کے سلجھانے کے لیے دو بنیادی Prerequisites ہیں۔

1۔ ہر نئی چیز کو شروع کرنے سے پہلے خود کو مٹانا پڑتا ہے۔ جیسے اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے سابقہ مذہب اور عقائد کی نفی کرتا ہے "لا" کہہ کر۔

جہاں کسی بات پر Major emphasis دینا ہو اُس بات کی اِبتدا بھی نفی سے ہوتی ہے، وہاں اپنی نفی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مسلمان ہونے سے پہلے کہیں انسان دیوتاؤں کو پوجتا ہے، کہیں "تثلیث" کا قائل ہوتا ہے، تو کہیں مظاہر قدرت کو خدا مانتا ہے۔ لیکن جب وہ کلمہ پڑھتا ہے تو "لا" سے اُن سب عقائد کی نفی کرتا ہے۔

جب انسان علم حاصل کرنے لگتا ہے تو اُس کی زندگی میں یہ بہت Major milestone اور بہت بڑا Turning point ہوتا ہے۔ حصولِ علم کی اِس راہ کی اِبتدا بھی ہمیں نفی سے کرنا پڑتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو جو کچھ بھی سمجھتے ہیں وہ سمجھنا چھوڑ دیں اور خود کو باور کرا دیں کہ ہمیں کچھ نہیں آتا۔ آپ جس شخص کے پاس علم سیکھنے کے لیے جا کر بیٹھتے ہیں وہی سب کچھ ہے، بشرطیکہ وہ مجھ جیسا نہ ہو۔ جب ہم اُس صاحبِ علم کو Superior مان لیں گے تو اُس کی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کرنے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ رُوحانیت میں یہ بات تمثیلاً کہی جاتی ہے کہ مرشد کو رب کا درجہ دینا پڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح ہم رب کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں، اُسی طرح ہم مرشد کی بات پر بھی بے چون و چرا عمل کر لیں۔

جب ہم مرشد کے پاس بیعت ہو جاتے ہیں تو ہمیں "ک" سے شروع ہونے والے الفاظ "کیوں، کب، کیا، کیسے، کہاں" اپنے لغت سے نکال دینے پڑتے ہیں۔

جب ہم سیکھ لیتے ہیں کہ اُستاد کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ As it is قبول کر لیں، تو ہم علم سیکھنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔

2۔ دوسری Prerequisite یہ ہے کہ میں نے اپنے اندر جو "مَیں اور اَنا" کا بُت پال رکھا ہے، جس کی میں پرستش کرتا ہوں، اُسے توڑنا پڑتا ہے۔

ہم میں سے ہر آدمی اِن بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنی ذات پر تنقید برداشت نہیں کرتا۔

جب میں 8th کلاس میں پڑھتا تھا تو اُستاد نے بتایا کہ ہم میں سے ہر انسان خوشامد کا خوگر ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کی خوشامد کی جائے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں خوشامد برداشت نہیں کر سکتا وہ اِس دعویٰ کے باوجود خوشامد کرا رہا ہوتا ہے۔ اِس کی مثال اُنھوں نے یہ دی کہ اگر کوئی Boss پہلے ہی دن یہ باور کرا دے کہ میں خوشامد پسند نہیں کرتا تو اُس کا ایک ماتحت اگلے ہی دن اُس کے پاس آ کر کہتا ہے، "صاحب! واہ میں نے دُنیا میں پہلا آدمی دیکھا ہے جو خوشامد پسند نہیں کرتا۔" Boss یہ سن کر اندر ہی اندر خوش ہوتا ہے۔ یہ بھی دراصل خوشامد ہی ہے۔ لیکن ہمارے اندر خوشامد، Status اور علم کا بت کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔

ایک اِنتہائی خوف ناک تکبر ہم اپنے اندر پالتے ہیں جو کثرتِ اولاد، Status، علم اور ہر طرح کے تکبر سے بھی زیادہ خوف ناک ہے اور وہ ہے عاجزی کا تکبر۔ ایسا انسان کسی کو اپنی طرف اُنگلی نہیں اُٹھانے دیتا۔

ہمیں علم کی راہ پر چڑھنے سے پہلے یہ تمام بت اپنے اندر سے اُکھاڑ پھینکنے ہوتے ہیں۔ اِن تمام Prerequisites کو پورا کیے بغیر ہم علم نہیں سیکھ سکتے۔

ہم رُوحانی شخصیات کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ مجھے ولی اللہ بنا دیجیے۔ صاحبِ علم ایک طویل عرصہ اِس پر محنت کرتا ہے اور پھر ہاتھ کھڑے کر دیتا ہے کہ تم ولی اللہ نہیں بن سکتے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ جواب ملتا ہے "اپنے اندر سے انا ختم کر کے آؤ...... غصہ ختم کر دو، اپنے اندر چھپی طمع و لالچ سے جان چھڑاؤ...... تمھارے اندر ہر وقت انتقام کا جذبہ پنپتا رہتا ہے کہ فلاں شخص نے کئی سال پہلے مجھے گھور کر دیکھا تھا، میں اُسے نہیں چھوڑوں گا۔ تم کسی کو اپنے سے آگے جاتا دیکھ نہیں سکتے۔ اِس حسد کو ختم کر دو۔" ہم کہتے ہیں۔ "جناب! ہم میں تو ان خامیوں میں سے کوئی بھی خامی نہیں۔" وہ ولی اللہ کہتے ہیں "یہ سمجھنا ہی تمھاری خامی ہے۔ اور یہی تکبر ہے جس میں تم پھنسے ہوئے ہو۔"

اگر ہمیں علم کی راہ پر چڑھنا ہے تو پھر دل سے اِن سب آلائشوں کو نکال کر دل کو دھونا پڑے گا، دل کو صاف کرنا پڑے گا۔ تب دل اِتنا پاک ہو جائے گا کہ رب اُس میں رہنے لگے گا۔ رب بہت پاک ہے۔ رب وہاں نہیں رہتا جہاں لالچ، طمع، نفرت، حسد، انتقام، غصے اور حرص جیسی بدبودار چیزیں ہوں۔ رب تو Neat and clean مقام پر رہتا ہے۔

اگر ہم اپنے گھر بہت اعلیٰ مہمان کو لا کر بٹھانا چاہیں تو پہلے ہمیں اپنے گھر کو پاک و صاف کر لینا چاہیے۔ یہ ابتدا ہے۔ ابھی تو ہم چلے ہی نہیں، پہلا قدم بھی نہیں اُٹھایا۔

اِس راہ کی طرف ہمارا پہلا قدم تب اُٹھے گا جب ہمارے مرشد ہمیں کہہ دیں میں تمھیں آج رُوحانیت کا پہلا سبق دے رہا ہوں۔ آج کے بعد تمھیں کوئی شخص کتنا ہی بُرا بھلا کہہ دے، بھری محفل میں تمھاری تضحیک و تحقیر کرے، تمھاری جڑیں کاٹے، کتنا ہی بڑا نقصان پہنچائے، تم نے اُس کے خلاف سوئی برابر میل بھی دل میں نہیں آنے دینا۔

یہ پہلا سبق ہو گا۔ جب آدمی اِس سبق کو Qualify کر لے (اور یہ پریکٹس سے ہو جاتا ہے) تو دوسرا سبق سکھایا جاتا ہے کہ آج کے بعد تمھاری اپنی ذات اہم نہیں بلکہ دوسرے اہم ہیں۔ تم نے اپنی خاطر نہیں بلکہ دوسروں کی خاطر زندہ رہنا ہے۔ یہ درحقیقت میں اُس حدیث کا مفہوم اپنی زبان و الفاظ میں بیان کر رہا ہوں کہ لوگوں میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لیے زیادہ نفع دینے والا ہو۔

یہ قدم اُٹھانے کے بعد انسان میں یہ تبدیلی آتی ہے کہ اُس میں عاجزی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ میں سب سے کم تر اور چھوٹا ہوں۔ جب انسان میں عاجزی کا یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے تو وہ زیادہ تیزی سے علم سیکھتا ہے۔ پھر علم کا بہاؤ شروع ہو جاتا ہے۔

جہاں انسان خود کو عاجز سمجھنے لگے تو جان لے کہ اگر میں نے یہ راہ پکڑے رکھی تو پھر مجھے اللہ کا قرب مل جائے گا اور میں وہ چیزیں سوچ سکوں گا جو دوسروں کے ذہن میں نہیں آتیں۔

یہ مت کہیے کہ میں رُوحانیت کی راہ پر چلنا چاہتا ہوں، مجھے علم دے دیں۔ رُوحانیت کے علم کی درخواست کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو اِس طرح تیار کر کے صاحبِ علم کے پاس جائیں کہ جب سوال کریں تو وہ چھوٹتے ہی ہماری جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دے۔

سوال: آپ کی شدت پسندوں (طالبان) کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: عقل و علم کے خاص مقام تک جب تک انسان نہ پہنچے تو وہ علم انسان کے لیے خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نہ تو اُنھیں فتنہ کہتا ہوں...... نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ اُن سے زیادہ بھٹکا ہوا تو میں خود ہوں۔

یہ ہمارے وہ مسلمان بھائی ہیں جو اسلام کو اُس نظر سے دیکھ رہے ہیں جو اُنھیں سکھایا اور پڑھایا گیا تھا۔ یہ اُن کا نقطۂ نظر ہے۔ میرے مذہب میں یہ ہے کہ ہر انسان آزاد ہے۔ بقول حضرت عمر فاروق ؓ اُنھیں اُن کی ماؤں نے آزاد جنا تھا تمھیں کس نے یہ حق دیا کہ تم اُنھیں غلام بناؤ۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رائے قائم کر سکے اور برملا اُس رائے کا اظہار کر سکے لیکن اِس میں یہ احتیاط لازم ہے کہ اِس سے کسی کی تضحیک و تحقیر نہ ہو، کسی کا تمسخر نہ اُڑے اور کسی کو ذہنی و جسمانی نقصان نہ پہنچے۔

سوال: پرائز بانڈ یا بیمہ پالیسی پر آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: میں فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔ البتہ میری ذاتی رائے کے مطابق یہ دونوں جائز نہیں ہیں۔

سوال: ہم نماز میں دُعا کی صورت اللہ سے سوال کر رہے ہوتے ہیں۔ مانگنا کیوں ضروری ہے؟

جواب: ہم نماز میں رب کی حمد و ثنا اور شکر گزاری کے بعد دُعا کر رہے ہوتے ہیں۔ دُعا پڑھنے کے بعد ہم آپ ﷺ کے حضور شکر گزاری کا اِظہار درود شریف پڑھ کر کرتے ہیں۔

عجز سیکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم رب سے مانگتے رہیں۔ رب کی صفتِ ربوبیت ہمارے مانگنے کی محتاج نہیں۔ رب تو اِس قدر دیالو (Generous) ہے کہ کوئی مانگے یا نہ مانگے، رب عطا کرتا رہتا ہے۔ رب سے مانگنا اور اُس کے سامنے سر جھکانا اِس لیے ضروری ہے کہ کہیں ہم بھٹک نہ جائیں...... ہمیں یہ احساس رہے کہ ہم رب کے بندے ہیں۔ ہمیں اُسی کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھنا چاہیے۔ ہمیں یہ یقین ہو کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے سب رب ہی کا عطا کردہ ہے۔

مانگنا تو محض ایک حجت ہے ورنہ رب ہمارے سوال کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ تو وقت سے پہلے ہماری ضروریات پوری کر دیتا ہے۔ مانگنا اِس لیے ضروری ہے تا کہ ہمارے اندر عجز رہے۔ بندہ ہونے کا احساس پختہ ہوتا رہے کہ وہ میرا آقا اور میں اُس کا غلام ہوں۔

سوال: کچھ مجھ جیسے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ اعمال سے بالکل خالی ہیں لیکن پھر بھی وہ رب کے قرب کے منتظر رہتے ہیں، اُس کے فراق کی آگ میں تڑپتے رہتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو رب مل جاتا ہے؟

جواب: رب کا جود و کرم بے حد و بے حساب ہے۔ وہ انتظار نہیں کرتا کہ بندہ مانگے تو وہ تب ہی اُسے دے۔ وہ مانگے بغیر دیتا ہے...... وہ مالکِ کُل ہے...... اپنی مرضی کا مالک ہے۔ کسی کو جواب دہ نہیں۔ اُس کی قدرت قواعد و ضوابط کی پابند نہیں...... نہ اُس کا Audit ہوتا ہے کہ یہ کیوں دیا اور اِس کو کیوں دیا...... رب بخشنے پر آتا ہے تو اُس طوائف کو بھی بخش دیتا ہے جس نے ایک پیاسے کُتے کو پانی پلایا تھا۔ پکڑنے پر آتا ہے تو اُس ولی اللہ سے بھی بدلہ لے لیتا ہے جس نے پتے پر بیٹھی چیونٹی کو دریا میں ڈبو دیا تھا۔ لیکن ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ رب کو آنسو بہت عزیز ہیں۔ وہ آنسو جو شرمندگی و ندامت سے بہتے ہیں۔

ایک صاحب خاصے ضعیف العمر تھے۔ ساری عمر کبھی باجماعت نماز قضا نہ کی۔ ایک صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ جب مسجد پہنچے تو امام صاحب سلام پھیر چکے تھے۔ اُن بزرگ نے نماز تو ادا کر لی لیکن سارا دن باجماعت نماز ادا نہ کر سکنے کے ملال میں روتے رہے۔ اگلی صبح فجر کے وقت کسی نے کندھا ہلا کر جگایا۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں تو حیران ہوئے کہ بند کمرے میں یہ شخص کیسے آ گیا؟ وہ شخص حیرت کو بھانپتے ہوئے بولا، "میں شیطان ہوں، میرے لیے بند دروازے اور کواڑ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ میں آپ کو نماز کے لیے جگانے آیا ہوں۔" اُن بزرگ نے کہا "تمھاری ڈیوٹی تو لوگوں کو نیک راہ سے بھٹکانا اور گناہ کے راستے پر چلانا ہے۔" شیطان کہنے لگا "کل آپ باجماعت نماز ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے دن بھر روتے رہے۔ اللہ کو آپ کا یہ انداز اِتنا پسند آیا کہ اُس نے آپ کے نامۂ اعمال میں باجماعت نماز سے بھی دوگنا ثواب لکھ دیا۔ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ آج بھی آپ زیادہ ثواب کما لیں۔"

رب تعالیٰ اپنے بندے کے آنسوؤں کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ اگر آپ کے دل میں اللہ کے فراق کی آگ جل رہی ہے تو یہ آگ تب جلتی ہے جب انسان رب کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ اگر آپ نے رب کو اپنا محبوب بنا

لیا ہے تو یہ رب کی وضع داری اور حیا کے خلاف ہے کہ وہ آپ کو اپنا پیارا نہ بنائے...... وہ ضرور آپ کو اپنا پیارا بنائے گا، اگر آپ واقعی اُس کے فراق کی آگ میں تڑپ رہے ہیں۔

سوال: دل میں موجود مختلف آلائشوں کو نکالنے میں دشواری ہو تو کیا کریں؟

جواب: بھائی! میرے پاس تو اس کے لیے کوئی وظیفہ نہیں۔ جن چیزوں کا اجر زیادہ ہے اُن پر محنت بھی زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ آپ کا نفس جو بھی کہے آپ اُس سے 180 ڈگری Opposite عمل کریں۔ یہ آلائشیں خود بخود دور ہونا شروع ہو جائیں گی۔

پاکیزہ سوچ کے ثمرات

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں ایک مرتبہ لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لیے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اُن میں شامل تھے۔ سبھی چاند تلاش کر رہے تھے۔ اچانک ایک صاحب ایک سمت اشارہ کر کے بولے ''وہ دیکھیے، عید کا چاند دکھائی دے رہا ہے۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے اُس سمت غور سے دیکھا لیکن چاند کہیں نظر نہ آیا۔ وہ معاملے کو سمجھ گئے۔ اُن صاحب سے فرمایا، ''جا کر اپنی آنکھیں دھو کر آؤ۔'' جب وہ صاحب اپنی آنکھیں دھو کر آئے تو پوچھا ''اب بتاؤ چاند کہاں ہے؟'' اُنھوں نے غور سے دیکھا اور کہا ''واقعی چاند کہیں نہیں ہے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ چاند پہلے بھی وہاں نہیں تھا۔ تمھاری پلکوں سے ایک بال ٹوٹ کر آنکھ میں چلا گیا تھا جس کی وجہ سے تمھیں آسمان پر چاند کا گمان ہوا۔ لیکن جب تم نے آنکھیں دھو لیں تو دوسروں کی طرح تمھیں بھی چاند دکھائی نہیں دیا۔

ہم لوگ نیک کام کرتے رہتے ہیں، مثبت سوچ رکھتے ہیں، حتی الوسع حقوق اللہ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی احوال ہم پر نہیں کھلتے۔ ہماری باطنی آنکھ وا نہیں ہوتی۔

جو شخص مثبت سوچ رکھتا ہے، Intellectually honest ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد Humanly possible حد تک ادا کرتا ہے۔ پھر بھی اگر اُس پر احوال نہیں کھلتے، باطنی آنکھ وا نہیں ہوتی تو پھر اُس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اُن صاحب کی طرح اُس شخص کی آنکھ میں دُنیاوی خواہشات اور تمناؤں کا بال آ گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ کچھ دیکھ نہیں پا رہا۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اُس بال کو ڈھونڈ لیں تا کہ ہماری باطنی آنکھ کھل جائے اور ہم پر احوال عیاں ہو جائیں۔

شیطان ہمارے دلوں میں خیال ڈال دیتا ہے کہ تمھارے اندر دُنیاوی خواہشات اور آرزوئیں ختم ہو گئی ہیں۔ یہ آرزوئیں درحقیقت ختم نہیں ہوتیں بلکہ کسی نہ کسی رنگ میں باقی رہتی ہیں اور ہمارا نفس اُن کے حصول کے لیے ہمیں اُبھارتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس دل میں رب اور رب تعالیٰ کے خیال کو رہنا چاہیے تھا وہاں دُنیاوی خواہشات پلنے لگتی ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر احوال کھل جائیں، ہماری باطنی آنکھ وا ہو جائے، رب ہم پر مہربانی فرمادے اور ہمیں اسرارِ قدرت کے اندر ایک حد تک جھانکنے کی اجازت دے دے تو پھر ہمیں دُنیا کی خواہشات کو دل سے نکال پھینکنا ہوگا۔

پہلے ہم دل کو دُنیا سے خالی کر دیں...... نہ کوئی مقام، نہ کوئی عہدہ، نہ دولت، نہ اقتدار، نہ اختیار...... ہمارے دل میں کوئی ایسی تمنا نہ رہے۔ ہمیں ہر تمنا سے باہر نکلنا ہوگا۔

حتیٰ کہ اگر ہمارے دل میں رُوحانی مقامات حاصل کرنے کی خواہش پلنے لگ گئی تب بھی ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر ہمارے دل میں مشاہدات کی آرزو جنم لینے لگی تو بھی کچھ نہ ملے گا۔ ہمیں دُنیاوی و رُوحانی تمام خواہشات سے باہر نکلنا ہوگا۔

رب نے اولاد کو آزمائش کہا لیکن راہ سلوک پر چلتے ہوئے ہمیں اپنی اولاد تک کے بارے میں خیالات بھی رب تعالیٰ کے حوالے کر دینا پڑتے ہیں۔ ہمیں رب کے حضور گڑگڑانا چاہیے اور دُعا کرنی چاہیے لیکن کسی بھی ایسی خواہش کو زندگی کا مقصد نہیں بنانا چاہیے کہ ہماری اولاد کی شادی ہو جائے، ترقی ہو جائے، اُن کا یہ کام وہ کام ہو جائے۔ بس اللہ کے حضور اِس یقین کے ساتھ دُعا کر دیں کہ میں نے اپنے رب کے حضور معاملہ پیش کر دیا۔ رب دُعائیں سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ حاجات پوری کرنے والا ہے۔ اگر میرے حق میں اور میری اولاد کے حق میں یہ بہتر ہے تو کام ہو جائے گا اور اگر بہتر نہیں ہے تو رب اِس خواہش سے مجھے بچالے گا۔

اِس طرزِ عمل سے نہ صرف ہمیں رُوحانی ترقی حاصل ہوتی ہے بلکہ اللہ کی قربت اور دوستی بھی عطا ہو جاتی ہے اور ایسا مقام حاصل ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اُس پر رشک کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ نماز کے دوران یک سوئی قائم رکھنے کے لیے داہنے پاؤں کے انگوٹھے پر دورانِ قیام نظر رکھیں، لیکن مجھے کوشش کے باوجود اپنے پاؤں کا انگوٹھا نظر نہیں آتا۔

جواب: یہ عالم الاسباب ہے۔ یہاں ہر چیز کا ایک سبب ہے۔ یہ Cause and effect کی دُنیا ہے۔ اسباب پیدا کرنے والا رب تعالیٰ ہے لیکن کوشش ہم پر فرض ہے۔ اگر میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھے داہنے پاؤں کا انگوٹھا نظر آ جائے اور وہ دکھائی نہیں دیتا تو مجھے کوشش جاری رکھنی چاہیے، لیکن خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ اِس میں رب کی کوئی مصلحت ہے کہ کوشش کے باوجود انگوٹھا نظر نہیں آ رہا۔

فقیر کا طریقہ یہی ہے، وہ کوشش کرتا ہے۔ اگر اُس کا نتیجہ حسبِ منشا آ جائے تو رب کا شکر ادا کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے جو چاہا اور جس کے لیے کوشش کی تُو نے مجھے وہ عطا فرمایا۔ لیکن اگر کوشش کا نتیجہ حسبِ منشا نہیں نکلتا تو وہ مایوس ہونے کے بجائے رب کا یہ سوچ کر شکر ادا کرتا ہے کہ یا باری تعالیٰ! میں نے جس چیز کے لیے کوشش کی، وہ یقیناً میرے لیے بہتر نہیں تھی اِس لیے تو نے مجھے عطا نہ کر کے نقصان سے بچالیا۔ یہ روّیہ اپنانے کے بعد دل سے ملال نکل جاتا ہے اور ذہن پر بوجھ نہیں رہتا۔

آپ پاؤں کا انگوٹھا دیکھنے کی کوشش جاری رکھیے لیکن اگر وہ اِس کے باوجود نظر نہیں آتا تو سمجھ لیجیے کہ رب یہی چاہتا ہے۔ اِس سے آپ کی طبیعت میں پیدا ہونے والا ملال ختم ہو جائے گا۔

سوال: اگر کسی ولی اللہ کے پاس اختیار ہو کہ وہ محض دوسروں پر ایک نظر ڈال کر اُنھیں ولایت کے مقام پر پہنچا سکتا ہے اور اُن کی قلبی کیفیات کو تبدیل کر سکتا ہے تو مخلوقِ خدا کی محبت اُس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والوں کو ایک نگاہ سے ولی اللہ کر دے، اُن کے قلوب کو تبدیل کر دے۔

جواب: بھائی! اِس میں ایک بنیادی نکتہ ہے۔ اگر کسی ولی اللہ کے پاس یہ اختیار ہو کہ وہ ایک نظر ڈال کر قلب کو بدل ڈالے تو وہ سب سے پہلے اپنے قلب پر نظر ڈال کر اُسے تبدیل کرے گا۔ یہ سب معاملات رب کے اختیار میں ہیں، ہمیں اپنے عقائد کو تھوڑا درست کرنا ہوگا۔ ہمیں اِس Fantasy اور افسانوی باتوں سے باہر نکلنا ہوگا جو ہم نے مختلف کتب پڑھ کر اپنے اندر اُتاری ہیں۔

میں یقین سے عرض کر رہا ہوں کہ کوئی بھی ولی اللہ مجھ جیسے گناہ گار سے بھی زیادہ رب تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے۔ گناہ گار تو اپنی لاعلمی میں بعض اوقات کچھ ایسی بات کہہ دیتا ہے جو زیادہ مناسب نہیں ہوتی اور رب بھی اُسے ٹال دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ گناہ گار ہے، لاعلمی میں ایسا کہہ رہا ہے۔ لیکن ولی اللہ چونکہ صاحبِ علم بھی ہوتا ہے، زیادہ نہیں تو بھی کچھ نہ کچھ رب کی عظمت کی ایک ہلکی سی جھلک جانتا ہے۔ اِس لیے وہ رب کے حضور بہت محتاط ہو کر درخواست کرتا ہے۔ چاہے اُسے حکومت کا لالچ دیں یا آگ میں ڈال دیں، وہ کوئی ایسی بات کرنے کو تیار نہیں ہوتا جہاں وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو رب جب چاہے گا کر دے گا اور جب نہیں چاہے گا نہیں کرے گا۔

ولی اللہ یا صاحبِ علم ہونے کے لیے بہت سی شرائط ہیں۔ ولی اللہ کے پاس رب کا عطا کردہ صرف ایک اختیار ہے۔ رب نے جب اُسے علم عطا کر دیا تو وہ علم اُس ولی اللہ کی ملکیت ہے وہ جس کو چاہے وہ علم دے دے لیکن وہ علم کس کام کا......؟ ایسا علم وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ انسان واپس صفر پر چلا جائے گا۔ اگر کوئی ولی اللہ ایسا علم دے بھی تو آپ لینے سے معذرت کر لیں کہ میں خود یہ علم کمانا چاہتا ہوں۔ آپ اِس کے حصول کے لیے میری راہنمائی فرمادیں۔

جب انسان محنت سے علم کمائے گا تو وہ دیرپا ہوگا لیکن ایسا علم حاصل ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ماں کی گود سے لے کر قبر تک علم کے حصول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اِس میں کہیں کوئی وقفہ نہیں۔

جہاں مرشد نے محنت کر کے آپ کی اُنگلی پکڑ کے آپ کو پرائمری سکول کی کلاس ون میں داخل کرا دیا وہاں آپ مرشد سے اُسی طرح Guidance لے لیں جس طرح آپ Textbook سے لیتے ہیں۔ جب ہم Textbook میں لکھی مختلف Theories کو رٹنے کے بجائے سمجھ لیتے ہیں تو وہ Theories ہمیں لمبے عرصے تک یاد رہتی ہیں جب کہ رٹی ہوئی چیزیں بہت جلد بھول جاتی ہیں۔ جب ہم ان Theories کو سمجھ کر Apply کرنے لگتے ہیں تو ہمارا شمار Outstanding سٹوڈنٹس میں ہونے لگتا ہے۔ اِس لیے راہِ سلوک میں اگر مرشد خوش ہو کر کچھ عطا کرنا بھی چاہے تو آپ کہیں جناب! بڑی مہربانی، میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے یہ علم مجھے عطا کرنا چاہا لیکن میری خواہش ہے کہ آپ میری اُنگلی پکڑ لیں اور مجھے گائیڈ کرتے جائیں۔ علم حاصل کرنے کے لیے محنت میں خود کر لوں گا۔

ایسا علم حاصل کرنے میں وقت تو طویل لگے گا لیکن انسان اِس راہ پر چلتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ افسانوی باتیں ہیں کہ کوئی ڈاکو یا چور کسی صاحبِ علم یا فقیر کے پاس گیا، فقیر نے اُس پر ایک نگاہ ڈالی تو وہ ڈاکو یا چور ولی اللہ ہو گیا۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی چور یا ڈاکو فقیر کے پاس جا کر بیٹھتا ہے تو اُس کا قلب تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُسے ڈاکا زنی اور چوری سے نفرت ہو جاتی ہے اور یوں وہ ڈاکے چھوڑ کر رب کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ رغبت By choice ہوتی ہے اِس لیے اِس میں اخلاص بھی ہوتا ہے اور شدت بھی۔ وہ نیکی کی راہ پر تیزی سے چلتا ہے اور تھوڑے عرصے میں ولی اللہ ہو جاتا ہے۔

سوال: ہم حقوق العباد کی نسبت حقوق اللہ کی ادائیگی پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ کیا حقوق العباد کی ادائیگی سے بھی رُوحانیت مل جاتی ہے؟

جواب: آپ آسانی کے لیے یوں سمجھ لیجیے کہ ولایت سے مراد ہے اللہ کی دوستی۔ ولی اللہ کا مطلب ہے اللہ کا دوست۔ رب اُن بندوں کو اپنا دوست رکھتا ہے جو اُس کی بندگی و اطاعت کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اطاعت Selective نہیں ہوتی بلکہ یہ Total submission کا نام ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ کے Set کیے ہوئے Pattern پر پوری طرحِ عمل پیرا ہوتے ہیں تو یہ اطاعت اور بندگی ہے۔

رب تعالیٰ نے ہم پر صرف حقوق اللہ ہی نہیں بلکہ حقوق العباد بھی فرض کیے ہیں۔ حقوق اللہ کی قضا ہے لیکن حقوق العباد کی قضا نہیں...... حقوق العباد عین اُسی وقت ادا کرنا پڑتے ہیں جب وہ Due ہوں۔

اپنے اندر Intellectual honesty (ذہنی ایمان داری) اور سوچ کی پاکیزگی پیدا کرنے سے رب کی دوستی ملے گی۔ جب ہماری سوچ Positive ہو جاتی ہے، ہم کسی ایسے کام کا سوچتے بھی نہیں جس سے رب نے منع فرمایا ہے۔ ہم صرف اُس کام کے بارے میں سوچتے ہیں جس کا رب نے حکم دیا ہے تو ہماری سوچ میں پاکیزگی آنے لگتی ہے۔ اگر ہم حقوق اللہ پورے کرتے ہیں اور اِس کے ساتھ ساتھ حقوق العباد Beyond call of duty ادا کرتے ہیں تو ہم رب کے قریب ہونے لگتے ہیں۔

ہم اکثر یہ بات فخر سے دہراتے ہیں کہ میں تو ہمیشہ حق اور انصاف کی بات کرتا ہوں۔ یہ کوئی فخر کی بات نہیں، یہ تو میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کی۔ ہاں اگر میں اِس سے Beyond جا کر انصاف کے بجائے ایثار سے کام لینے لگوں یا ایثار سے بھی ایک قدم آگے جا کر قربانی کا طرزِ عمل اختیار کر لوں تو پھر گویا میں نے حقوق العباد Beyond call of duty ادا کیے۔ اِس کا اجر بہت بڑا ہے۔

جب ہمیں سوچ کی پاکیزگی حاصل ہو جائے اور ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی Beyond call of duty کرنے لگیں تو ہمیں اللہ کی دوستی حاصل ہو جاتی ہے۔ اِن میں سے کوئی ایک چیز اپنا کر اور باقی چھوڑ کر رب کی دوستی حاصل کرنا کارِ محال ہے۔ باقی رب اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ وہ قدرتِ کاملہ رکھتا ہے، جس کو چاہے دوست بنا لے، اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

سوال: (الف) آپ نے ایک بار ایک واقعہ سناتے ہوئے بتایا تھا کہ مرشد صاحب نے مجھے کہا کہ اگر تم بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر آئے اُس مجذوب کی بات مان لیتے تو تم بھی مجذوب ہو جاتے اور اِس کے بعد جس کی طرف دیکھتے وہ بھی مجذوب ہو جاتا۔

(ب) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی سالک کسی مجذوب کے کہنے پر اُس کے لیے دعا کر دے تو سالک کا علم سلب ہو جاتا ہے۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں، اِن کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ خاص باتیں عام لوگوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ اگر آپ Nuclear theory پانچویں کلاس کے طالب علموں کے سامنے بیان کر دیں تو وہ اُس میں سے کچھ نکتے چُن کر بحث شروع کر دیں گے کیونکہ وہ اُس Nuclear theory کو Comprehend کر ہی نہیں پا رہے۔

جب انسان علم کے خاص مقام پر چلا جائے اور اُس پر کیفیات طاری ہو جائیں تو نتیجہ وہی برآمد ہو گا جو میں نے بیان کیا۔ اگر کوئی راہ چلتے پستول تان کر مجھے کہے جو ہے نکال دو اور میں خالی جیبیں اُلٹ دوں تو ہو سکتا ہے جاتے ہوئے وہ مجھے دس روپے کا نوٹ دیتا جائے کہ کھانا کھا لینا۔ اِس کے برعکس اگر وہ گن پوائنٹ پر کسی صاحبِ مال کو روکے گا تو اُسے مال مل جائے گا۔

اگر مجھ جیسے بندے سے کوئی مجذوب کہے کہ آسمان کی طرف دیکھو اور وہاں جو لکھا نظر آئے اُسے پڑھو۔ میں لاکھ پڑھتا رہوں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر مجذوب کسی صاحبِ علم کو ایسا کرنے کو کہے گا اور وہ صاحبِ علم اُس لکھے کو پڑھ لے گا تو اُس پر مجذوب کی سی کیفیات طاری ہو جائیں گی۔ وہ حالتِ جذب میں چلا جائے گا۔ لیکن بنیادی بات یاد رکھیے کہ سالک کے لیے صاحبِ علم ہونا ضروری ہے۔ میری طرح بھوکا ننگا نہ ہو ورنہ مجذوب کچھ رقم دے کر کہے گا، یہ لو روٹی کھا لینا۔ تم تو بہت غریب ہے۔ لیکن اگر کسی مال دار کو مال وہ دے گا تو اُس کے مال میں اضافہ ہو جائے گا۔

بنیادی بات یہی ہے کہ آدمی کے پاس پہلے سے کچھ موجود ہو۔ اگر آپ اس تناظر میں دیکھیں گے تو تضاد دکھائی نہیں دے گا۔ بات Clear ہو جائے گی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور پیدا فرمایا اور وہ نور ایک طویل عرصے تک سیر کرتا رہا۔ سوال یہ ہے کہ وہ نور کہاں سیر کرتا رہا؟

جواب: کسی بھی انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ارواح تخلیق ہوئیں اور اُن روحوں میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رُوح رب کے نور سے تخلیق ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب فضائے بسیط موجود تھی۔ اِس میں فرشتے اور جنات تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِسی فضائے بسیط کی سیر کرتے رہے۔

سوال: اگر کوئی شخص Intellectual honesty کو اپنی منزل بنالے تو وہ اپنے سفر کی شروعات کہاں سے کرے؟

جواب: وہ خود سے عہد کر لے کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ بنیاد فراہم ہونے کے بعد اُس میں Intellectual honesty آتی چلی جائے گی۔

سوال: آپ کبھی کبھی کہتے ہیں کہ انسان کو دُعا کرانے کے لیے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں لیکن میری عقل کے مطابق تو اولیائے کرام سے دُعا کرانا پسندیدہ عمل ہے؟

جواب: میں واضح کردوں کہ دوسروں سے دُعا کرانا سنت ہے۔ دوسروں سے دُعا ضرور کرانی چاہیے لیکن یہ سمجھنا کہ اُس شخص کی دُعا رد نہیں ہوسکتی اور گھنٹوں دُعا کرانے کے لیے انتظار میں بیٹھنا مناسب نہیں۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہم کسی کے پاس دُعا کے لیے کیوں جائیں تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ میں رب کے ساتھ وہ رشتہ قائم کیوں نہ کروں جہاں میرا اُس پر یقین ہو کہ وہ اِتنا مہربان ہے کہ اپنے کسی بندے کو بھی اکیلا اور بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ وہ اپنے کسی پیارے کو اُس مقام پر نہیں لے جاتا کہ اُس کی دُعائیں سننا بند کردے۔

جب میرا رب اِتنا مہربان ہے تو میں جب چاہوں اُس کا دروازہ Knock کروں کہ یا اللہ! میرا یہ کام ہے، تُو کردے۔ اور پھر اگر مجھے کوئی نیک بندہ، کوئی مسلمان بھائی مل جائے تو میں اُسے کہوں، بھائی! میرے لیے دُعا کرنا۔ لیکن اگر مجھے پتا چلے کہ حسن ابدال کی چوٹی پر بیٹھا ایک فقیر دُعا کرتا ہے اور اللہ اُس کی دُعا کو قبول کرلیتا ہے...... میں لاہور میں اپنے سارے کام چھوڑ کر حسن ابدال جاتا ہوں۔ ہزار فٹ بلند پہاڑی پر مشکل سے چڑھتا ہوں اور فقیر سے دُعا کرانے کے لیے گھنٹوں اپنی باری کا انتظار کرتا ہوں۔

بھائی! رب سب کا ہے، آپ جیسے نیک لوگوں کا بھی اور مجھ جیسے گناہ گاروں کا بھی۔ وہ اپنے ہر بندے کی دُعا سنتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نیک لوگوں سے دُعا کے لیے کہنا چاہیے لیکن یہ مت سوچیں کہ اُن کی کہی بات یا دُعا کبھی رد نہیں ہوتی۔

رب مالک ہے اِس کائنات کا، وہ بندہ مالک نہیں۔ اِس کائنات کو بندہ نہیں، وہ رب چلا رہا ہے۔ رب کی Greater scheme of affairs میں جو چیز Fit ہوتی ہے۔ رب اُس کے حوالے سے ہر ایک کی دُعا پوری کر دیتا ہے۔

ذرا سوچیے! کیا آپ کے ایسے بہت سے کام نہیں ہوئے جن کے لیے آپ نے کبھی کسی سے دُعا نہیں کرائی؟ کیا آپ کے کئی ایسے کام ہونے سے رہ نہیں گئے جن کے لیے آپ نے بہت سی دُعائیں کرائیں؟

ہم جب بھی کسی بات کو اُس کے ظاہری الفاظ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو Confuse ہو جاتے ہیں لیکن اگر ہم بات کی رُوح پر نظر رکھیں گے تو پھر اِس کنفیوژن سے بچ جائیں گے۔ دُعا کرانی چاہیے، کیوں کہ دُعا کرانا سنت ہے۔ لیکن دُعا کرنے والوں کو ایسا مقام نہ دیں کہ اُن کی زبان سے نکلا لفظ رد ہی نہیں ہوتا۔ رب اپنی مرضی کا مالک ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ اُس نے کس کی دُعا کب پوری کرنی ہے۔ کون سی دُعا اُس کے لیے

بہتر ہے۔ کون سی دُعا پوری ہونے سے بندے کو نقصان کا احتمال ہے۔ رب ایسی دُعائیں پوری نہیں کرتا بلکہ ایسی دُعاؤں کو کسی اور جگہ پر Compensate کر دیتا ہے۔

سوال: کیا انعام صرف نفس سے لڑنے کی صورت میں ہے؟

جواب: پاکیزہ سوچ کو نفس بھٹکاتا ہے۔ حالات کے جبر کے تحت جب ہمارا نفس ہمیں ناپسندیدہ چیزوں کی طرف لے جانے لگے اور ہم خود سے لڑیں تو انعام اُس لڑائی کا ہے۔ اگر حالات مخالف نہ ہوں تو ہمیں اپنے نفس سے لڑنا نہیں پڑے گا۔

یہ صرف فرشتے ہیں جن کے اردگرد کا ماحول ایسا نہیں کہ اُنھیں لڑنا پڑے۔ وہ صرف رب کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں اِس لیے ان کے لیے جزا ہے نہ سزا۔

حقیقت شناسی

سوال: اللہ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کرو۔ ایسا کیوں؟

جواب: رب تعالیٰ عظیم ترین ہے، سب سے بڑا ہے اور اُسے اپنی عظمت کا ادراک بھی ہے۔ فرشتے ہمیشہ سے رب تعالیٰ کو سجدہ کرتے آئے ہیں۔ چوں کہ انسان کی تخلیق بطور نائبِ الٰہی تھی اِس لیے رب تعالیٰ نے فرشتوں پر انسان کی Supremacy قائم کرنے کے لیے اُنھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

مثال کے طور پر ایک صاحبِ خانہ کے بہت سے ملازم ہوں جو حکم کی بجا آوری کرتے ہوں۔ اگر صاحب خانہ کی شادی ہو جائے تو وہ ملازمین سے بیگم کا تعارف یوں کرائیں گے ''اب میری اِن Wife کی گھر میں حکومت ہوگی۔ آپ اِن کے حکم کی اطاعت کریں گے۔'' اِن الفاظ کا مقصد یہ نہیں کہ اب بیگم صاحبہ کے گھر میں آجانے کے بعد صاحبِ خانہ نے اپنی ذات کی نفی کردی۔ اُن کی حیثیت پہلے کی مانند گھر میں برقرار رہے گی۔ لیکن چوں کہ ملازمین سے بیوی کی عزت کرانا مقصود ہے اور ملازمین کو اُن کا حکم ماننے کا پابند بنانا مطلوب ہے اِس لیے صاحبِ خانہ اپنی Wife کا یوں تعارف کراتے ہیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ یہ انسان میرا نائب ہے۔ اِس نائب کی فرشتوں پر Supremacy قائم کرنے کے لیے اُنھیں حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ اب بنی آدم اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ میں لائقِ سجدہ ہوں۔ یاد رکھیے! فرشتوں پر انسان کی Supremacy قائم کرنے کے ساتھ رب تعالیٰ نے انسان کو بھی Remind کرا دیا کہ رب صرف میں ہوں۔ معبود اور لائقِ سجدہ صرف اور صرف میں ہوں۔

سوال: اللہ اور ولی اللہ دوست کیسے ہو سکتے ہیں کیوں کہ دوستی تو صرف دو ایک جیسے لوگوں میں ہوتی ہے؟ کیا دوئی سے یک جائی میں آنا شرک نہیں؟

جواب: دوستی بڑے اور چھوٹے میں بھی ہوتی ہے۔ دوستی کے لیے دونوں کا ایک مقام پر ہونا ضروری نہیں۔ ایک بہت بڑا اور دوسرا بہت چھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر چھوٹا اپنے اندر ایسی خوبیاں اور اچھائیاں پیدا کر لے اور بڑے کی ایسی خدمت گزاری اور تابع داری کرے کہ اُس کے دل میں گھر کر لے تو بڑے اور چھوٹے میں دوستی

اور قربت قائم ہو سکتی ہے۔ یہ دوستی اور قربت اِتنی بڑھ سکتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ خیال گزرنے لگے کہ جو یہ چھوٹا کہہ رہا ہے وہ بڑے کی مرضی ہے۔

رب اور بندے میں دوستی بندے کی اطاعت و فرماں برداری کی وجہ سے ہے کہ بندہ رب کی اطاعت اِس طرح کرے جو رب کا حق ہے۔ وہ اِس طرح رب کی بندگی کرے جس طرح بندگی کرنے کا حق ہے۔ اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کر لے جو رب بندے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسا بندہ یقیناً رب کا پسندیدہ ہو جائے گا۔

لفظ ''دوستی'' ہم محاورتاً اِستعمال کرتے ہیں۔ اصل میں بات اُس قرب کی ہے جو خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ رب تو سب کو ہی پالتا ہے، سب پر مہربانی فرماتا ہے اور سب کو عزیز رکھتا ہے۔ قرب ظاہر کرنے کے لیے ''ولی اللہ'' کی اِصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی میں اِس Expression کو بیان کرنے کے لیے یوں کہا جائے گا

He is close to Allah.

یا یوں کہہ دیا جائے گا

He is one of those whom Allah likes.

عربی میں یہ کہنے کے لیے کہ کوئی شخص اللہ کے قریب ہے ''ولی اللہ'' کے الفاظ اِستعمال کیے جاتے ہیں۔ عربی میں ''ولی'' Guardian کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ نکاح کے وقت لڑکے یا لڑکی کا ولی موجود ہونا چاہیے۔ اِس سے مراد Guardian ہی ہے۔

اگر ہم ظاہری لفظوں کے بجائے اُن کی رُوح پر نظر رکھیں گے تو کنفیوژن سے بچ جائیں گے۔

ایک صاحبِ خانہ کے پانچ ملازم ہیں۔ ایک ملازم صاحب خانہ کی مرضی کے مطابق صاف ستھرا اور Well-dressed رہتا ہے، دُھلے ہوئے بالکل White gloves پہن کر کھانا Serve کرتا ہے۔ جب تک صاحبِ خانہ سو نہ جائے، سوتا نہیں۔ جب بھی آواز دی جائے فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے سر کہہ کر اجازت لیتا ہے۔ ایسا ملازم بہت جلد دل میں گھر کر لیتا ہے۔ اگر وہ ملازمت چھوڑ کر جانا چاہے تو مالک اُسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ بندہ Behave کیسے کر رہا ہے۔ کیا وہ اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کر رہا ہے جو رب کی پسندیدہ ہیں؟ جو بندہ رب کی غیر مشروط اطاعت کرتا ہے اور اطاعت کے جواب میں ہر دو منٹ بعد نئی فرمائش کرنے کے بجائے کہتا ہے ''میرے اللہ! تُو نے جیسے مجھے رکھا میں اِس میں خوش ہوں۔'' ایسے بندے کو رب اپنے قریب کر لیتا ہے۔ یہی دوستی ہے، یہی قرب ہے اور یہی ولایت ہے۔

آپ ولی اللہ کو اِن معنوں میں لیجیے، محض الفاظ پر مت جائیے۔

سوال: جب موت کا وقت معین ہے تو پھر انسان موت سے اِتنا خوف زدہ کیوں رہتا ہے؟

جواب: ہر شخص کی موت کا وقت ہی نہیں، مقام اور طریقہ بھی معین ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تم

بیمار ہو تو اپنا علاج کراؤ۔ علاج سے زندگی بڑھتی نہیں، موت کا وقت ٹلتا نہیں۔ علاج اِس لیے ضروری ہے تاکہ کوالٹی لائف حاصل ہو سکے۔ بجائے سسک سسک اور گھٹ گھٹ کر جینے کے انسان اپنے ہاتھ پاؤں پر چلتا پھرتا، کماتا اور لوگوں کی خدمت کرتا رہے۔

علاج یا پرہیز ہماری موت کے معین وقت کو ٹال نہیں سکتے نہ اُسے آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ہم نئی کار خریدتے ہیں۔ اُس کی Running بہت Smooth اور Flawless ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ پرانی ہو جاتی ہے۔ ہم اُسے اچھی حالت میں رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً اُس کے گھسے ہوئے پرزے تبدیل کراتے اور گاڑی کی سروس کراتے رہتے ہیں۔ اِس کے باوجود ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ کار ہمیشہ کے لیے جواب دے جاتی ہے۔ آپ نے ابھی تک کوئی ایسی کار نہیں دیکھی ہوگی جو 100 سال پہلے بنائی گئی تھی اور تب سے اب تک وہ اُسی طرح سروس Provide کر رہی ہو جس طرح پہلے دن کر رہی تھی۔ اِسی طرح انسان پرہیز کرے، علاج کرائے، اپنی خبر گیری رکھے لیکن اِس کے باوجود ایک ایسا وقت آتا ہے کہ اُس کے اعضا اِس قابل نہیں رہتے کہ مزید کام کر سکیں۔ یہ وقت معین ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ وقت مقررہ تک انسان کے اعضا چلتے رہتے ہیں۔ پھر اِس کے بعد جواب دینے لگتے ہیں۔ احتیاط، پرہیز اور خبر گیری اس بات کی گارنٹی نہیں کہ اِس سے ہم اپنی موت کا وقت آگے شفٹ کر سکیں گے۔ انسان کو بہر حال ایک دن مرنا ہی ہے۔

ایک بادشاہ کو شکایت موصول ہوئی کہ اُس کا وزیر کرپشن میں ملوث ہے۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا کہ وزیر نے اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ چونکہ ثبوت موجود نہیں تھے اِس لیے بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور کہا کہ اگر تم میرے تین سوالات کے جوابات دے دو تو تمھیں کچھ نہیں کہوں گا اور انعام و اکرام سے بھی نوازوں گا۔ اگر تم دو دن میں جواب نہ دے سکے تو تمھاری گردن اُڑا دوں گا۔ سوال یہ ہیں:

1۔ دُنیا کی سب سے بڑی سچائی کیا ہے؟
2۔ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے؟
3۔ انسان غیر اللہ کے سامنے کب جھکتا ہے؟

وزیر نے اپنے ملک کے دانش وروں سے اِن سوالوں کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ اِسی طرح کی کوششوں میں دو دن گزر گئے۔ وزیر نے سوچا کہ بادشاہ کے ہاتھوں جان گنوانے سے بہتر ہے کہ اِس کی دسترس سے دُور چلا جاؤں۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد دُور ایک کھیت میں کسان کو ہل چلاتے دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اِس کسان سے بھی یہ سوال پوچھ کر دیکھوں۔ وزیر کی زبانی سارا ماجرا سننے کے بعد کسان نے کہا ''میں ہوں تو اَن پڑھ لیکن شاید کچھ عرض کر سکوں۔'' وزیر نے سوچا کہ بڑے بڑے دانش ور تو اِس معمے کو حل نہیں کر پائے، یہ اَن پڑھ کسان کیا کرے گا۔ لیکن وزیر نہیں جانتا تھا کہ وہ کسان ولی اللہ تھا۔ کسان نے تینوں سوال سننے کے بعد کہا کہ آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ دُنیا کی سب سے بڑی سچائی

موت ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کبھی کوئی انکار نہیں کر سکا۔ جو دُنیا میں آیا ہے، اُسے جانا ہے۔ رب کے منکر موجود ہیں لیکن موت سے کسی کو انکار نہیں۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ملکیت کا احساس ہے۔ میں Claim کرتا ہوں کہ زمین میری ہے۔ اگر واقعی زمین میری ملکیت ہے تو اِسے قبر میں میرے ساتھ جانا چاہیے۔ انسان خالی ہاتھ دُنیا میں آیا اور اُسے خالی ہاتھ ہی واپس جانا ہے۔

تیسرے سوال کے جواب کے لیے آپ کو میرے گھر جانا پڑے گا۔ گھر پہنچنے کے بعد کسان نے بیٹے کو بلا کر کہا کہ جس برتن میں کتے کو میں دودھ پلاتا ہوں وہ لے آؤ۔ جب وہ برتن آ گیا تو کسان نے بیٹے سے کہا کہ اب کتے کو لے آؤ۔ جب کتے نے آ کر اُس برتن میں سے تقریباً آدھا دودھ پی لیا تو کسان نے وزیر سے کہا کہ آپ کے تیسرے سوال کا جواب میں اُس وقت آپ کو دوں گا جب آپ اِس برتن میں بچا ہوا باقی دودھ پی لیں گے۔ وزیر یہ انوکھی اور نا قابلِ عمل فرمائش سن کر شش و پنج میں پڑ گیا کہ اگر یہ دودھ نہیں پیتا تو جواب حاصل نہیں کر پاؤں گا اور جان سے جاؤں گا۔ آخر کار جان بچانے کے لیے وزیر نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سمجھایا اور یہ کہہ کر خود کو دودھ پینے پر آمادہ کر لیا کہ کسی کو کیا پتا چلے گا کہ میں نے کتے کا جھوٹا دودھ پیا تھا......

جونہی وزیر نے برتن پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا تو کسان نے کہا کہ اِس برتن کو زمین پر رکھ دیجیے۔ آپ کا یہ عمل ہی تیسرے سوال کا جواب ہے۔ ہم موت کے خوف سے مغلوب ہو کر غیر اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ یہ موت کا خوف تھا جس نے آپ کو حرام دودھ پینے پر مجبور کر دیا۔ موت میرے ہاتھ میں ہے نہ بادشاہ کے ہاتھ میں۔ لیکن تم بادشاہ کے ہاتھ میں موت سمجھ کر اُس سے خوف زدہ ہو گئے اور جان بچانے کے لیے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میرے سامنے جھک گئے اور حرام دودھ پینے پر آمادہ ہو گئے۔

صاحبو! فقیر اِن حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے اس لیے اُس پر کبھی موت کا خوف طاری نہیں ہوتا۔ وہ موت سے ڈرتا نہیں بلکہ اُس کا انتظار کرتا ہے کیوں کہ موت اُس کے لیے راحت ہے، رب سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ فقیر رب سے ملاقات کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

معرفت کے رنگ

سوال: کیا فیکٹری میں کام کرنے والی لیبر کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ بغیر بتائے دینا مناسب ہے؟

جواب: صرف یہ احتیاط کرلیں کہ اُن میں کسی سید کو زکوٰۃ نہ دیں۔ لیبر کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اگر اُن کے حالات ایسے ہیں کہ اُن کا گزارہ نہیں ہو پا رہا یا اُن کی کوئی اور مجبوری ہے۔

سوال: میں آپ کے لیکچرز ایک سال سے سُن رہا ہوں۔ چند دن پہلے سحری سے کچھ دیر پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک چھوٹی سی مسجد کے احاطے میں آپ لوگوں کے جھرمٹ میں بیٹھے مجھے پکار رہے ہیں۔ میں مسجد کے اندر سے آپ کی آواز سن کر آپ کی طرف آتا ہوں تو آپ بھاگتے ہوئے میری طرف آتے ہیں۔ میں بھی صحن کے بیچ بھاگ پڑتا ہوں اور ہم دونوں روتے ہوئے گلے لگ جاتے ہیں۔ پھر آپ مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں۔ میرے علاوہ صرف ایک آدمی آپ کی اِقتدا میں مختصر نماز ادا کرتا ہے۔

جواب: آپ اللہ کی راہ کی طرف لگ جایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا ہاتھ پکڑ لے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سوال: اِسلام میں شادی کے لیے لڑکی کی رضامندی حاصل کرنا کیوں ضروری ہے۔ اِس کی Logic کیا ہے؟

جواب: اِسلام میں انسان کے بنیادی حقوق کو بہت Respect کیا گیا ہے۔ چوں کہ زندگی لڑکے اور لڑکی نے گزارنی ہے اِس لیے پسند و ناپسند بھی اُنہی کی ہونی چاہیے۔

اسلام میں لڑکی کے بنیادی حقوق کو Respect کرتے ہوئے والدین کو پابند بنایا گیا ہے کہ وہ بیٹی کی شادی سے پہلے اُس کی رضامندی جان لیں۔ اگرچہ ایک بالغ لڑکی کو غیر مرد کے سامنے بلاضرورت آنے کی اجازت نہیں لیکن جہاں رشتے کی بات ہو وہاں اسلام لڑکے اور لڑکی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔

ہمارے یہاں دراصل ہندو کلچر کا غلبہ ہے۔ ہم اِس سے متاثر ہیں اور ہماری رُسوم اِسی کلچر سے متاثر ہیں۔ اِسی کلچر کی وجہ سے ہمارے ہاں دوسری شادی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ حالاں کہ عرب کلچر میں دوسری شادی معیوب نہیں سمجھی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس کی اجازت دی ہے۔ ہمیں سماجی رُسوم کے بجائے اسلام کے احکامات پر عمل کرنا چاہیے خواہ ہم اندر سے کتنے ہی بے چین کیوں نہ ہوں۔

سوال: کیا شادی کے لیے ہم کفو یا ہم پلہ رشتے کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: جیسا کہ ابھی میں عرض کر رہا تھا کہ والدین کا فرض ہے کہ بیٹے یا بیٹی سے اُن کی شادی سے پہلے رضامندی معلوم کرلیں۔ لیکن اولاد کو بھی سمجھنا چاہیے کہ والدین زیادہ Experienced ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک زمانہ دیکھا ہوتا ہے۔ وہ فیصلے کرتے ہوئے اولاد کی طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ اگر اولاد والدین کے فیصلے کو Respect کرے تو بالعموم اِس کے نتائج بہترین نکلتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس سلسلے میں گائیڈ لائن دی کہ شادی اپنے ہم پلہ و ہم کفو میں کریں۔ اِس کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ مختلف معاشرتی طبقات کے اپنے اپنے رہن سہن کے انداز، طریقے اور رُسوم ہوتی ہیں۔

ہم کفو خاندان میں شادی نہ کرنے سے مختلف معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ Clash کی صورت میں رشتوں میں بے سکونی پیدا ہوتی ہے اور نتیجہ طلاق کی صورت نکلتا ہے۔

ہم کفو سے مراد ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے خاندان جن کا Social Status کم و بیش ہمارے جیسا ہی ہو، اُن میں بچوں کی شادی کریں۔

سوال: لڑکے کے صاف انکار کے باوجود لڑکے اور لڑکی کے والدین نے جانتے بوجھتے ہوئے زبردستی اُن کی شادی کر دی۔ جب کچھ عرصے بعد لڑکے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو نتائج سے پیشگی واقف والدین نے اپنے غلط فیصلے کے بجائے تقدیر کو موردالزام ٹھہرایا۔ کیا والدین کو پہلے ہی سوچ سمجھ کر قدم نہیں اُٹھانا چاہیے تھا؟

جواب: رب تعالیٰ نے انسان کو علم اور عقل عطا فرمائی۔ علم ہمیں اچھے اور بُرے میں تمیز سکھاتا ہے اور عقل اچھے میں سے زیادہ اچھے کی تمیز سکھاتی ہے۔ اگر بیٹا کسی جگہ شادی کرنے سے انکار کر رہا ہے تو والدین کو اُس کی خواہش اور رائے کا احترام کرنا چاہیے اور وہاں اُس کی شادی نہیں کرنی چاہیے۔

اولاد کے حقوق کے سلسلے میں ہم عام طور پر جس چیز کو Ignore کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کے معاملے میں اُن کی ذہنی سطح پر نظر نہیں رکھتے۔ یہ بہت اہم Point ہے۔

جب ہم اپنے بیٹے یا بیٹی کا رشتہ دیکھیں تو ہم کفو و ہم پلہ کے علاوہ اِس بات کو بھی بہت گہرائی سے جانچیں کہ کہیں لڑکے اور لڑکی کی ذہنی سطح میں زیادہ فرق تو نہیں۔ دس سے 20 فیصد فرق چل جاتا ہے۔ لیکن اِس سے زیادہ کا فرق ہو تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ہم کبھی اپنے بچوں کا رشتہ دیکھتے ہوئے اِس فرق کو Ignore کر دیتے ہیں۔

جو دوسرا کام ہم نہیں کرتے۔ وہ یہ ہے کہ جس بیٹے یا بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اُسے سمجھاتے نہیں کہ شادی کے بعد زندگی میں Adjustment period آئے گا جو کہ بہت Natural ہے۔ Adjustment کرنے میں دقت آتی ہے اور رشتوں میں تلخی بھی آتی ہے۔ شادی کے بعد اِس Adjustment period کو کیسے گزارنا ہے، یہ ہم اپنے بچوں کو نہیں بتاتے۔

اگر ہم یاد کریں تو شادی کے شروع کے ڈھائی سال بہت مشکل تھے کیونکہ وہ Adjustment period تھا۔ روز ایک دوسرے سے چخ چخ ہوتی تھی۔ اِس لیے اولاد کو اگر ہم اُن کی شادی سے پہلے ڈھائی سال کے Adjustment period کے بارے میں Warn کر دیں کہ اُسے ہوش و عقل مندی سے کیسے Handle کرنا ہے، تو پھر شاید اُنھیں شادی کے بعد اِتنی مشکل نہ ہو۔

سوال: برکت سے کیا مراد ہے؟

جواب: ضرورت سے کم چیز ہو لیکن اِس میں ہماری ضرورت پوری ہو جائے تو یہ برکت ہے۔

برکت دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔

1۔ باوجود اپنے پاس کم ہونے کے اُس میں دوسروں کو حصہ دار بنالیا جائے۔ بڑی خوش دلی سے اُس میں سے کچھ اُنھیں دے دیا جائے۔

میری طرح کی حرکتیں مت کیجیے کہ کسی کو ایک پیسہ دینے کا حادثہ پیش آجائے تو غم کے مارے مہینہ بھر کھانا نہیں کھاتا۔

یہ سوچ کر اللہ کے دیے میں دوسروں کو حصہ دار بنایئے کہ میرے پاس بھی یہ سب رزق اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ اللہ کے اِس بندے کا بھی اِس پر حق ہے۔ اِس سوچ کے تحت دیے گئے رزق میں برکت بھی آتی ہے اور وسعت بھی۔

2۔ دوسری چیز جو برکت کا باعث بنتی ہے وہ ہے ہر ایک کے لیے بہتر سوچنا۔ ہر ایک کے لیے خیر سگالی اور محبت کے جذبات رکھنا۔

سوال: سُنا ہے کہ نکاح، وظائف یا کاروبار کا آغاز چاند کی اِبتدائی تاریخوں میں کرنا چاہیے۔ چاند کی آخری تاریخوں میں کیے گئے کام ناکام ہو جاتے ہیں۔ اِس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا قمر در عقرب میں کام بگڑتے ہیں؟

جواب: اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم پر چاند کے اثرات ہوتے ہیں۔ انسانی بلڈ پریشر کا تعلق چاند کے ساتھ ہے۔ چوبیس گھنٹے میں وقفے وقفے سے بلڈ پریشر چیک کر کے اگر ہم ایک ہفتے کے لیے بلڈ پریشر کا گراف بنالیں تو پتا چلے گا کہ ہر انسان کا Lowest and peak point ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ اُس کی Body chemistry پر چاند کے اثرات کی وجہ سے ہے۔

یہ سب روایات ہیں کہ چاند کی پہلی سے چودہ تاریخ تک اور چاند کی پہلی جمعرات (جسے نوچندی جمعرات کہا جاتا ہے) میں کوئی وظیفہ شروع کیا جائے تو وہ رُوحانی ترقی میں بہت مدد دیتا ہے اور اگر چاند کی 15 تاریخ سے لے کر آخری تاریخوں کے دوران کوئی وظیفہ شروع کیا جائے تو وہ دُنیاوی فوائد دیتا ہے۔ اِن سب روایات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ اِن پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔ سب دن اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ قمر در عقرب کی جو بات آپ نے کی، یہ دراصل آسٹرولوجی کی ایک ٹرم ہے جس کا مطلب ہے کہ جب چاند Zodiac Sign

عقرب (Scorpio) میں داخل ہو جائے تو ڈھائی دن وہاں رہے گا۔ اِن ڈھائی دنوں میں کام بگڑتے ہیں اور اِس دوران اگر کوئی وظیفہ شروع کیا جائے تو وہ فائدہ نہیں دیتا۔

یہ علمی نکتہ میں نے آپ کے سامنے رکھا ورنہ میں آسٹرولوجی کا قائل نہیں۔ یہ علم ضرور ہے لیکن میں اِس بات کا قائل نہیں کہ یہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی زندگی پر صرف وہی اثر انداز ہوتا ہے جو رب چاہتا ہے۔ میں نے اپنے مرشد کے ہاتھوں اِس علم کا حشر ہوتے دیکھا۔ ایک صاحب مرشد صاحب کے پاس آسٹرولوجی کا علم لینے آیا کرتے تھے۔ میں بھی ایک روز وہاں بیٹھا تھا۔ اُن صاحب کو اندازہ نہیں تھا کہ مرشد صاحب جو بظاہر مجھ پر اِتنی سختی کرتے ہیں اندر سے مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ اُنھوں نے مرشد صاحب کی موجودگی میں مجھے مخاطب کر کے کہا "جو کچھ کمانا ہے ڈھائی سال میں کما لیجیے، اِس کے بعد تو آپ گئے۔" میں حسب عادت ہنس پڑا کہ کیا فرق پڑتا ہے، کہتا رہے کوئی کچھ بھی۔ مرشد صاحب نے اِس بات کو مائنڈ کیا، تلخ لہجے میں اُنھیں کہا "یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟" وہ صاحب بولے "جناب! میں نے یہ علم آپ ہی سے سیکھا ہے۔ Calculations کی بنیاد پر ایسا کہا۔" مرشد صاحب نے Calculations دیکھ کر فرمایا "ہاں! حساب تو تم نے ٹھیک کیا لیکن تم یہ بھول گئے کہ دُنیا میں اللہ کے ایسے بندے ہیں جو اُنگلی کے ایک اشارے سے چال بدل دیتے ہیں۔" تب وہیں بیٹھے بیٹھے اُوپر آسمان کی طرف دیکھ کر اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "چال بدل دو۔" اِس کے بعد اُن صاحب سے کہنے لگے "اب حساب کرو۔" حساب کرنے کے بعد اُن کے پسینے بہہ نکلے کیونکہ وہ Change ہو چکا تھا۔ مرشد صاحب بولے "اِسی حساب کے برتے پر تم سرفراز سے کہہ رہے تھے کہ ڈھائی سال کے بعد سب ختم۔"

رب کا نظام بڑا Powerfull ہے۔ اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں جو اُنگلی کے اشارے سے ستاروں کی چال بدل دیتے ہیں۔

علم جفر کے ماہر ایک صاحب مجھے Industrialist سمجھتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے میں آپ کا حساب کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا "کر لیجیے۔" بولے، "اپنے ہاتھ لایئے۔ اِن دونوں کو ملا کر دیکھنے کے بعد میں آپ کو صحیح بتاؤں گا۔" ہاتھ دیکھنے کے بعد جب وہ ساری بات بتا چکے تو میں نے کہا "ذرا میرا ہاتھ چھوڑ یئے گا۔" تب میں نے اپنا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ پر تین بار پھیرا اور دونوں ہاتھ دوبارہ اُن صاحب کے آگے کر دیے کہ اب ہاتھ پڑھ کر بتایئے کہ لائنیں وہی ہیں یا تبدیل ہو گئیں۔ وہ فوراً اپنے مرشد سے کہنے لگے "میں نے زندگی میں یہ دوسرا آدمی دیکھا ہے جو ہاتھ کی لکیریں بدل دیتا ہے۔" میں نے کہا "جناب! یہ مت دیکھیے کہ لکیریں بدلنے والا یہ دوسرا آدمی ہے۔ یہ دیکھیے کہ آپ جن لائنوں کو بنیاد بنا کر میری قسمت کا حال بتا رہے تھے، اُنھیں بدلنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ کن کن لکیروں کو پڑھیں گے؟"

بات یہ ہے کہ رب سب سے زیادہ Powerful ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے۔ آسٹرلوجی، Numerology، پامسٹری، علم جفر، علم رمل جیسے تمام علوم کا وجود ضرور ہے لیکن آپ اُنھیں صرف علوم کی حدود تک لیں۔ یہ مت سوچیں کہ یہ ہماری قسمت پر اثر انداز ہو جائیں گے۔ ایسا قطعی نہیں۔

یہ مت سوچیے کہ قمر در عقرب ہوگا تو کیا ہوگا۔ اگر قمر در عقرب ہے بھی تو دُنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اُنگلی کے اشارے سے ستاروں کی چال بدل دیں گے۔

آپ اُس علم کے حصول کی کوشش کیجیے جس کے حصول کے بعد اُنگلی کے اشارے سے ستاروں کی چال بدل دی جاتی ہے۔

سوال: نفس کی معرفت سے کیا مراد ہے؟

جواب: کسی زمانے میں خط کے لفافے پر ایڈریس میں لکھا جاتا تھا ''معرفت فلاں صاحب۔'' رُوحانیت میں معرفت سے مراد ایسا علم، نام یا چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم دوسری چیز تک پہنچیں۔

رب تعالیٰ کے اِسرار قدرت اور کارخانۂ قدرت کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں لیکن جب ہم شریعت پر عمل کرتے ہیں تو اُس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں ہمیں یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ کون سی چیز کیا ہے۔ چونکہ درمیان میں ایک واِسطہ اور پردہ موجود ہے۔ اِس پردے کے پیچھے دیکھنے کا نام معرفت ہے۔ جیسے ہم خط کے لفافے پر لکھتے ہیں۔

Mr. A care of Mr. B.

اِس کا مطلب یہ ہے کہ Mr. A تک خط اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہم لفافے پر Care of Mr. B. نہیں لکھیں گے۔ کیونکہ ڈاکیا Mr. B سے واقف ہے۔ گھر Mr. B کا ہے، گھر پر نیم پلیٹ بھی Mr. B کی ہے اور Mr. A، Mr. B کی Care of جانے جاتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ معلوم سے نامعلوم تک پہنچنے کا نام ''معرفت'' ہے۔

ہم رب تعالیٰ کی عبادت واطاعت اور اُس کا ذکر کرتے ہیں، اُس کے احکامات بجالاتے ہیں، حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی ادا کرتے ہیں اور عبادات میں فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کی ادائیگی بھی کرتے ہیں۔ اِسی طرح حقوق العباد بھی Requirement سے بڑھ کر ادا کرتے ہیں تو اِس کے نتیجے میں ہمارے اندر پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور پاکیزگی کی وجہ سے ہماری رُوح لطیف ہوتی ہے۔ رُوح جتنی لطیف ہوتی ہے اُس کی پرواز اُتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔

رب تعالیٰ ہماری اِس اطاعت سے خوش ہو کر ہمیں کچھ ایسی چیزیں دیکھنے کی اجازت دیتا ہے جو عام آدمی کو دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ معرفتِ الٰہی ہے۔ معلوم سے نامعلوم تک جانے کا سفر معرفت کا سفر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ معرفت الٰہی کی تو سمجھ آ گئی لیکن معرفتِ نفس کیا ہے۔ جب ہم اپنے نفس کا تزکیہ کر لیتے ہیں، اُس کو لگام ڈال لیتے ہیں، اُس کا سارا کنٹرول ہمارے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو پھر ہم نفس پر سواری کرتے ہیں۔ نفس ہم پر سواری نہیں کرتا۔ اِس سارے Process کو ''معرفتِ نفس'' کہتے ہیں۔

سوال: کیسے پتا چلے گا کہ رب مل گیا ہے؟

جواب: میں اِتنے بڑے سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں کیونکہ میرا علم اور اہلیت وہاں ختم ہو جاتے ہیں جہاں

بندہ یہ سوچتا ہے رب میرا آقا ہے...... میں اُس کا غلام۔ میں اپنے آقا کی غلامی اِس انداز میں کروں جس طرح حق ہے۔ مجھے تو اپنے Conduct پر نظر رکھنی ہے کہ میں صحیح طرح سے غلامی کر پایا یا نہیں۔ اگر تو میں ٹھیک طرح غلامی کر پایا تو بات ختم ہو گئی۔ باقی آقا اپنی مرضی کا خود مالک ہے۔ وہ چاہے تو اپنی دوستی عطا کر دے، چاہے تو رد کر دے۔ وہ مالک ہے اُس کو پوچھا نہیں جا سکتا۔ میرا علم تو یہی کہتا ہے۔

جب کسی شخص کی اِس بات پر نظر ہی نہیں کہ رب نے مجھے دوست بنایا یا نہیں اور اگر دوست بنایا تو مجھے اِس کا کیا ثبوت دیا تو ایسا شخص رب سے دوستی کی دوسروں کو کیا نشانی بتائے گا......!

سوال: ایسا کیا کیا جائے کہ اللہ اور آپ ﷺ کی محبت اور قرب عطا ہو جائے؟

جواب: اکثر کتب میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں وظیفہ کریں اللہ کی دوستی نصیب ہو جائے گی۔ لیکن ہمارا علم، عقل اِس سے مختلف بات کرتی ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات بھی اِس سے مختلف ہیں۔ میں بہت پڑھا لکھا شخص نہیں لیکن تھوڑا بہت جو میں جانتا ہوں اُس علم کے مطابق قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اللہ کے قرب کے لیے اُس کی اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت ضروری ہے۔ ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ یومِ حساب فیصلہ اعمال پر ہوگا۔ مجھے آج تک کہیں یہ لکھا نظر نہیں آیا کہ اے ایمان والو! اگر تم فلاں وظیفہ پڑھو گے تو تمھیں سب کچھ مل جائے گا۔ قرآن پاک میں تو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور اعمالِ صالحہ کی تلقین کی گئی ہے۔

بھائی! اگر میرے پاس کوئی ایسا نسخہ ہوتا کہ فلاں جڑی بوٹی ڈیڑھ اونس اور فلاں آٹھ اونس ملا کر کھرل میں پیس کر اِس میں عرق گلاب ملا کر روزانہ کھا لینے سے قرب الٰہی حاصل ہو جائے گا تو میں فوراً یہ نسخہ خود آزماتا۔

قربِ الٰہی کی راہ تو بہت کٹھن ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کسی کو اپنا بنانے کے لیے اُس کا بن جانا ضروری ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ کوئی میرا ہو جائے تو مجھ پر لازم ہے کہ میں سب سے پہلے خود اُس کا ہو جاؤں۔ پھر وہ میرا ہوگا۔

رب کا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے رب کا ہوا جائے۔ رب تعالیٰ کے فرمائے ہوئے ایک ایک حرف پر عمل کیا جائے، آپ ﷺ کی سنت کی پوری طرح اِتباع کی جائے، پھر کہیں جا کر سوچا جا سکتا ہے کہ رب راضی ہوا یا نہیں۔ شارٹ کٹ تلاش نہ کیجیے۔ اللہ کے فرمائے ہوئے ہر حرف پر In letter and spirit عمل کر لیجیے اور اِتباعِ سنت کو وتیرہ بنا لیجیے۔ رب آپ کا ہے۔ آپ ﷺ بھی آپ سے محبت فرمائیں گے۔

سوال: کیا مرشد اور مرید دونوں کو یہ پتا ہونا ضروری ہے کہ یہ میرا مرید اور یہ میرا مرشد ہے؟

جواب: یہاں بات آ گئی ہے دلیل اور جذبے کی۔ Logic یہ کہتی ہے کہ کسی بھی Agreement میں Enter ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جن پارٹیوں میں معاہدہ ہو رہا ہے نہ صرف معاہدہ اُن کے علم میں ہو بلکہ دونوں At their free will معاہدہ پر راضی ہوں۔ کوئی معاہدہ یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ It has to be

two-way agreement. یک طرفہ معاہدے کو دُنیا کی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرتی۔

دلیل تو یہ کہتی ہے کہ مرشد اور مرید کے درمیان ہونے والا معاہدہ دونوں کے علم میں ہونا چاہیے لیکن عقل اور دلیل سے بڑھ کر ایک چیز ہے ''جذبہ'' جس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو علم ہو یا نہ ہو میں خاموشی سے پیار کیے جاؤں۔ رُوحانیت اور رب کی راہ میں Logic سے زیادہ جذبہ کام آتا ہے۔ اگر مجھے کوئی شخص بھا گیا اور میں نے اُسے دل میں مرشد سمجھ لیا تو مجھے اِس بات سے کوئی غرض نہیں کہ یہ صاحب مجھے اپنا مرید ماننے کو تیار ہیں یا نہیں۔ میں تو اُنھیں اپنا مرشد سمجھتا اور اُن سے پیار کرتا رہوں گا۔

ہم میں سے بہت سے لوگ بہت محبت سے داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر جاتے ہیں۔ ہم محبت سے اُن کے پاس جاتے ہیں۔ اُنھیں اپنا مرشد، اُستاد اور گائیڈ سمجھتے ہیں تو ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو نہیں کہا کہ تم میرے پاس آیا کرو۔ میں تمھیں اپنا چاہنے والا سمجھتا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہم وہاں جاتے رہتے ہیں۔

Depend کرتا ہے کہ انسان کا جذبہ کیا ہے؟ کتنا ہے؟ یا داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کتنی محبت ملی۔ آپ محبت اور جذبے سے جاتے رہیے۔ دو چار سال میں ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات 20،20 سال بھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔

اِس راہ میں تو جذبہ کام آئے گا۔ Logic میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں تو اندھے جذبے کام کرتے ہیں۔ آپ جسے مرشد ماننا چاہتے ہیں، دل میں مان لیجیے۔ اُن سے پیار کرتے رہیے۔ مرشد کے بارے میں عرض کردوں۔ کہ میرے اپنے مرشد صاحب اپنے آپ کو بہت چھپا کر رکھتے تھے۔ ہم پر بھی عیاں نہیں ہوتے تھے سوائے ایک دو واقعات کے، جن میں وہ کھل گئے۔ ایک دن میں تنہا اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کیسے پاس رکھے میلے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''میاں! اُن منتوں کا کیا ہے۔ اِن میلے کپڑوں کے ڈھیر سے پوری ہو جاتی ہیں۔ تمھیں جو کچھ پڑھنے کو کہا ہے، پڑھتے رہو۔ منزل کو جا پہنچو گے۔'' پھر کہنے لگے ''تم پڑھو بھی کیوں۔ ہمارا نام جپتے رہو، منزل کو چلے جاؤ گے۔'' پھر ساتھ ہی فرمانے لگے ''تم ہمارا نام بھی کیوں جپو۔ ہم سے صرف پیار کرتے رہو، منزل کو پہنچ جاؤ گے۔''

صاحب! اِس راہ کے آداب تو یہی ہیں۔

سوال: کیا رُوحانی تعلیم کے حصول کے لیے اپنے مرشد کے علاوہ بھی کسی کے پاس جایا جاسکتا ہے؟

جواب: جانے میں کوئی حرج نہیں، ضرور جایئے۔ لیکن یاد رہے کہ تمام اچھے Institutions والدین کو اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے منع کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تمام ادارے ایک خاص طریقے سے سٹوڈنٹس کو تعلیم دے رہے ہوتے ہیں۔ کوئی Tutor ہوسکتا ہے اُنھیں اُس طریقے سے نہ پڑھا سکے، یوں بچوں کے ذہن میں کنفیوژن پیدا ہوگی۔ اِسی طرح جب تک مرید پختہ نہیں ہو جاتا اور مرشد یہ Declare نہیں کر دیتا کہ اب تم علم سیکھ چکے ہو۔ .Now you are at your own اُس وقت تک مرید کسی اور کے پاس علم سیکھنے نہ جائے۔ اِس کے بعد وہ کسی کے پاس علم سیکھنے جاسکتا ہے یا اگر مرشد اُسے کہہ دے کہ اب تم علم قرآن، حدیث

اور فقہ کے حصول کے لیے فلاں صاحب کے پاس جاؤ تو مرید اُن کے پاس جاسکتا ہے۔ لیکن رُوحانیت کا سبق مرشد ہی دیں گے۔

سوال: بچپن میں جس مرشد کا انتخاب کیا ہو کیا بالغ ہونے کے بعد کسی اور کو مرشد بنایا جاسکتا ہے؟

جواب: اگر مرید کا دل بچپن کے مرشد کے لیے نہ مانتا ہو تو اُن سے درخواست کردینی چاہیے کہ مجھے بیعت سے آزاد کردیں تاکہ میں کہیں اور بیعت کرلوں۔ مرشد پر بھی لازم ہے کہ وہ اِس درخواست کے بعد شاگرد کو بیعت سے آزاد کردیں۔

سوال: اپنے مرشد کے علاوہ کسی اور بندۂ مومن کی طرف رغبت پیدا ہونے لگے تو کیا کریں؟

جواب: آپ کسی کے مرید ہیں تو آپ پر یہ پابندی نہیں کہ آپ کسی اور بندۂ مومن سے رغبت نہ رکھیں اور اُس سے پیار نہ کریں۔ بس ایک احتیاط کرلیں کہ اپنے مرشد کے علاوہ کسی اور سے دُعا کے لیے نہ کہیں اور کسی اور کا بتایا ہوا سبق تسلیم نہ کریں۔ آپ ضرور اُن کے پاس جایئے، سلام کیجیے، اُن کی خدمت کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ اِس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ پڑھنے کے لیے کچھ دیں تو اپنے مرشد کے سامنے رکھ دیجیے ''جناب! فلاں بزرگ نے یہ مجھے پڑھنے کو دیا ہے۔ میں پڑھ لوں؟'' آپ کے مرشد آپ کو گائیڈ کردیں گے۔

چھوٹی چھوٹی باتیں

سورہ الانعام کی آخری آیات میں مویشیوں کا ذکر ہے اِس لیے اِس سورۃ کا نام ''الانعام'' رکھا گیا۔

زیادہ تر محققین کا خیال یہ ہے کہ یہ سورۃ آپ ﷺ کے مکہ مکرمہ میں قیام کے آخری عرصہ میں نازل ہوئی۔

یہ ایسی سورۃ ہے جو ماسوائے چند آیات کے اکٹھی نازل ہوگئی تھی۔ اِس میں 165 آیات، 20 رکوع ہیں۔

اِس سورۃ کی وجہ نزول سمجھنے کے لیے قریشِ مکہ کے اُس وقت کے احوال سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ اِس سورۃ میں Address ہی اُن معاملات کو کیا گیا ہے جن میں کفارِ مکہ مبتلا تھے۔ اُن میں نہ صرف بت پرستی عام تھی بلکہ وہ توہم پرستی کا بھی شکار تھے۔ جس کو جو پتھر پسند آجاتا وہ اُسے صاف کر کے حسبِ پسند اُس کی تراش خراش کرنے کے بعد اُس کی پوجا شروع کر دیتا۔ وہ لوگ صدقِ دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اُن پر جو بھی رحمتیں اور عنایات ہوتی ہیں وہ اِن بتوں کی پرستش کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ دوسری طرف وہ قبائل تھے جو رب کی عبادت تو کرتے تھے لیکن توحید کے بجائے تثلیث کے عقیدہ کے قائل تھے۔ اِس سورۃ میں اِن چیزوں کو Address کیا گیا ہے۔

- کفارِ مکہ سے کہا کہ جن کی تم پوجا کرتے ہو، نہ یہ بول سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ اپنے اُوپر بیٹھی مکھی اُڑا سکتے ہیں۔ جو اپنے لیے اِتنا مجبورِ محض ہے وہ تمھیں کیا دے سکتا ہے۔ رب تو وہ ہے جس کے لفظ ''کُن'' کہنے سے کائنات وجود میں آجاتی ہے۔ رب وہ ہے جو تمام ظاہر و پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہے۔ رب وہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں کسی غار میں ایک چیونٹی بھی Move کرتی ہے تو اُسے بھی سنتا، جانتا ہے اور اُس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

  جب آپ ﷺ نے اللہ کا یہ پیغام کفارِ مکہ تک پہنچایا تو یہ اُن کے لیے Mind-boggling تھا۔

- اِسی طرح سورہ الانعام میں رب تعالیٰ نے توحید پر زور دیا۔ اِس میں انسان کی اخلاقیات کو بھی Address کیا گیا ہے کیوں کہ کفارِ مکہ کے یہاں جانوروں اور مویشیوں کے بارے میں بہت سی توہمات و رُسوم موجود تھیں۔ تلاوت کے وقت اگر اِس بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھیں تو اِس کے مضامین کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

ایک عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے خلاف زیادہ اُدھم نصرانیوں نے مچایا۔ قبلہ اوّل پر حملہ کیا اُسے مسمار

کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے Address بنی اسرائیل کو کیا۔ وجہ یہ ہے کہ نصرانیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کیا وہ سامنے آ کر کیا لیکن بنی اسرائیل کا وتیرہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور منافقت کا رہا۔

اگر ہم اِس پر ذرا سا غور کریں تو بہت سے سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ہمیں اُن لوگوں سے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے جو چہرے پر دوستی کا نقاب ڈالتے ہیں، روزمرہ زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ جو اپنے جملے کے شروع، آخر اور درمیان میں ''سر'' لگاتے ہیں۔ جو لوگ کھل کر سب کہہ دیتے ہیں وہ کم نقصان دہ ہوتے ہیں بہ نسبت اُن لوگوں کے جو بظاہر اچھے اور بے ضرر محسوس ہوتے ہیں لیکن در پردہ اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ عجیب سا کھیل ہے۔ مغرب نے اِس میں کمال حاصل کیا ہے۔ میں تقریباً ایک سال پہلے House of Lords میں اِسلام پر بات کرنے کے لیے مدعو تھا۔ دو تین بار پہلے بھی اُنھوں نے مجھے وہاں اِسلام پر بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ ایک لارڈ نے مجھ سے پوچھا ''آپ جو ہر وقت یہ راگ الاپتے رہتے ہو کہ اِسلام امن کا دین ہے اور دشمن سے بھی محبت کرنا سکھاتا ہے۔ دوسری طرف ہمارا فوجی چلتی سڑک پر ذبح کر دیا گیا، اِس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے عرض کیا'' آپ نے بجا فرمایا۔ میں ذاتی طور پر ہر ملک و مذہب کے فوجیوں کا احترام کرتا ہوں، اُن سے محبت کرتا ہوں کیوں کہ دشمن ملک کا فوجی بھی اِس لیے قابلِ احترام ہے کہ وہ اپنے ملک کے لیے لڑ اور جان دے رہا ہے۔ مجھے اُس ذبح ہونے والے فوجی کے لیے افسوس ہے لیکن یہ کہنے سے پہلے کہ مسلمانوں نے اُسے گرا کر ذبح کیا، گہرائی سے تحقیق ہونی چاہیے۔'' میں نے اُن سے کہا ''انگریز کا ایک پہلو ایسا ہے جس سے مسلمانوں کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔

I take my hats off for that skill.

کیوں کہ آپ نے اِس Skill میں بہت Excel کیا ہے۔''

میں نے انگریزوں کو انھی کا ایک قصہ سنایا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی گوروں کے قابو نہیں آ رہا تھا تو گوروں نے جرمنی کو دھوکا دینے کے لیے ایک انٹیلی جنس گیم سوچی، جرمنی کو دھوکا دینے کے لیے ایک پلان تیار کیا۔ ایک بیماری ایسی ہے جس میں مبتلا انسان مر جائے اور اُس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پانی میں ڈوبنے سے اُس کی Death ہوئی۔ گوروں نے تمام ہسپتالوں میں ایسے مریض کی تلاش کی۔ بالآخر ایسا مریض مل گیا جو قریب المرگ تھا Hospital انتظامیہ سے درخواست کی گئی کہ اِس شخص کی Death کے بعد لاش فوری طور پر ہمیں دے دینا۔

دوسری طرف گوروں کی انٹیلی جنس ایجنسی نے ایک پرائمری سکول میں اُس شخص کا نام بچے کے طور پر داخل کرایا۔ پھر اُس نام سے GCSE(General Certificate of Secondary Education) کوالیفائی ہوا۔ اُس کی فوج میں ریکروٹمنٹ اور کمیشننگ Show کی گئی۔ پھر بطور میجر اُس کی پروموشن ظاہر کی گئی۔ اُس کی ایک گرل فرینڈ Show کی گئی جو انٹیلی جنس ایجنسی میں ہی تھی اور اُس میجر نے اُسے رہنے کے لیے ایک اپارٹمنٹ لے کر دیا ہوا تھا۔ ایک لانڈری شاپ پر اُس میجر کے نام کی کپڑوں کی رسیدوں کا ریکارڈ Maintain کرایا گیا۔ اِسی طرح Tailor کے پاس اُس کی وردی کی سلائی کا ریکارڈ رکھا گیا اُس کی ایک

کلب کی ممبر شپ اُس Date سے Create کی گئی جس Date سے فوج میں اُس نے کمیشن حاصل کیا تھا۔ ہر مہینے اُس کے بل کی ادائیگی کا ریکارڈ رکھا گیا۔

جیسے ہی اُس مریض کی Death ہوئی تو انٹیلی جنس ایجنسی نے فوراً اُسے لیا۔اُسے ایک میجر کی یونیفارم پہنائی۔فوج کا طریقہ ہے کہ اگر افسر کو ایسا بیگ Carry کرنا ہو جس میں اہم ڈاکومنٹس ہوں اُس بیگ کے ہینڈل میں ہتھکڑی کا ایک سوراخ ڈالا جاتا ہے جب کہ ہتھکڑی کا دوسرا سوراخ کلائی بیلٹ میں ڈالا جاتا ہے تا کہ اگر کوئی بیگ چھننا چاہے تو اِس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔انٹیلی جنس ایجنسی نے اسی طریقے سے بیگ اُس کے ہاتھ میں پکڑایا اور Two-seater ائیر کرافٹ میں اُسے اُڑا دیا۔

ناروے اور ڈنمارک اُن دنوں غیر جانب دار تھے۔اُن کے ساحلی علاقے سے ڈیڑھ میل پہلے اُس جہاز کو سمندر میں گرا دیا گیا۔پائلٹ کو Bail out کر دیا گیا جب کہ میجر کو جہاز ہی میں رہنے دیا گیا۔ساحل پر موجود کوسٹل گارڈز نے صبح کے وقت گرا ہوا ائیر کرافٹ دیکھا تو دفتر رپورٹ کر دی۔فورسز آئیں اور ائیر کرافٹ Recover کر لیا۔

جب یہ بات پھیلی کہ اِس ائیر کرافٹ سے برٹش آرمی کے میجر کی لاش ملی ہے تو جرمن ایمبیسی بہت Active ہو گئی۔بہت تگ و دو کے بعد اُس بیگ میں موجود War plans کی فوٹو کاپی حاصل کر کے جرمنی بھیجی گئی۔جرمن انٹیلی جنس ایجنسی نے اُس Document کو Examine کیا تو اُنھیں بہت حیرت ہوئی کہ وہ ایک بڑے حملے کا Plan تھا جب کہ جرمن کسی دوسرے پوائنٹ پر حملہ Expect کر رہے تھے۔جرمن انٹیلی جنس ایجنسی میں ایک واحد افسر Convinced تھا کہ یہ سب Plotted چیزیں ہیں جن کا مقصد جرمن آرمی کو Misguide کرنا ہے۔لیکن دیگر آفیسرز نے اُس کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور اُنھوں نے ساری فوجیں اصل پوائنٹ سے ہٹا کر فرضی پوائنٹ پر لگا دیں۔برٹش یہی چاہتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ برٹش آرمی کو فتح ہو گئی اور جنگ کا رُخ مڑ گیا۔

میں نے House of Lords میں یہ قصہ سنایا کہ جس طرح آپ نے مہارت اور خوبصورتی سے انٹیلی جنس گیم کے ذریعے دشمن کو دھوکا دیا، کیا اِسی طرح یہ امکان نہیں کہ آپ کے فوجی کو جن دو صاحبان نے ذبح کیا وہ محض نام کے مسلمان ہوں؟ یہ اسلام کے کسی دشمن نے کوئی انٹیلی جنس گیم Create کی ہو!

میرا خیال تھا کہ میری اِس مدلل بات پر انگریز تلملائے گا نہیں لیکن وہ بہت بُری طرح تلملایا اور اُس کے غصے کا اظہار اُس وقت ہوا جب لیکچر کے آخر میں ایک لارڈ نے مجھ سے کہا۔

"Well, you look that bad.Why do you come here? Why don't you leave us alone."

آج میں موضوع سے ہٹ رہا ہوں کیوں کہ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ چیزوں کو اُسی طرح لیا جاتا ہے جیسے وہ دکھائی دے رہی ہوتی ہیں۔

انڈین انٹیلی جنس را کے ڈائریکٹر نے اپنی کتاب میں بہت سی ایسی انٹیلی جنس گیمز کا ذکر کیا ہے جو انڈیا نے

پاکستان کے خلاف کھیلیں۔ایک گیم یہ بھی تھی کہ انڈین گورنمنٹ نے را کو یہ ٹاسک دیا کہ پاکستانیوں میں War fever پیدا کریں۔ڈائریکٹر انٹیلی جنس کا کہنا ہے کہ ہم نے بہت Study اور سوچ بچار کے بعد 1965ء کی جنگ میں پاکستان آرمی کی طرف سے کیے جانے والے بہادری کے کارناموں کے قصوں کو پاکستانی عوام میں بہت شدت سے اُبھارا۔اِس کے بعد ہم نے Crush India کے کروڑوں کی تعداد میں سٹکرز چھپوائے اور پاکستانیوں میں تقسیم کر دیے۔ہر ویگن، رکشا، گاڑی، موٹر سائیکل کے پیچھے Crush India کے سٹکرز دکھائی دینے لگے۔اِس War fever سے پاکستانی گورنمنٹ پریشر میں آ گئی اور پاکستان آرمی نے Eastern border پر Half-hearted attack کر دیا۔

معاملات کو سطحی نظر سے دیکھنے کے بجائے ہمیشہ گہرائی اور فراست سے دیکھنا چاہیے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔"

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم مومن ہوں اور ہماری نگاہ معاملے کی تہ تک نہ پہنچے محض سطحی حد تک محدود رہ جائے؟

ایک اور قصہ 1971ء کی جنگ کے دوران انڈین جہاز کا ہے۔ہم نے اپنی سادہ لوحی سے دشمن کو کشمیری مجاہدین سمجھ لیا۔ہمارے ایک لیڈر نے ائیر پورٹ پر جا کر اُن کشمیری مجاہدین کے حق میں دھواں دھار تقریر بھی کر دی۔اُس سیاسی لیڈر کے Visit کے بعد دشمن نے جہاز اُڑا دیا۔ہم اُن نام نہاد کشمیری مجاہدین کو کندھوں پر بٹھا کر جلوس نکالتے رہے۔بعد میں پتا چلا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ تھے۔

یہ مسلمان کی Approach نہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ رب کے نور کی مدد سے دیکھنے والا معاملات کو گہرائی تک نہ جانچ سکے؟ اپنے اندر مومن کی فراست پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر سے جذباتیت نکال دیں۔ہم بہت جذباتی لوگ ہیں۔ایک اور خامی مجھ جیسے لوگوں میں موجود ہے، آپ تو بھلے لوگ ہیں، ہمیں اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہوتا۔مثلاً میں اپنے ایک دوست کے ساتھ پچھلے چالیس سال سے اُٹھتا بیٹھتا کھاتا پیتا ہوں۔ہم زیادہ تر وقت اکٹھے گزارتے ہیں۔ایک شخص آ کر مجھے کہتا ہے کہ تمھارا وہ دوست تو شراب پیتا ہے۔میں یہ بات سن کر اُس شخص کو جھٹلانے اور اُس کی تصحیح کرنے کے بجائے ہر ایک سے کہتا پھروں گا۔ کمال ہے مجھے آج تک پتا ہی نہ چل سکا کہ میرا وہ دوست شراب پیتا ہے۔اِس کا مطلب ہے مجھے اپنی آنکھوں، کانوں اور رائے پر اعتبار اور اعتماد نہیں میں ایک انجان شخص کی باتوں پر نہ صرف یقین کر لیتا ہوں بلکہ اپنی چالیس سالہ رائے بھی بدل لیتا ہوں۔میں سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے Pass on کر دیتا ہوں اور ساتھ ہی گاہے بگاہے یہ حدیث بھی Quote کرتا رہتا ہوں کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سُنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے پہنچائے۔

میں قرآن پاک ترجمہ سے پڑھنے، علم حدیث وفقہ حاصل کرنے کا شوق تو رکھتا ہوں لیکن میں آج تک یہ نہ سمجھ پایا کہ یہ سب علوم حاصل کرنے کے بعد بھی اگر مجھے اپنی آنکھوں، کانوں اور اپنی رائے پر اعتماد نہیں اور میں سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے پھیلا دیتا ہوں تو کیا یہ بہتر ہے؟ یا پھر یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں ایک آیت ہی سہی اُسے سیکھ کر اُس پر In true letter and spirit عمل کر لوں۔میں کسی بھی علم کی مخالفت نہیں

کر رہا، صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہم چاہے تھوڑا سا علم سیکھیں لیکن اُس پر عمل کر لیں۔

اسلام کو ہم نے صرف عبادات کا مجموعہ سمجھ لیا ہے اور یہ تصور قائم کر لیا ہے کہ اگر ظاہری شکل وصورت ایک خاص طرز میں ڈھال لی تو ہم شریعت کے پیروکار ہو گئے۔

اسلام درحقیقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی In letter and spirit ادائیگی کا نام ہے۔ حقوق اللہ کی تو قضا ہے لیکن حقوق العباد کی قضا نہیں ہے۔ رب تعالیٰ رحیم وکریم ہے۔ روشن امکانات ہیں کہ ہمارے حساب کتاب کے بعد وہ اپنی رحمت کے صدقے اپنے حقوق معاف فرما دے گا لیکن حقوق العباد تب تک معاف نہیں ہوں گے جب تک متعلقہ شخص معاف نہ کر دے گا۔ حقوق العباد کی اِس قدر اہمیت ہے اور ہم حقوق العباد کی ادائیگی میں اُتنی ہی کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پٹرول اسٹیشن پر پٹرول لینے والوں کی لمبی قطار تھی اور میں قطار میں لگا یہ دیکھ کر مزے لے رہا تھا کہ جو بھی آتا مجھ سے پہلے باری لے جاتا۔ ایک صاحب سے یہ سب دیکھ کر جب رہا نہ گیا تو میرے پاس آ کر بولے ''یہ جو اِتنی دیر سے آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ اِسے مائنڈ نہیں کرتے؟'' میں نے کہا ''بھائی! میں تو مزے لے رہا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محفلوں میں گھنٹوں حقوق العباد اور اِسلام پر لیکچر دیتے ہیں۔ اِنھیں پتا نہیں کہ اس حق تلفی پر اِن کے گلے میں پھندا پڑ جائے گا۔ آخرت میں ہی نہیں دُنیا میں بھی یہ ہو جاتا ہے۔''

ہم لوگوں میں یہ احساس ختم ہو گیا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ کیا غلط اور کیا صحیح ہے۔ حقوق العباد کے حوالے سے آپ اپنے گرد وپیش کو چلتے پھرتے ہوئے Study کریں تو بہت عجیب وغریب چیزیں سامنے آتی ہیں۔ میں تو کمزور اور ڈرپوک آدمی ہوں، مجھے تو غصہ آتا ہی نہیں کسی بات پر۔ اِس لیے لوگوں کے رویے دیکھ دیکھ کر مزے لیتا رہتا ہوں۔

ایک بار میں کسی دوسرے ملک جا رہا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کا دور تھا۔ ایئرپورٹ پر زیادہ چیکنگ اور سختی نہیں ہوتی تھی۔ کمپیوٹر نہیں ہوتا تھا اِس لیے پی آئی اے والے ہاتھ سے بورڈنگ پاس لکھتے تھے۔ میں قطار میں کھڑا تھا۔ ایک صاحب شلوار قمیص میں ملبوس کاؤنٹر پر آئے۔ قطار میں لگنے کے بجائے کاؤنٹر پر گئے، زور سے ٹکٹ بورڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے ''ایک بورڈنگ پاس دے دو۔'' کاؤنٹر پر بیٹھے در کرنے پہلے سے شروع کیا ہوا بورڈنگ پاس ادھورا چھوڑ کر اُن صاحب کو بورڈنگ پاس ایشو کر دیا۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو میں نے اُن کو بڑے ادب سے سلام کیا اور پوچھا ''سر! آپ منتخب نمائندے ہیں؟'' وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے ''جی! جی! آپ نے کیسے پہچانا۔'' میں نے کہا ''یہ حرکت کوئی منتخب نمائندہ ہی کر سکتا ہے جو آپ نے کی ہے۔'' رویّوں کو Study کر کے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ہم دوسروں کا حق مارتے ہیں لیکن ہمیں اِس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہم اُس حدیث کا مفہوم بارہا پڑھتے اور سنتے آئے ہیں ''(کامل) مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' اِس کے باوجود ہم بہت روانی سے غیبت کرتے ہیں۔ ہم صرف ایک منٹ کا مزا لینے کے لیے اُس شخص کی عزت کا جنازہ نکال دیتے ہیں جو اُس وقت موجود نہیں ہوتا۔ اِس سے بڑھ کر کسی کو کیا ایذا دی جا سکتی ہے!

میں صبح سے شام تک کہتا رہتا ہوں کہ اللہ ستار العیوب ہے، وہ دوسروں کے عیب چھپانے کو پسند کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ جو دُنیا میں میرے بندوں کے عیب چھپائے گا میں قیامت کے روز اُس کی پردہ پوشی کروں گا۔

میں یہ سب باتیں Quote کرنے کے باوجود دوسروں کے عیبوں سے پردہ اُٹھاتا رہتا ہوں۔ میں کسی کو بُرا نہیں کہہ رہا۔ میں علم سیکھنے اور اُس کو Apply کرنے کی مثالیں دے رہا ہوں کہ ہمارے رویے درحقیقت کیا ہیں۔ آپ کسی جگہ بورڈ پر لکھا ہوا دیکھتے ہیں ''صفائی نصف ایمان ہے'' اور جس جگہ یہ بورڈ لگا ہوتا ہے وہاں اِتنی گندگی ہوتی ہے کہ قریب سے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں رشوت میں وہ نوٹ چن کر لیتا ہوں جن پر لکھا ہوتا ہے ''رزق حلال عین عبادت ہے''۔ آپ کبھی دُعا کی جگہ جا کر لوگوں کی دُعائیں سنیے کہ وہ کیسی ہوتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے میرا بیٹا بے گناہ ہے، دُعا کر دیں وہ بری ہو جائے۔ صاحبِ دُعا کشف میں جا کر دیکھ لیتا ہے کہ بیٹا تو قتل کا مجرم ہے۔ جب وہ والدین کو اصلیت بتاتا ہے تو وہ کہتے ہیں، بچہ ہے، اِس سے غلطی ہو گئی۔ دُعا کریں اُسے قتل کی سزا نہ ملے۔ صاحبِ دُعا کہتا ہے کہ رب کا فرمان ہے خون کا بدلہ خون۔ لیکن والدین کا مسلسل اصرار ہوتا ہے کہ بیٹے کو قتل کی سزا نہ ملے۔

اِسی طرح غیر ملک Visit Visa کے لیے Apply کریں تو Clearly ہدایات دی گئی ہوتی ہیں کہ آپ وہاں نہ جاب کر سکتے ہیں، نہ بے روزگاری الاؤنس لے سکتے ہیں اور نہ ہی Overstay کر سکتے ہیں۔ لیکن اِن تمام ہدایات کو نظر انداز کر کے میں نہ صرف وزٹ ویزا حاصل کرتا ہوں بلکہ وہاں جا کر وہ کام کروں گا جس سے اُس ملک کا قانون منع کرتا ہے۔ وہاں Overstay کروں گا اور پھنس جانے کی صورت میں کسی صاحب دُعا سے جا کر درخواست کروں گا کہ دُعا کر دیں۔ میرا غیر قانونی Stay قانونی (Legal) ہو جائے۔ میں یہ سب کرتے ہوئے بھول جاتا ہوں کہ مسلمان پر تو دوہری پابندی عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ملکی قوانین کی تعمیل بھی ضروری ہے Unless کہ ملکی قوانین اللہ کے احکامات سے ٹکرانے لگیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ میں کسی ملک میں Illegal رہ رہا ہوں اور پھر غیر قانونی کام میں کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کر رہا ہوں۔ یہ تو بالکل ایسے ہے کہ میں تھانے جا کر پولیس آفیسر سے کہوں ''حضور! میں کل رات فلاں علاقے کے فلاں گھر میں چوری کے لیے جاؤں گا۔ آپ مجھے گرفتار مت کیجیے گا اور دُعا بھی کرتے رہیے گا کہ گھر والے سوتے رہیں۔''

یہ مسلمان کا رویہ نہیں۔ ہمیں دُعائیں کرنے میں بھی محتاط رہنا ہو گا۔ میں پیر صاحب کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ دُعا کر دیں میرا بیٹا فرسٹ آ جائے۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ اِس طرح میں اُس بچے کا حق مار رہا ہوں جس نے سارا سال دن رات محنت کی۔ اِس کے برعکس میرا بیٹا سال بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا۔ ایسے بیٹے کے فرسٹ آنے کی دُعا کرانا کیا سال بھر محنت کرنے والے بچے کی حق تلفی نہیں؟

اگر ہم اپنے رویوں کو درست کر لیں تو اِسلام کی طرف چلے جائیں گے۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو بے زار کر دینے والی گفتگو کی۔ لیکن اِس بات پر غور کیجیے گا کہ رب کی خوشنودی کہاں ملے گی!

چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور اور عمل کر کے یا بڑی چیزوں کو گارڈ کر کے۔۔۔؟
انگریزی کا ایک محاورہ ہے:

You take care of pennies and pounds will take care of themselves.

جب ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر محتاط رہنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے اندر یہ خوف رہنا شروع ہو جاتا ہے کہ کہیں ہم اور ہمارے اعمال احکاماتِ الٰہی سے باہر نہ ہو جائیں تو اِس چھوٹی سی احتیاط کے بعد بڑی بڑی چیزیں خود بخود ٹھیک ہونے لگتی ہیں۔ پھر انسان گناہ کے راستے کی طرف جاتا ہی نہیں۔

روشن ضمیری

ایک سوال اکثر ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ باطنی علوم رکھنے والوں اور دُنیاوی علوم جاننے والوں میں کیا فرق ہے؟

علم پر جس قدر کسی کی دسترس ہو، اُسی کے مطابق اُس کا تصرف بھی ہوتا ہے۔ دُنیاوی علوم پڑھتے ہوئے ہم علم اُن معلومات اور نتائج سے اخذ کر رہے ہوتے ہیں جو ہم سے پہلے کے ماہرین نے کتب، لیکچرز اور تحقیق کی صورت میں پیچھے چھوڑے ہوتے ہیں۔ ہم اُن معلومات کو Gather کر کے اِس میں اپنی ذہانت اور غور و فکر کا Blend شامل کرتے ہیں اور اُس Blend کے نتیجے میں خود بخود ہماری معلومات میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ پہلے سے حاصل شدہ معلومات کو اپنی ذہانت اور غور و فکر اِستعمال کر کے جب ہم آگے بڑھاتے ہیں تو کبھی کبھار نتائج غلط بھی نکلتے ہیں۔ جیسے ایک طویل عرصے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چپٹی ہے، پھر یہ Theory تبدیل ہوگئی اور یہ خیال سامنے آیا کہ زمین گیند کی طرح گول ہے۔ ایک لمبا عرصہ ہم اِس خیال پر قائم رہے۔ پھر یہ تھیوری Finally تبدیل ہوگئی اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ زمین گول ہے لیکن دونوں قطبین پر پچکی ہوئی ہے۔ اِسی طرح ماہرین نے مختلف Theories دیں۔

ہم نے پہلے سے موجود معلومات جمع کر کے اپنی ذہانت اور غور و فکر کو اِس میں شامل کیا اور نئی چیز سامنے لے آئے۔ ایک زمانہ تھا کہ امریکہ اور یورپ نے شور مچایا کہ چکنائی کا اِستعمال Arteries کو بلاک کر دیتا ہے۔ اِس کے حل کے طور پر مختلف Alternates نکالے گئے، سویابین اور سن فلاور آئل نکالے گئے لیکن پھر یہ ہوا کہ وہ ملک جو تحقیق کے بعد ان نتائج پر بڑی شدت سے بات کر رہے تھے کہ چکنائی سے Arteries بند ہو جاتی ہیں، کہنے لگے کہ انسان کو ایک خاص حد تک Butter کا اِستعمال کرنا چاہیے۔ یہ انسانی صحت کے لیے ضروری ہے اور ہارٹ اٹیک سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ علم کے مختلف میدانوں میں ایسی Developments ہوتی رہتی ہیں۔

اِس کے برعکس درویشوں اور صوفیا کرام کی معلومات کا ذریعہ اُن کی روشن ضمیری ہے۔ جس شدت سے درویش تزکیہ نفس کر رہا ہوگا اُسی قدر اُس میں روشن ضمیری پیدا ہوگی۔ جتنا روشن ضمیر ہوگا اُتنا ہی اُس کے علم میں اضافہ ہوگا۔

آپ سب بھلے اور نیک لوگ ہیں۔ آپ نے اکثر نوٹ کیا ہوگا کہ جب ہم اپنے دل کو پاک صاف کر لیتے ہیں وہاں آلائشیں باقی نہیں رہتیں۔ کینہ، حسد، غصہ، غیبت، لالچ جیسی چیزیں دل سے نکل جاتی ہیں اور ہم اپنے دل میں دوسروں کے لیے صرف محبت پالتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب تجربہ ہونے لگتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ اِس کتاب میں کہیں یہ چیز پڑھی تھی، اِسے دوبارہ دیکھ لوں۔ ضخیم کتاب ہاتھ میں پکڑ کر کھولتے ہیں تو Exact وہی صفحہ کھلتا ہے اور اُسی بات پر نظر پڑتی ہے۔ آپ قرآن پاک میں سے کوئی حوالہ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ اُسے کھولتے ہیں تو Exact وہی حوالہ آپ کی نگاہ کے سامنے ہوتا ہے۔ آپ کو ٹرین پکڑنا ہے آپ کی وجہ سے آدھا گھنٹہ لیٹ ہو جاتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن پہنچتے ہیں تو ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ اُس میں کوئی Problem آ گیا تھا۔ جونہی آپ اُس میں سوار ہوتے ہیں ٹرین Whistle دے کر چل پڑتی ہے۔

بظاہر یہ اتفاقات ہیں لیکن فقیر اِنھیں اتفاقات نہیں، تصرفات کہتا ہے۔ فقیر سے جب کوئی سوال پوچھا جاتا ہے تو وہ جواب دینے سے پہلے دو تین سیکنڈ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر فوراً بولنا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل اِن دو تین سیکنڈز میں وہ روشن ضمیری کے ذریعے معلومات Receive کر رہا ہوتا ہے اور اُس کا دماغ اِن دو تین سیکنڈز میں Spin کر رہا ہوتا ہے۔ آپ فقیر کو اُس کی گفتگو کے دوران Interrupt کر دیجیے، پھر تماشا دیکھیے وہ بول ہی نہیں پائے گا۔ سارا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ بات وہیں ختم ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے شکایت کی کہ میں درسِ قرآن دیتا ہوں لیکن معانی بیان کرتے ہوئے دل میں کھٹکا سا رہتا ہے کہ شاید میں اِس کی تشریح درست نہیں کر رہا۔ میں نے پوچھا ”آپ کس روز درس دیتے ہیں“ کہنے لگے ”جمعہ کے دن۔“ میں نے عرض کی ”اِس Friday کو درس دیجیے اور پھر دیکھیے گا کہ کیا ہوتا ہے۔“ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے یک دم پوچھا ”کیا بنا آپ کے درس کا۔ بہتر ہوا معاملہ؟“ ہنس کر کہنے لگے:

"I am learning Quran-e-Pak from my ownself."

میں بول رہا ہوتا ہوں اور معانی خود سیکھ رہا ہوتا ہوں۔ یہ علم تزکیہ نفس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی روشن ضمیری کا ثمر ہے۔

درویش کا علم اُس کے تزکیہ نفس سے منسلک ہوتا ہے۔ ہم جب دُنیاوی علوم حاصل کرتے ہیں تو ایک مقام پر جا کر سامنے دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اُس کے پار دیکھنا ممکن نہیں رہتا۔ لیکن فقیر اُس دیوار کے پار دیکھ لیتا ہے۔ دُنیاوی علوم کے ماہر کو جو چیز پتھر دکھائی دیتی ہے، درویش اُس پتھر میں پوشیدہ جوہر دیکھتا ہے۔ دُنیاوی علوم کا ماہر کسی شخص کو ڈاکو، قاتل قرار دیتا ہے جب کہ فقیر اُس میں چھپی نیک رُوح پر نظر رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں اُس شخص کو سینے سے لگاؤں گا تو رفتہ رفتہ اُس کی تربیت ہو جائے گی اور یہ اپنے وقت کا ولی بنے گا۔ صوفی کی نگاہ اصلی جوہر اور باطن پر ہوتی ہے۔ دُنیاوی علوم کے ماہر کی نظر ظاہر پر جب کہ فقیر کی نظر انسان کے باطن پر ہوتی ہے۔

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ صاحب رُوحانی علوم میں مختلف سلاسل ہیں۔ شاذلیہ، قادریہ، سہروردیہ، سلسلوں کا کیا ہے۔ ایک گھر ہے، اُس میں 25 ,20 کھڑکیاں دروازے وغیرہ۔ یاد رکھیے! رب ایک ہے، کچھ کے رُخ مشرق اور کچھ کے رُخ مغرب کی جانب ہیں۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اُس گھر کے دریچوں اور دروازوں پر روشنی آتی ہے اور اپنی اپنی جگہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ اُس گھر سے باہر نکل کر کھلے آسمان تلے آ کر دیکھیں تو سورج بھی ایک اور اُس کی روشنی بھی ایک ہے۔ سورج کی روشنی کو دروازوں اور دریچوں نے تقسیم کیا ورنہ سورج بھی ایک اور روشنی بھی ایک۔

علم ایک ہی ہے۔ جس انسان کے ذریعے سے علم آگے پھیلا، لوگ اُس شخص سے علم اور فیض حاصل کرتے رہے، وہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُس شخص کو درمیان سے نکال دیجیے، منبع اور علم ایک ہی ہے۔ صرف دروازوں اور دریچوں سے آنے کی وجہ سے مختلف سلاسل بن گئے لیکن جس طرح دُنیاوی علم حاصل کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم علم سیکھنے کے لیے Willing ہوں اور اُس Willingness کے ساتھ ساتھ سکول بھی جائیں اور حصولِ علم کے لیے کوشش بھی کریں۔ اِن تین کوششوں کو پورا کرنے کے بعد اکتسابِ علم شروع ہو جاتا ہے۔

علم باطنی اِتنا Superior ہے کہ تمام علوم اِس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ علم باطنی رکھنے والا شخص تمام علوم پر روانی سے بات کرے گا حالاں کہ اُسے آتا جاتا کچھ نہیں۔ وہ موچی، جولاہا یا پرچون فروش ہی کیوں نہ ہو، Latest technology اور ہر موضوع پر روانی اور خوب صورتی سے بات کرے گا کیوں کہ اُسے جہاں سے علم حاصل ہو رہا ہے اُس کی نظر علم کے اِس منبع پر ہے۔ اِس لیے وہ علم کے اُس مقام پر چلا جائے گا کہ اگر آپ اُس سے پوچھیں کہ یہ جو ہوائی جہاز کھڑا ہے اِس میں کوئی نقص تو نہیں۔ وہ اُس پر دایاں ہاتھ رکھ کر چند سیکنڈ خاموش رہے گا۔ پھر بتائے گا کہ اُس کی میٹالوجی میں فرق ہے۔ فلاں جگہ جا کر اِس کا ایئر کرافٹ فریم جواب دے جائے گا۔

آپ اُس کے ہاتھ میں دوا پکڑا دیجیے۔ وہ چند لمحے اپنے ہاتھ میں وہ شیشی پکڑ کر سوچے گا اور بتائے گا کہ یہ دوا فلاں مرض کے لیے کام کرے گی اور فلاں کے لیے نہیں۔ آپ مریض کا نام اُسے بتائیے۔ وہ فوراً بتا دے گا کہ یہ دوا اُس مریض کو Suit کرے گی یا نہیں۔

آپ اُس کے سامنے کوئی نیا کیمیکل لے آئیے کہ یہ میں نے Develop کیا ہے۔ وہ اُسے ہاتھ میں پکڑ کر بتا دے گا کہ اِس میں فلاں خامی رہ گئی ہے، اِسے ٹھیک کر لیجیے۔ آپ اُسے کوئی پراڈکٹ دکھائیے وہ فوراً بتا دے گا کہ آپ کی فیکٹری میں فلاں مشین میں فلاں Defect ہے۔ اُسے دُور کر لیجیے۔ پراڈکٹ کی کوالٹی Up to the mark ہو جائے گی۔

یہ فقیر کی Access ہے۔ جو فقیر علم کی اِس درجے کی Access رکھتا ہے اُسے اِس درجے تک آنے کے لیے محنت بھی اُتنی ہی کرنا پڑتی ہے۔ جتنی کوئی چیز اعلیٰ وارفع ہوتی ہے اُس کا حصول اُسی قدر محنت طلب ہوتا ہے۔ اُس کے لیے جدوجہد بھی اُتنی ہی کرنا پڑتی ہے۔

تزکیہ نفس میں Effort کی Percentage کیا ہے؟

کوئی صوفی، درویش، ولی اللہ اِس بارے آپ کو صحیح بتا پائے گا۔ میں تو اِس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو ویسے ہی گفتگو کرتا رہتا ہوں۔ میں آپ کو Percentage کیا بتاؤں گا لیکن ایک اندازہ ہے کہ انسان کی 90 فی صد effort تزکیہ نفس میں Sink ہو جاتی ہے۔ جب ہم گھر بناتے ہیں تو 90 فی صد سرمایہ کاری (Investment) اُس کی بنیادوں میں Sink ہو جاتی ہے یعنی ہمارا Maximum time, effort and money بنیادوں میں خرچ ہو جاتی ہے۔ جب گھر DPC level سے اُوپر آ جاتا ہے تو پھر بلڈنگ کا Structure تیزی سے کھڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح علمِ باطنی کے حصول میں ہماری Maximum effort تزکیہ نفس پر لگتی ہے۔ وہ تزکیہ نفس صرف عبادات سے نہیں ہوتا۔ عبادات سے پارسائی تو آتی ہے تزکیہ نفس نہیں ہو پاتا۔

تزکیہ نفس نام ہے نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام ڈالنے کا، اِسے کنٹرول کرنے کا۔ بعض اوقات ہمیں نفس کی جائز خواہشات کی بھی مخالفت کرنا پڑتی ہے۔ نفس کی مخالفت بالآخر ہمیں تزکیہ نفس تک لے جائے گی۔

آپ نے اولیائے کرام کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنی پسندیدہ چیز پکاتے یا پکواتے ہیں اور پھر اُسے سامنے رکھ کر مرچوں سے روٹی کھاتے ہیں اور وہ پسندیدہ چیز مہمان کو پیش کر دیتے ہیں۔ یہ واقعہ میں نے خود ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں شام کو آفس سے اُٹھتا اور اپنے مرشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ میں دُنیا دار بندہ ہوں۔ وہاں جا کر سیکھنا کیا تھا، بڑے شاہ صاحب چائے بہت مزے کی بناتے تھے۔ وہ بھلے آدمی تھے، بہت بڑے مقام پر تھے، اُنھیں پتا تو تھا کہ یہ گناہوں میں لتھڑا ہوا دُنیا دار انسان ہے اور یہاں صرف چائے پینے آتا ہے لیکن اُنھوں نے کبھی شرمندہ نہیں کیا۔ وہ اُس روز کھانا کھانے لگے تھے کہ میں پہنچ گیا۔ اُنھوں نے ایک روٹی کا رول بنایا۔ سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا۔ کہنے لگے ”پائے کھاؤ گے؟“ میں نے اُن کی طرف ایک نظر دیکھا اور کہا ”بہت مہربانی حضور! میں تو کھا کر آیا ہوں۔“ اُنھوں نے ایک ڈول اُٹھا کر سامنے رکھا جس میں پائے تھے۔ بولے ”یہ پائے بہت مزے کے ہیں، کھاؤ“ میں نے معذرت کی کہ کھانا کھا کر آیا ہوں۔ پھر کہنے لگے ”مجھے نہیں کھانے یہ پائے، تم کھاؤ۔“ میں نے پھر معذرت کی۔ کہنے لگے ”میں تو پانی سے روٹی کھاؤں گا۔“ اُنھوں نے پائے کے سالن والا ڈول سابقہ جگہ پر رکھا اور روٹی کا وہ رول پانی سے کھا لیا۔

میرے خیال میں فقیر اپنے نفس کو جھٹکے دیتا رہتا ہے۔ اگر فقیر ایسا نہ کرے تو رب اُن کے نفس کو جھٹکے دینے لگتا ہے۔ آپ سبھی نیک لوگ ہیں۔ آپ کو تجربہ ہوا ہوگا کہ آپ فرمائش کر کے کوئی خاص ڈش پکواتے ہیں۔ عین جب آپ اپنا پسندیدہ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مہمان بھیج دیتا ہے۔ آپ ڈش مہمان کے سامنے رکھ کر کہتے ہیں، آپ کھائیے۔ میں کھا چکا۔

یوں جب انسان خود نفس کو جھٹکے نہیں دیتا تو رب تعالیٰ اُس کے نفس کو جھٹکے دینے لگتا ہے۔

جب انسان علم کے ایک مقام پر جا پہنچتا ہے تو پھر اُس پر سے یہ مشقتیں ہٹالی جاتی ہیں۔

ایک بار بات ہوئی تھی کہ فقیر اور صوفی میں کیا فرق ہے؟

جب انسان اللہ کی راہ پر چلنے لگتا ہے تو اُس پر بہت سی سختیاں لاگو ہوتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی ہر خواہش کی مخالفت کرتا ہے۔ فرض نمازوں اور روزوں کے علاوہ بہت سی نفلی نمازیں اور روزے اُس پر لاد دیے جاتے ہیں۔ وہ دُنیا سے کٹے رہنے کے لیے اُن نفلی عبادات میں مشغول رہتا ہے۔ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ انسان ٹی وی دیکھنا بند کر دیتا ہے، گھر میں رہتے ہوئے بھی تنہا رہنا پسند کرتا ہے تا کہ کسی آدمی یا ٹی وی پروگرام کی وجہ سے Distract نہ ہونے پائے۔ وہ رب کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ ہر قسم کی Distraction سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹی وی پروگرامز بہت بڑی Distractions ہیں۔

اِس راہ پر چلتے چلتے جب اُس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور اُسے علم حاصل ہونے لگتا ہے اِسرارِ قدرت پر اُس کی کچھ Access ہو جاتی ہے۔ (پوری Access تو کسی کو نہیں ہوتی صرف ایک جھلک ہی اِسرارِ قدرت کی نصیب ہوتی ہے، جس قدر رب چاہتا ہے۔)

اِس کے بعد وہ فقیر سے صوفی ہو جاتا ہے۔ تب اُس پر لاگو اضافی عبادات ہٹالی جاتی ہیں۔ نفس کو سیدھا کرنے کی سختیاں ختم کر دی جاتی ہیں۔ پھر وہ صرف ریفریشر کورس کرتا ہے۔ جب محسوس کرتا ہے کہ نفس پھر سے منہ زور ہو رہا ہے تو وہاں وہ پسندیدہ چیز سامنے رکھ کر مرچوں سے روٹی کھا لے گا تا کہ نفس کو سزا ملے۔ فقیر کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

ایک بار میرے مرشد صاحب کی زبان سے یہ بات Slip ہو گئی کہ اِس جمعہ پاکپتن شریف چلیں۔ میں نے کہا ”جو حکم۔“ ہم چلے گئے۔ دو تین دن بعد وہ بیٹھے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے کہ یہ مجھ سے زیادتی ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟ سوال کر دیا میں نے۔ میں چپ چاپ بیٹھا اُنھیں سنتا رہا تا کہ کچھ سیکھ سکوں۔ کچھ دیر بعد خود ہی مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے ”معاف کرنا، میں نے تم سے سوال کر لیا کہ پاکپتن چلتے ہیں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آیندہ ایسا نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا ”حضور! اِس میں ایسی کیا بات ہے؟“ بولے ”نہیں، مجھے سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ یہ اور بات کہ پھر میں اُنھیں ہر Friday یہ جھوٹ بول کر لے جانے لگا کہ میرا دل پاکپتن جانے کو چاہ رہا ہے۔ اُن دنوں جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔

جب ہم اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہیں تو تزکیہ نفس کی طرف چلے جاتے ہیں۔ نفس پر قابو پانے کی راہ میں بہت سے امتحان آتے ہیں۔ آپ قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک شخص آپ سے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آپ اِس عمل کو برداشت نہیں کرتے، کہتے ہیں ”ہٹیں یہاں سے۔“ اِس کے برعکس فقیر اِس شخص کو ہٹنے کا کہنے کے بجائے خوش دلی سے کہے گا ”آپ میری باری لے لیجیے، مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں بعد میں باری لے لوں گا۔“

نفس پر قابو پانے کے بعد انسان اپنی Dealings میں خلقِ خدا کے ساتھ ایثار و قربانی کا سلوک کرنے لگتا ہے۔ نیکی یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات، آرام، خواہشات اور مفادات پر دوسروں کی ضروریات، آرام،

خواہشات اور مفادات کو ترجیح دے۔ جب ہم مخلوقِ خدا کے ساتھ ایثار و قربانی کا سلوک کرنے لگتے ہیں تو تزکیہ نفس بہت تیزی سے ہونے لگتا ہے۔

سوال: معافی مانگنے اور توبہ کرنے میں کیا فرق ہے؟

جواب: معافی اور توبہ دونوں Integrated ہیں۔ ترتیب یہ ہے، توبہ اور معافی۔ گناہ ہو جائے تو پہلے ہم آیندہ کے لیے توبہ کریں اور اِس کے بعد ماضی میں ہونے والی کوتاہی کے لیے رب تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ کوشش کی جائے کہ توبہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، وہ معاف کر دیتا ہے۔ میں تو یہ گمان رکھنے کو بھی تیار نہیں کہ رب معاف نہیں فرمائے گا۔ وہ تو اِتنا غفور الرحیم ہے کہ اگر انسان ایک بار رب سے سچے دل سے معافی مانگ لے تو وہ فوراً معاف فرما دیتا ہے۔ انسان اِسی اعتماد سے رب سے معافی مانگے کہ رب کو معاف کرنا پسند ہے۔ وہ تو اِس انتظار میں رہتا ہے کہ بندہ مجھ سے معافی مانگے اور میں اُسے معاف کر دوں۔

آپ کو توبہ کرنے اور معافی مانگنے کا طریقہ تو کوئی نیک انسان بتائے گا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ رب میرا آقا و مالک ہے اور میں اُس کا بندہ و غلام۔ وہ جانتا ہے کہ نہ میرے پاس علم ہے نہ عقل۔ میں صدقِ دل سے اُس سے جن الفاظ میں بھی معافی کی درخواست کروں گا وہ میرے اُن الفاظ کو قبول کرتے ہوئے مجھے معاف فرما دے گا۔

سوال: آج کل بچوں کی شادیوں کے وقت عام طور پر اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر کے دولت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: جب کسی معاشرے میں اخلاقی اقدار دم توڑنے لگیں تو انسان سیرت کے بجائے صورت اور Virtues کے بجائے دولت کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ رب تعالیٰ ایک لمحے میں فقیر کو شہنشاہ اور شہنشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے دولت مند لوگوں کو Bankrupt اور فاقہ زدہ لوگوں کو مال دار ہوتے دیکھا ہوگا۔ سو ناپائیدار چیز کو کیا دیکھنا!

اگر آج ہم اپنے بچوں کا رشتہ طے کرتے وقت دولت کو ہر شے پر ترجیح دیتے ہیں تو کون جانے کہ آنے والے کل میں اُن کا مال رہے گا بھی یا نہیں۔ اِس کے برعکس Virtues پائیدار ہوتے ہیں، ضائع نہیں ہوتے۔

جس انسان میں اخلاقی خوبیاں ہیں، سیرت اچھی ہے، وہ گر بھی جائے تو دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن جو شخص محض دولت مند ہے، باقی خوبیوں سے خالی ہے، وہ گر جائے تو دوبارہ اُٹھ نہیں پاتا۔

سورہ حشر کے اہم مضامین

سورہ حشر مدنی ہے۔ اِس میں تین رکوع اور 24 آیات ہیں۔ کچھ علما کے نزدیک یہ سورۃ غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی جب کہ زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سن چار ہجری ربیع الاول کے مہینے میں نازل ہوئی۔ اِس سورۃ کا آغاز اللہ کی پاکی بیان کرنے اور اللہ کے عزیز و حکیم ہونے کے ذکر سے ہوتا ہے۔

''اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور
زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔''

پھر آگے چل کر اللہ کے زبردست غلبہ اور حکمت کے آثار میں سے ایک قصہ مذکور ہے۔ مدینہ سے مشرقی جانب چند میل کے فاصلے پر یہودیوں کی ایک قوم رہتی تھی جس کو ''بنو نضیر'' کہتے تھے۔ یہ لوگ بہت بڑے سرمایہ دار اور طاقت والے تھے۔ اُنھیں اپنے مضبوط قلعوں پر بڑا فخر تھا۔ آپ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو شروع میں بنو نضیر نے آپ ﷺ سے صلح کا معاہدہ کرلیا کہ ہم آپ ﷺ کے مقابلہ میں کسی کی مدد نہیں کریں گے لیکن پھر وہ مکہ کے کفار سے بھی روابط قائم کرنے لگے حتیٰ کہ بنو نضیر کے ایک بڑے سردار کعب بن اشرف نے چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچ کر بیت اللہ کے سامنے مسلمانوں کے خلاف قریش سے عہد کرلیا۔ اُس کے چند ہی روز بعد آپ ﷺ کے حکم سے ایک صحابی محمد بن مسلمہؓ نے اُس غدار کا کام تمام کر دیا لیکن اِس کے باوجود بنو نضیر کی طرف سے بدعہدی کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ مختلف سازشیں بُنتے رہے۔ کبھی دغابازی سے آپ ﷺ کو چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ بلا کر اچانک قتل کرنا چاہا تو کبھی آپ ﷺ کو کہیں تشریف فرما دیکھ کر اُوپر سے بھاری چکی کا پاٹ ڈال دیا۔ مگر ہر موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی۔

بنو نضیر کی مختلف سازشوں اور بدعہدی کی وجہ سے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو جمع فرمایا تاکہ بنو نضیر کی سازشوں کا قلع قمع کیا جاسکے۔ جب مسلمانوں نے نہایت تیزی اور ہوشیاری سے اُن کے قلعوں اور گھروں کا محاصرہ کرلیا تو یہودی مرعوب و خوف زدہ ہوگئے۔ عام لڑائی کی نوبت نہ آئی کیوں کہ بنو نضیر نے گھبرا کر صلح کی درخواست کی۔ آخر یہ طے پایا کہ اگر وہ مدینہ خالی کر دیں تو اُنھیں کچھ نہ کہا جائے گا۔ مزید یہ کہ وہ جو مال و اسباب اُٹھا کر لے جاسکتے ہیں، لے جائیں۔

اُن کے مکان، زمین اور باغ وغیرہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ زمین مالِ غنیمت کی طرح تقسیم نہ کرائی بلکہ آپ ﷺ کے اختیار پر رکھی۔ آپ ﷺ نے اکثر اراضی مہاجرین میں تقسیم فرما دی۔ یوں انصار کا خرچ خود بخود کم ہو گیا اور اِس سے مہاجرین و انصار دونوں کو فائدہ ہوا۔ آپ ﷺ اپنے گھر کا اور وارد و صادر کا سالانہ خرچ بھی اِسی سے لیتے تھے اور جو بچ رہتا اللہ کے رستے میں خرچ کر دیتے تھے۔ (بحوالہ تفسیر عثمانی)

سورہ حشر کی ایک Distinction (امتیاز) یہ ہے کہ یہ وہ واحد سورۃ ہے، جس میں رب تعالیٰ کے بہت سے اسماء الحسنٰی ایک ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ سورہ حشر کی آخری آیات کی بہت فضیلت ہے۔

اِس سورۃ میں مہاجرین و انصار کا ذکر بھی ہے۔ مدینہ منورہ میں انصار کے دو قبیلے بنی اوس و بنی خزرج آباد تھے جن کا Originally تعلق بنی اسد سے تھا جو یمن میں شدید سیلاب آنے کے بعد یمن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے تھے۔

عجیب بات ہے کہ یہودی اپنی کتب میں نبی آخر الزماں ﷺ کی تشریف آوری کی خوش خبری پڑھتے تھے۔ وہ اُس کا ذکر اور اقرار بھی بہت کھل کر کرتے تھے لیکن اِس کے باوجود وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بُنتے رہتے تھے۔ بنو نضیر کا قصہ اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہم اکثر کسی سورۃ کی تلاوت سے حاصل ہونے والے دُنیاوی فوائد جاننے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ یہاں اکثر بات ہوتی رہتی ہے کہ اِس طرح دُنیا تو شاید مل جائے لیکن علم اِس طرح نہیں ملتا۔ اِس کے برعکس اگر ہمیں علم مل جائے تو ہمارے پاس دُنیا از خود آنے لگتی ہے لیکن ہم بدقسمتی سے بجائے حصولِ علم کی کوشش کرنے کے دُنیا ہی کے متلاشی رہتے ہیں۔

یہ قانونِ فطرت ہے کہ انسان جتنا جس چیز کے پیچھے بھاگتا ہے، وہ اُتنی ہی اُس سے دُور بھاگتی ہے اور جتنا وہ کسی شے سے بے نیاز و بے پروا ہوتا ہے وہ اُتنی ہی اُس کے قریب آتی ہے۔ ہم دُنیا کے پیچھے جتنا بھاگیں گے یہ اُتنی ہی ہم سے دُور بھاگے گی اور جس قدر ہم دُنیا کو در کر کے علم کے پیچھے بھاگیں گے دُنیا اُسی قدر ہمارے تعاقب میں آئے گی۔

ایک صاحب کو کسی بزرگ کی خدمت میں 25, 30 سال ہو گئے اور وہ علم کے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انسان Independent ہونے لگتا ہے تو مرشد نے اُس صاحب کو Finishing touch دینے کے لیے کہا "آپ شہر سے دُور جنگل میں چلے جائیں اور ایسی جگہ جا بیٹھیں جہاں لکڑہارے یا کوئی دوسرا انسان آپ کو ڈسٹرب نہ کر پائے۔" وہ صاحب حسبِ حکم جنگل میں جا کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ کھانے پینے کا سامان کچھ دن بعد ختم ہو گیا۔ بھوک و پیاس تنگ کرنے لگی۔ لیکن وہ مجاہدے میں مصروف رہے۔ مرشد نے کہا تھا کہ جب آپ چالیس روز پورے کر کے واپس آ رہے ہوں گے تو جنگل سے نکلتے ہی ایک آدمی ملے گا اور پوچھے گا کہ آپ کو کیا چاہیے۔ وہ جتنا بھی لالچ دے آپ نے بس ایک ہی بات پر اصرار کرنا ہے کہ "مجھے علم چاہیے۔"

بھوک پیاس کے ساتھ چالیس دن پورے کرنے کے بعد جب وہ صاحب جنگل سے نکلے تو اُنھیں وہاں ایک آدمی نظر آیا جس نے کہا "تمھاری عبادات قبول ہو گئیں، تمھیں کیا انعام چاہیے؟" وہ صاحب بولے "مجھے علم چاہیے۔" وہ آدمی بولا "تمھاری ہڈیوں پر فاقے کی وجہ سے کھال منڈھی ہے۔ پیاس کی وجہ سے تمھاری زبان چمڑے کے ٹکڑے جیسی ہو گئی ہے۔ ہونٹ پھٹ گئے ہیں۔ علم سے نہ تمھاری بھوک مٹے گی نہ پیاس بجھے گی۔ تم کوئی ایسی چیز لے لو کہ جس سے ذرا Comfortable ہو جاؤ۔" لیکن اُن صاحب نے علم لینے پر ہی اصرار کیا۔ اُس آدمی نے کچھ دیر حجت کرنے کے بعد بالآخر اُنھیں علم دے دیا۔

وہ صاحب علم لے کر وہاں سے چل دیے۔ چلتے چلتے جس بستی میں شام ہوئی وہاں کے لوگوں کو اُنھوں نے دستور کے مطابق کہا کہ میں یہاں مسافر ہوں اور رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔ بستی والوں نے اُنھیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا اور کھانا پیش کیا۔ رات کو یہ صاحب جب مصروفِ عبادت تھے تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ جیسے باہر بھگدڑ مچی ہے اور رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ باہر نکل کر وجہ دریافت کی تو پتا چلا کہ بستی کے سردار کا اکلوتا بیٹا آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اُن صاحب نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں اور پھر کہا "وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کے ہر گھر کے باہر جو فلاں جڑی بوٹی ہے، اُس کے پتوں کا رس نکال کر بچے کے منہ میں ٹپکا دیں۔"

لوگوں نے سردار کو جا کر نسخہ بتایا۔ سردار نے سوچا کہ بچہ ہاتھ سے تو نکلا ہی جا رہا ہے، اِس نسخے کو آزمانے میں کیا حرج ہے۔ اُنھوں نے اُن جڑی بوٹیوں کا رس نچوڑ کر بچے کے منہ میں ٹپکایا تو صبح تک اُس کی حالت سنبھل گئی۔

سردار خود چل کر اُن صاحب کے پاس شکریہ ادا کرنے گیا اور کہا کہ آپ میرے محسن ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ تین روز تک ہمارے ہاں قیام کریں۔ وہ صاحب مان گئے۔ دورانِ قیام دشمن نے سردار کے قبیلے پر حملہ کر دیا۔ اُن صاحب نے دیکھا کہ سردار کا قبیلہ قدرے دب رہا ہے تو اُنھوں نے سردار سے کہا "اگر آپ فلاں چال چلیں تو آپ کا قبیلہ فتح پا لے گا" اور وہی ہوا۔ وہ چال آزمانے کے بعد اُنھوں نے دشمن قبیلے کو شکست دے دی۔

اگلے دن سردار نے سب لوگوں کے سامنے اُن صاحب کی صلاحیتوں اور فہم و فراست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "ہمارے اِس مہمان کی عقل و دانش چونکہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور میں Genuinely یہ Feel کرتا ہوں کہ اِس قبیلے کا سردار ہونے کا حق اِن کا ہے۔ اِس لیے میں رضاکارانہ طور پر قبیلے کی سربراہی سے دستبردار ہوتا ہوں اور آج سے ہمارے یہ مہمان اِس قبیلے کے سردار ہیں۔" تب اُن بزرگ کو اپنے مرشد کی بات یاد آئی کہ تم علم پر اصرار کرنا اور جب اُنھوں نے ایسا کیا تو اُنھیں علم بھی مل گیا اور دُنیا بھی۔

ہم دُنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہیں آتی۔ ہم دُنیا کے بجائے رب کے پیچھے بھاگیں تا کہ رب حاصل ہو جائے۔ جب ہم رب کی دوستی کے پیچھے بھاگتے ہیں تو رب راضی ہو کر ہمیں علم عطا کر دیتا ہے۔ جب علم ملتا ہے تو دُنیا بھی حاصل ہو جاتی ہے، عزت بھی مل جاتی ہے اور آخرت بھی سنور جاتی ہے۔

میرے خیال میں ہم قرآن پاک کے نزول کے صحیح مقصد کو سمجھیں جسے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کو رکھنا باعث برکت، پڑھنا باعثِ ثواب اور اس پر عمل کرنا باعثِ نجات ہے۔

ہم قرآن کو سمجھنے کے لیے پڑھیں اور اِس لیے سمجھیں تاکہ ہم اِس پر عمل کر کے نجات حاصل کر لیں اور آخرت بہتر بنا لیں۔ قرآن سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کی زندگی کا بغور مطالعہ کریں اور اُس پر عمل کریں۔ اِس طرح قرآن پاک کو سمجھنا اور اِس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا کیوں کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔

سوال: رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے ذکر پر آنسوؤں کا بہت بہنا رُوحانیت میں کیا معنی رکھتا ہے؟

جواب: بھائی! اللہ اور آپ ﷺ کے ذکر پر اگر آنسو خود بخود بہنے لگیں (ایسے آنسو نہیں جو دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے ہوں) تو یہ بہت مبارک آنسو ہیں اور اِس بات کا ثبوت ہیں کہ رقت طاری ہونے والے شخص کے دل میں رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کی محبت بھری ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ فقیر کبھی مصیبت میں آنسو نہیں بہاتا اور نہ ہی یہ آنسو مبارک ہوتے ہیں۔

سوال: آپ کے لیکچرز سننے کے بعد معلوم ہوا کہ رُوحانیت کی راہ کی پہلی اسٹیج میں انسان جنات کو دیکھنے لگتا ہے۔ کیا یہ اِس راہ کی لازمی شرط ہے؟

جواب: اِس اسٹیج پر پہنچنے کے لیے ایک پہلی شرط بھی ہے جس پر زور دیں تو شاید مسائل حل ہو جائیں اور وہ یہ ہے کہ ہم سنت کے عین مطابق اپنے مسلمان بھائیوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکلیف اور جبر کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیں۔ ہم دوسروں کے لیے بڑی خوشی سے تکلیف اور دُکھ اُٹھا لیں۔ زیادہ زور اِن باتوں پر دیجیے۔

ہمارے معاملات اِس لیے نہیں سنورتے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے لگائے گئے پیڑ کے پھل میں کیڑا لگ گیا ہے تو ہم درختوں کی جڑوں میں Pesticide چھڑکنے کے بجائے اُن کی ٹہنیاں کاٹنے اور پتے جھاڑنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگلے سال بھی پودے کے پھل میں کیڑا لگا ہوتا ہے۔

اگر ہم شروع میں ہی درخت کی جڑوں میں Pesticide سپرے کر دیں تو اگلے سال پھل میں کیڑا نہیں ہوگا۔ یہ سوچنے کے بجائے کہ میں ایم اے کروں گا تو نوکری مل جائے گی، عملی قدم اُٹھاتے ہوئے مجھے کلاس ون میں داخلہ لے لینا چاہیے۔

ہم بنیادی چیزوں کی طرف توجہ دیے بغیر آگے بھاگنے لگتے ہیں۔ جب مسائل حل کرنے کی باری آتی ہے تو وہاں بھی ہم بنیادوں کی اِصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جو مسئلہ آج سامنے آیا ہے وہ پیدا کہاں سے ہوا تھا۔ اگر اُس مسئلے کی وجوہات دُور کر لیں تو آج پیدا ہونے والے مسئلے سے بھی چھٹکارا مل جائے گا اور آئندہ بھی ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ ہم جڑوں پر نظر رکھیں نہ کہ پھل پر۔

یہ فکر نہ کریں کہ رُوحانیت کی راہ پر چلتے چلتے جب جنات کی اسٹیج آتی ہے تو انسان کیسے Behave کرتا ہے، اُس کے Reactions کیسے ہوتے ہیں؟ وہ کیا سوچتا ہے؟ اِس کے بجائے اِس راہ پر عملی قدم بڑھائیے اور پھر سوچیے کہ میں اِس اسٹیج پر پہنچ کر خود دیکھوں گا کہ ہوتا کیا ہے؟ یہ سوچ آپ کی لگن میں اضافہ کرے گی۔

آپ کے سوال کا جواب دے دوں۔ ایسی چیزیں جو عام آدمی کی نظر سے پوشیدہ ہیں، رُوحانیت کی ایک اسٹیج پر پہنچنے کے بعد وہ پوشیدہ چیزیں کسی حد تک دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اِسرارِ قدرت کا ایک بہت ہی حقیر سا حصہ انسانی آنکھ دیکھنے لگتی ہے۔ جنات بھی پوشیدہ مخلوق کے زمرے میں آتے ہیں۔ اِس لیے انسان اُنھیں دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن ہم اِس راہ پر چلنے کا آغاز تو کریں۔ اِس راہ میں ہمیں کیا کیا کرنا ہوگا۔ Positive thinking رکھیں۔ کم از کم فرض عبادات پوری ادا کریں اور نیکی کی راہ پر چلیں۔ اِن تینوں چیزوں کو Combine کرنے کے بعد ہماری رُوح کی پرواز شروع ہو جائے گی۔

جتنا اِن چیزوں پر عمل کرتے جائیں گے اُتنی ہی پرواز بلند ہوتی جائے گی۔

رُوحانیت کے دو قدم

مومن کے مثبت اور منفی دونوں خیالات سے فائدہ پہنچتا ہے۔

ہم اکثر بات کرتے ہیں کہ انسان کو اپنے خیالات مثبت رکھنے چاہییں۔ رُوحانی ترقی میں مثبت خیالات صالح اعمال کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں اور نیکی کی طرف لے جاتے ہیں۔

مومن کی تعریف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یوں بیان فرمائی:

''مومن وہ ہے جس کو نہ کسی چیز کے ملنے کی خوشی ہو اور نہ کھونے کا غم۔''

انسان مومن کے درجہ پر تب فائز ہوتا ہے جب اُس کے دل سے دُنیا کی محبت اِس قدر نکل جائے کہ نہ اُسے کسی شے کے پانے سے خوشی ہو نہ کسی چیز کے کھونے پر دُکھ کا احساس ہو۔

اِس مقام تک کا سفر طے کرنے کے لیے انسان مثبت خیالات کے ذریعے رُوحانیت کو بنیاد فراہم کرتا ہے کیوں کہ Positive thinking انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ عبادات کے ذریعے پارسائی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ Positive thinking، عبادات اور نیکی کو اکٹھا کر لیتا ہے تو اُس کی رُوح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور مسلمان سے مومن تک کا سفر طے کرنا آسان ہو جاتا ہے

جب انسان مومن کے مقام پر آ جاتا ہے تو پھر اُسے اچھے یا بُرے خیالات سے فرق نہیں پڑتا کیوں کہ جب مومن کو دُکھ یا تکلیف پہنچتی ہے یا اِس کا کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ اُس پر صبر کرتا ہے۔ صبر کے انعامات براہِ راست اُس کی رُوح کو بالیدہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ انعامات اُس کی رُوح کی غذا ہوتے ہیں۔

جب مومن خوش اور خوش حال ہوتا ہے تو وہ رب کا شکر ادا کرتا ہے۔ تب اُس کا نام شکر گزار بندوں کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے جو کہ بذاتِ خود بہت بڑا انعام ہے۔ On top of that شکر گزاری کے نتیجے میں نعمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ یوں مومن کے دونوں رویوں کے نتائج اُس کے رب کی طرف سے اُس کے لیے انعام ہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ کسی مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے کسی کی تقلید کرتا چلا جائے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اِس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں ''تقلید کریں لیکن یہ غور بھی ضرور کریں کہ ایسا کیوں کیا؟ کیسے کیا؟ اِس کے فوائد و نقصانات کیا ہیں؟'' اِس بات کو ایک مثال کے ذریعے اُنھوں نے

سمجھایا کہ ''اگر کسی شخص پر قرآن پاک کے بہت سے نسخے لاد دیے جائیں، وہ اُنھیں عمر بھر بھی اُٹھائے پھرے، علمِ قرآن سے واقف نہیں ہو سکتا۔''

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور بڑی اعلیٰ مثال دی۔ ایک مزدُور کو اُس کا پرانا واقف کار ملا اور دیکھا کہ مزدُور جو کبھی بہت صحت مند ہوا کرتا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا ہے۔ وجہ پوچھی تو مزدُور بولا ''مجھے دیسی گھی نے اِس حال کو پہنچا دیا۔'' واقف کار حیرت سے کہنے لگا ''دیسی گھی تو بہت صحت بخش ہوتا ہے۔ اُس نے تمھیں کیسے اِس حال کو پہنچا دیا۔'' مزدُور بولا ''دراصل مجھے مزدُوری ہی یہ ملی ہے کہ دن بھر دیسی گھی سر پر اُٹھا کر ایک سے دوسری جگہ پہنچاتا رہوں۔ وزن اُٹھانے کی اِس مشقت کی وجہ سے میری صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔'' مقصد یہ ہے کہ انسان بغیر تحقیق اور غور و فکر کے اگر تقلید کرتا ہے تو اُس کا حال گھی کا کنستر اُٹھا اُٹھا کر کمزور ہونے والے مزدُور جیسا ہو جاتا ہے۔

کسی کی تقلید کرنے سے پہلے ہم ضرور سوچیں کہ اِس تقلید کی وجہ کیا ہے۔ اِس تقلید کے فوائد و نقصانات کیا ہو سکتے ہیں؟ ہم کسی شخص کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے اُس مقام پر جا پہنچیں گے جہاں وہ گیا تھا۔ لیکن ہم اُن قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے ہوئے اگر غور و فکر کرتے رہیں کہ اُس شخص نے یہ راستہ کیوں منتخب کیا؟ اُسے اِس راستے پر کتنا وقت لگا؟ اُس نے اِس راہ میں کتنی تکلیفیں اُٹھائیں؟ اُسے کیا فائدہ یا نقصان ہوا؟ اُس نے اِس راستے کا سفر کیوں جاری رکھا؟ چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ اِس تمام غور و فکر کے بعد ہم جان پائیں گے کہ کیا چیز کیا ہے یعنی What is what!

ابھی بات ہو رہی تھی کہ مومن مصیبت پر صبر کرتا ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اِس ضمن میں ایک مثال دی ہے جس میں مجھے ایک اور مطلب بھی دکھائی دیتا ہے۔

ایک بیل گاڑی جس پر بوجھ لدا ہے، بیل اُس کو کھینچ رہے ہیں۔ زور سارا بیل لگا رہے ہیں اور بغیر کوئی آواز نکالے بڑی خاموشی سے بلا احتجاج گڈ (گاڑی) کو کھینچ رہے ہیں اور اُنھیں اِس کے بدلے چارہ اور پانی مل رہا ہے۔ جب بیل گاڑی کو کھینچتا ہے تو بیل گاڑی کے پہیوں سے آواز نکلتی ہے جیسے گڈ (چھکڑا) احتجاج کر رہا ہو۔ پڑاؤ کے وقت اُس چھکڑے کو کچھ نہیں ملتا لیکن بیلوں کو چارہ ملتا ہے۔

اِسی طرح مشکل کے وقت جو شخص ہائے ہائے کرتا اور لوگوں سے شکایت کرتا ہے کہ یہ کیا کر دیا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ......! اُس شخص کی مثال چھکڑے کی سی ہے جسے کچھ نہیں ملتا جب کہ بیل کو جو چارہ ملتا ہے جو شخص مصیبت کے وقت صبر کرتا ہے اُس کے لیے بہت بڑے انعامات ہیں اور سب سے بڑا انعام تو یہ ہے کہ رب اُس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

رُوحانیت کے حصول کا اگلا قدم یہ ہے کہ ہم سب سے بالخصوص اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لیے ایثار و قربانی اور درگزر سے کام لیں۔ اِس ایثار و قربانی میں عاجزی اور رازداری ضروری ہے کہ کسی کو کچھ پتا ہی نہ چل پائے کہ ہم نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ دوسروں کو یہی پتا ہو کہ یہ شخص کسی کے کام ہی نہیں آتا، کسی کا بھلا

کر ہی نہیں سکتا۔ ہم ان سب باتوں کو چپ چاپ سنتے رہیں اور اندر ہی اندر راز داری سے دوسروں کی خدمت کرتے رہیں۔

انسانی فطرت کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے کہ انسان اُس کا بھلا چاہے جس نے اُس کی جڑیں کاٹی ہوں، اُس کے خلاف سازشیں کی ہوں، نقصان پہنچایا ہو اور بھلا بھی اِس انداز سے کہ کسی کو اُس کا پتا نہ چلے۔

ہمارا ایک رویہ بڑا عجیب ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں، مشکل میں اُن کے کام آتے ہیں، لیکن جیب سے پیسے نکال کر دیتے ہوئے ضرورت مند کو لیکچر دینا نہیں بھولتے کہ شرم کرو، تم کام کیوں نہیں کرتے۔

یہ رویہ درست نہیں۔ رب نے مال و رزق دیتے وقت کبھی ہم سے یہ نہیں کہا کہ تم تو میرے سرکش بندے ہو، میری بات ہی نہیں مانتے۔ ہر وہ کام کرتے ہو جس سے میں نے منع کیا ہے۔ یہ کام کرنا چھوڑ دو پھر میں تمھیں رزق دوں گا۔ رب ایسا نہیں کرتا۔

رب تو دیتے وقت یہ تک نہیں دیکھتا کہ اس کے دیے ہوئے رزق کو ہم نے کہاں خرچ کیا، کسی Casino میں جا کر جوا کھیلنے میں اُڑا دیا یا شراب پی کر ضائع کر دیا۔

رب دیتا رہتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ دل کھول کر عطا کرتا رہتا ہے۔ یہ اُس کی شانِ ربوبیت ہے۔

ہماری سرکشی یا شکر گزاری کو دیکھے بغیر رب جو کچھ ہمیں دیتا ہے وہ سب رب کی ملکیت ہے۔ اُس کی ذاتی چیز ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے سب رب کا دیا ہوا ہے۔ ہمارا اپنا تو کچھ ہے ہی نہیں۔

ایک وزیر سے بادشاہ کسی بات پر سخت ناراض تھا۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اگر تم تین سوالوں کے جواب دے دو تو تمھاری جان کو امان مل جائے گی۔ اُن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ ''دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے؟'' جس کا جواب ایک درویش نے بتایا کہ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ احساس ملکیت ہے کہ فلاں چیز میری ہے، یہ چیز میری ہے، وہ چیز میری ہے۔

ہم تو اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے اُس کے دوسرے بندوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جب ہم رب کے دیے رزق سے اُس کے بندوں کی خدمت کر رہے ہیں تو پھر انھیں کچھ دیتے وقت کسی بھی قسم کی نصیحت یا ڈانٹ کیسی! ہمیں تو بہت عاجزی کے ساتھ دوسروں کی خدمت میں چیز پیش کر دینی چاہیے حتیٰ کہ دیتے وقت ہم منہ دوسری طرف کر لیں تا کہ ہمیں دیتے ہوئے اور ضرورت مند کو لیتے ہوئے شرم نہ آئے۔ اور پھر اُس دینے کو یوں بھلا دیا جائے گویا کہ کبھی یہ واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔

جب ہم یہ دونوں قدم اُٹھا لیتے ہیں تو رُوحانیت کا سفر تیزی سے جاری ہو جاتا ہے۔

عبادات ہم پر فرض ہیں وہ کی جانی چاہییں۔ Positive thinking، نیکی کی راہ، ہر حال میں شکر گزاری، مصیبت پر صبر، تقلید کے دوران غور و فکر، دوسروں کی خاموشی و راز داری سے مدد، سب کے لیے ایثار و قربانی اور درگزر کا رویہ...... جب ہم ان سب باتوں پر عمل کرتے ہیں تو ہم اندر سے خود بخود تبدیل ہونے لگتے

ہیں۔ اور اگر ہم آپ ﷺ کی سنت سمجھ کر دوسروں کی مدد کریں گے کہ آپ ﷺ کے پاس جو بھی سوال لے کر آیا کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹا تو ہمیں سنت پر عمل کرنے کا بھی ثواب مل جائے گا۔

رُوحانیت صرف وظائف و تسبیحات کا نام نہیں ہے۔ سنت کے مطابق اپنے رویوں، عادات اور طور طریقوں کو ڈھال کر ہی ہم رُوحانیت حاصل کر سکتے ہیں۔ سو فی صد سنت پر عمل کرنا تو بس میں نہیں لیکن جب ہم حتی المقدور سنت پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ عبادات کرتے اور اپنی سوچ کو پاکیزہ رکھتے ہیں تو رُوحانیت حاصل ہونے لگتی ہے۔

ایک ولی اللہ ایک ایسی کم گنجان آبادی میں رہتے تھے جہاں حشرات الارض اور سانپ وغیرہ بہت زیادہ تھے۔ مریدین یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ اُن ولی اللہ کے سامنے آ کر سانپ بھی بے ضرر کینچوا بن جاتا تھا۔ ایک روز مریدین نے اس کی وجہ پوچھی تو ولی اللہ نے بہت خوب صورت جواب دیا۔ انھوں نے فرمایا ''جتنے بھی درندے، پرندے، حشرات الارض ہیں یہ جذبات کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ چوں کہ میرے دل میں ان کے لیے محبت ہے کیوں کہ یہ بھی میرے اُسی رب کی مخلوق ہیں جس نے مجھے تخلیق کیا، اس لیے یہ میرے پیار کو سمجھتے اور پہچانتے ہیں اور پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں۔ اور وہ میرے دوست بن کر یہاں آتے ہیں۔''

جب ہم ہر ایک سے یہ سوچ کر محبت رکھتے ہیں کہ یہ ہمارے ہی خالق کی تخلیق ہیں تو ایسی محبت رنگ لاتی ہے۔ ہمارے جسم سے نکلنے والی Vibrations اور مقناطیسی لہریں Positive اثرات مرتب کرتی ہیں اور دوسرے کے دل میں ہمارے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ فقیر دشمن سے بھی پیار کرتا ہے، اُسے بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ یہ سب رُوحانیت کی Requirements ہیں۔ اِنھیں پورا کیے بغیر رُوحانیت میں کہیں پہنچنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص اِن Requirements کو پورا کیے بغیر کہتا ہے کہ میں نے فلاں چیز دیکھی، فلاں اسرارِ قدرت کا مشاہدہ کیا تو یہ حقیقت نہیں بلکہ Hallucination (واہمہ) ہے جو اُس کا ذہن اُسے دکھاتا ہے۔

رُوحانیت حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنے رویے کو بہتر کرنا ہوگا، خلق خدا سے پیار کرنا ہوگا، اِنتقام کے جذبے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہوگا اور غصہ دل سے نہیں اُوپر اُوپر سے کرنا ہوگا وہ بھی اس لیے کہ بعض اوقات دوسروں کی اصلاح کے لیے تھوڑا غصہ دکھانا پڑتا ہے۔ نفع و نقصان کا احساس دل سے نکالنا ہوگا۔

ہم اکثر ''قلندر'' یا ''قلندریہ سلسلہ'' کی رمز سنتے ہیں۔ قلندر دراصل ایک رویے کا نام ہے۔ قلندر اعظم حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اُن کی زندگی ایسی تھی کہ میرا سب کچھ میرے رب کا ہے۔ میرا سب کچھ میرے رب کے سپرد ہے۔ میرا رب جو کرتا ہے وہ سب صحیح، باقی سب غلط۔

جو لوگ رُوحانیت میں یہ رویہ اپنا لیتے ہیں اُنھیں قلندر کہا جاتا ہے۔ دُنیا میں ڈھائی قلندر ہوئے ہیں۔

1۔ حضرت شرف الدین بو علی قلندر صاحب

2۔ حضرت لعل شہباز قلندر صاحب

3۔ بی بی رابعہ بصری صاحبہ

یہ سب اپنے قلندرانہ رویوں میں بہت آگے چلے گئے۔ قلندر کے صحیح مقام پر تو صرف ایک ہی ہستی پہنچی حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کیوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تربیت آپ ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ اِس تربیت کا اعجاز ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہمیں فہم و فراست، علم اور توکل کے اُس مقام پر دکھائی دیتے ہیں جو قلندر کا مقام ہے۔ قلندر، غوث یا قطب کی مانند کوئی رُوحانی مقام نہیں۔ یہ رویے کا نام ہے جسے اپنانا واقعی بہت دشوار ہے۔ بہت کم لوگ اِس رویے پر مکمل طور پر قائم ہو سکیں گے اور جو اِس پر قائم ہو گئے، دُنیا بھی اُن کی اور آخرت بھی اُن کی۔ اُنھیں رب تعالیٰ سب کچھ عطا کر دیتا ہے۔

سوال: ملک کی موجودہ صورت حال سے سب اہلِ دل پریشان ہیں۔ آپ فقیر ہیں، ہمیں بتائیے کہ ہم کیسے اِس مشکل سے نکل سکتے ہیں؟ ہم کیا کریں؟

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دُعا یاد نہیں

جواب: میں ایک سچ بیان کر دوں کہ میں پڑھا لکھا انسان نہیں۔ حکومت کرنے کے طور طریقوں سے قطعی نابلد ہوں۔ فقیری، حکومتی عہدوں سے کہیں بلند تر ہے۔ اگر مجھے حکومت کرنے کے طریقے نہیں آتے تو فقیری کہاں سے آئے گی۔

البتہ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ رب نے فرمایا ہے کہ مجھ سے اچھے گمان رکھو، میں اچھا کروں گا۔ اِس لیے میں رب سے اچھے گمان رکھتا ہوں۔ پاکستان کے بارے میں بھی میرا رب سے یہی گمان ہے کہ وہ اسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔

آپ نے پوچھا کہ ہم کیا کریں؟

سب سے پہلے تو آپ ''ہم'' کو ''میں'' میں بدل دیجیے۔ جب تک انسان ہم کے چکر میں رہتا ہے درست نہیں ہو پاتا لیکن جب ''ہم'' کو ''میں'' سے Replace کر دیتا ہے تو حالات سدھرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ''ہم'' کیا کریں کا جواب تو شاید میں نہ دے سکوں لیکن ''میں'' کیا کروں کا جواب دے سکتا ہوں۔ مجھ پر لازم ہے کہ اپنے رویوں کو درست رکھوں۔ زبان سے بلا تحقیق کوئی بات نہ نکالوں۔ جب میری زبان سے کوئی بات ادا ہو تو پہلے اُسے حق کے ترازو پر تولوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی جذبے سے مغلوب ہو کر میں کسی کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہوں۔ فقیر خواہ اپنی اولاد کے لیے فیصلہ کر رہا ہو یا کسی اجنبی کے لیے تو تب وہ ہمیشہ اپنی ذات سے باہر نکل جاتا ہے۔ ذات سے باہر نکلے بغیر صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ فقیر کہے ہاں، یہ کام میرے بیٹے نے کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ قصور میرے بیٹے کا ہے لیکن میں اِس کے ساتھ باپ کی حیثیت سے کھڑا ہوں گا۔ فقیر حق کی بات کرے گا۔ بیٹے کے خلاف فیصلہ بھی سنا دے گا کہ میرے بیٹے نے قتل کیا، یہ واجب القتل ہے۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ وہ بحیثیت باپ اپنے مجرم بیٹے کے ساتھ کھڑا نہ ہو۔ ہاں البتہ فیصلہ سنانے کے بعد وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ بیٹے کی جگہ میں خود کو پیش کرتا ہوں۔ قصاص

کے طور پر میرے بیٹے کی جگہ میری جان لے لیں۔

جب ہم کسی کے بارے میں بات کریں تو اپنی تمام جذباتی وابستگی، وفاداری اور محبت سے بالاتر ہو کر حق کی بات کریں۔

کسی زمانے میں یہاں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں ''نوائے وقت'' میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''اصلاحِ معاشرہ کا ایک نکاتی منشور...... گواہی۔'' جس میں میں نے یہی عرض کیا تھا کہ جس روز ہم نے اپنی گواہی درست کر لی تو معاشرہ سدھرنا شروع ہو جائے گا۔

گواہی صرف وہ نہیں ہوتی جو عدالت میں دی جاتی ہے۔ جب ہم کسی کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں تو درحقیقت ہم اُس کے بارے میں گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔

جب میں کہتا ہوں کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے تو یہ میں اُس شخص کے بارے میں بہت بڑی گواہی دے رہا ہوں جس کے لیے میرا مواخذہ ہو سکتا ہے۔ جب میں کہتا ہوں فلاں غلط ہے، اُس نے کرپشن کی ہے تو یہ میں گواہی دے رہا ہوں جس کے لیے مجھے دُنیا و آخرت میں جواب دینا ہے۔

اگر ہم اپنی گواہی درست کر لیں، ہماری گواہی حق اور سچ پر مبنی ہو جائے تو ہمارے بہت سے معاملات سدھر جائیں گے۔ معاشرہ بہتر ہو جائے گا۔ آپ نے آخر میں فرمایا

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دُعا یاد نہیں

بھائی! آپ سب اچھے اور بھلے لوگ ہیں۔ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا سکتے ہیں۔ ضرور دُعا کیجیے کہ رب دُعائیں سننے والا ہے۔ وہ تو اُن کی دُعائیں بھی سنتا ہے جو اُسے مانتے ہی نہیں۔ اُن کی بھی سنتا ہے جو میری طرح گناہ گار ہیں۔ رب نیک لوگوں کی دُعائیں بھی سنتا ہے۔ کوئی بھی اُس سے مانگے وہ سب کو عطا کرتا چلا جاتا ہے، بھلا کون ہے اُس کے سوا جو مضطرب دل کی پکار سُنے......!

اللہ کا نور اور حجابات

سورہ النور کی آیت نمبر 35 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اُس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے جو نہ پورب کا نہ پچھم کا قریب ہے اُس کا تیل بھڑک اُٹھے اگر چہ اُسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''

یہاں اصل میں رب تعالیٰ نے ایک ایسی چیز بیان کی جس کا ذکر عام کتب میں نہیں ملتا۔ جہاں رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اُس کے نور نے زمین و آسمان کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، وہیں اُس نے اس چیز کو بھی ظاہر کر دیا کہ کسی شخص میں یہ استعداد اور سکت نہیں ہے کہ وہ اللہ کے نور کو براہِ راست برداشت کر پائے۔

نور اگر چہ ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن جس طرح برف کی ڈلی آدھے منٹ کے لیے ہتھیلی پر رکھیں تو شروع میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے پھر جلن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ نور کی ٹھنڈک اگر چہ Exactly ویسے نہیں لیکن یہ مثال دینے کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ نور سے انسان کیسے بھسم ہو جائیں گے یا پہاڑ کیسے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ نور کی ٹھنڈک کا کبھی بالواسطہ یا بلاواسطہ تجربہ ہو تو اُس کی تاب ہم نہیں لا پاتے۔

سورہ النور میں جو مثال دی گئی ہے کہ طاق، چراغ، شیشہ، تارہ۔ اس سے اصل میں یہ Show ہو رہا ہے کہ انسان اور اللہ کے نور کے درمیان واسطے ہیں تا کہ وہ نور قابلِ برداشت ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رب کے نور کے گرد 700 حجابات یا پردے ہیں۔ انسان کا واسطہ نور کے 700 ویں حجاب سے پڑتا ہے۔ مجھ جیسا گناہ گار انسان تو 699 پردوں سے چھن کر آنے والے نور کی تاب نہیں لا سکتا تو ڈائریکٹ نور کو کیسے سہے گا۔

البتہ اللہ کے ایسے نیک بندے موجود ہیں جو رب کی اطاعت، عبادت اور ذکر کرتے کرتے رب کی طرف سے انعامات پانے لگتے ہیں اور اُس نور کے قریب ہونے لگتے ہیں۔ اُن بندوں اور اللہ کے نور کے درمیان جو 700 پردے، Filters یا Screens ہیں وہ کم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ وہ Screens کتنی کم ہو جائیں گی کیوں کہ اس کا انحصار بندگی کے معیار پر ہے۔

یہ شرف صرف آپ ﷺ کو حاصل ہوا کہ اللہ اور آپ ﷺ کے درمیان شبِ معراج صرف ایک

مہین سا پردہ تھا۔ یہ نور کا پردہ تھا۔ 699 پردے اُٹھ گئے تھے۔

تمام پیغمبر جلیل القدر، واجب الاحترام اور بہت بلند مقام پر ہیں لیکن تمام پیغمبروں میں سے بھی کوئی یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ آپ ﷺ کے سوا تمام پیغمبروں اور اللہ کے نور کے درمیان حجابات قائم رہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ بندگی کے اُس مقام پر چلے گئے کہ اللہ اور آپ ﷺ کے درمیان نور کا صرف ایک پردہ رہ گیا، 699 حجابات اُٹھ گئے۔

اس میں غور کرنے کی جو بات ہے وہ ہے ''بندگی''۔ بندگی اللہ کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے حکم کی نہایت خوش دلی سے Under all circumstances تعمیل کا نام ہے۔

ان احکامات میں عبادات بھی ہے، حقوق العباد بھی اور Intellectual honesty بھی۔ ان تینوں کو اپنانے کے بعد انسان بندگی کی راہ پر نکلتا ہے۔ رب کی بندگی ہمیشہ غیر مشروط ہوتی ہے۔ انسان جب تک Unconditional surrender میں نہیں جاتا، بندگی نہیں کر سکتا۔

اہلِ فقر اپنی زندگی میں صرف تسبیحات پر ہی زور نہیں دیا کرتے تھے بلکہ ان کا Major emphasis خدمتِ خلق پر ہوتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ بہتر Dealings کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ فرض عبادات اعلانیہ کرتے جب کہ نفلی عبادات رات کے اندھیرے میں تنہائی میں کیا کرتے تھے۔

میں بار بار کہتا ہوں کہ ہمیں اپنے ذہن سے نکالنا ہوگا کہ وظائف و تسبیحات سے رب ملے گا۔ ان سے رب نہیں ملتا، رب تو بندگی سے ملتا ہے۔ اُس کی غیر مشروط غلامی اور اُس کے سامنے غیر مشروط Surrender کیا جائے تو وہ ملتا ہے۔

آج کے زمانے میں، میں اور آپ تسبیحات پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ اس میں محنت کم ہے اور قربانی نہیں کرنا پڑتی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی احسن طریقے سے ادائیگی کرتے ہوئے قربانی کا رویہ اپنانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس تسبیح رولنے میں ہمیں نسبتاً فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے نہ قربانی دینا پڑتی ہے۔ بلکہ لوگ مجھے تسبیح کے دانے رولتے دیکھ کر میری عزت کرنے لگتے ہیں، مجھے سلام کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ہم اُس باریکی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ تسبیح کے پس پردہ چھپی یہ سوچ تکبر کو جنم دیتی ہے اور جہاں تکبر آیا وہاں وہ سب کچھ، ساری کمائی سیلاب کی طرح بہا لے گیا۔

دوسری طرف میں یہ رویہ رکھتا ہوں کہ اگر کوئی فقیر مجھ سے کچھ مانگ لے، میرا بھائی مجھ سے مدد طلب کر لے تو میں سنی ان سنی کر دیتا ہوں، کیوں کہ جیب سے پیسہ نکالنا میرے لیے مشکل ہے۔ اگر کوئی پاس بیٹھا شخص میری توجہ میرے اُس بھائی کی طرف مبذول کرا دے تو میں کہتا ہوں ''جناب! میں ضرور اس کی مدد کروں گا بشرطیکہ رب تعالیٰ مجھے وسیع رزق عطا فرما دے۔'' کوئی مجھے تاکید کرے کہ بھوکوں کو کھانا کھلا دیں تو میں کہوں گا کہ اگر رب مجھے وسیع رزق عطا فرما دے تو ضرور اُنھیں کھانا کھلا دوں گا۔ آپ میری توجہ پڑوسی کے مکان کی گری ہوئی چھت کی طرف دلائیں تو میں کہوں گا: ''میں ضرور اس کی مدد کر دیتا لیکن میرے پاس

کچھ ہے نہیں۔''

اِسی اگر مگر کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے کاہلوں کے بہانے کا نام دیا۔ اگر مگر کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔

اللہ کے بندے اِس اگر مگر میں نہیں پڑتے۔ جو رزق بھی اُنھیں رب تعالیٰ نے عطا فرمایا وہ اُسے دوسروں کے ساتھ Share کرلیتے ہیں۔ اگر اُن کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ اپنی بھوک ہی دوسروں کے ساتھ Share کرلیں گے۔ مثلاً ایک شخص کی بھوک دو روٹی کی ہے۔ روٹی ایک میسر آئی ہے۔ اب ایک روٹی کھا کر بھی بھوک تو رہے گی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اُس روٹی میں سے بھی آدھی دوسرے بھوکے کو دے دے گا۔ یوں اُس نے اپنی بھوک دوسرے کے ساتھ Share کرلی۔ یہ واقعی نیک لوگ ہیں، میری طرح ڈھونگی نہیں۔

اگر ہم اللہ کے نور کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارے اور رب کے درمیان موجود 700 پردوں میں سے کوئی ایک پردہ ہی ہٹ جائے تو اِس کا کوئی Short cut نہیں بلکہ ایک ہی حل ہے کہ ہم اللہ کی بندگی کرلیں۔

اگر مگر کے حوالے سے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت کچھ یوں ہے کہ ایک صاحب کو کرائے پر مکان درکار تھا لیکن کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک دوست سے ذکر کیا تو اُس نے کہا کہ ایک عالی شان حویلی میری نظر میں ہے، کرایہ بھی مناسب ہے۔ اگر تھوڑی سی مرمت کرالیں تو فوری وہاں رہائش اختیار کرسکتے ہیں۔ وہ صاحب بہت خوش خوش حویلی دیکھنے گئے تو وہاں ایک کھنڈر کو پایا۔ دوست نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ''اِس جگہ کسی زمانے میں ڈرائنگ روم اور یہاں لاؤنج ہوا کرتا تھا۔ اور یہ جو سامنے آدھی چھت والا کمرہ ہے اگر آپ اِس کی چھت تعمیر کرالیں تو بطور بیڈروم اِسے اِستعمال کرسکتے ہیں۔'' اُن صاحب نے کہا ''جناب! یہ اگر مگر آپ کو مبارک ہو۔ میں تو Practical انسان ہوں۔ دو کمرے کے چھوٹے سے مکان کو اِس عالی شان کھنڈر نما حویلی پر ترجیح دوں گا۔''

ہم بھی اگر مگر کے قصے میں نہ پڑیں کہ اگر میرے پاس کچھ ہو تو میں دوسروں کی مدد کروں۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہو خواہ کم ہی کیوں نہ ہو اُسی میں سے رب کے بندوں کی خدمت کرنے لگیں تو رب ہمارے رزق اور مال میں اِتنی زیادہ برکت عطا فرما دیتا ہے کہ ہمیں سمجھ ہی نہیں آتی کہ اِتنا رزق کہاں سے آرہا ہے۔

UK میں آفس کے کام کے سلسلے میں میرا واسطہ ایک شخص سے پڑا جس کے لمبے لمبے بال تھے۔ جینز کے اُوپر جو شرٹ اُس نے پہن رکھی تھی اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا شمار شاید اُن نوجوانوں میں ہوتا ہے جن کے جسم پر موجود لباس تب ہی تبدیل ہوتا ہے جب وہ چیتھڑوں میں بدل جاتا ہے۔ جب وہ مجھ سے قدرے قریب ہوئے تو پتا چلا کہ باوجود مسلمان ہونے کے وہ مذہب کے نام ہی سے چڑتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ جن سے اُن کی تجسس کی حس کو بڑی ہوا ملی اور وہ جاننے پر اصرار کرنے لگے

کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ ایک روز کسی پریشانی کی وجہ سے جب میری قوتِ برداشت قدرے کم ہو رہی تھی تو اُن کے اِس سوال پر میں بھڑک اُٹھا کہ آپ نے یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے کہ یہ کیا ہے، یہ کیا ہے! آپ کس کس چیز کا پوچھیں گے۔ یہ لیں، تب اُنھوں نے بیک وقت بہت سی چیزیں دیکھیں تو صحیح معنوں میں اِسلام کی طرف راغب ہو گئے۔ تب وہ کچھ کھلے اور میں جو سمجھ رہا تھا کہ وہ فیشن کے طور پر لمبے بال اور پھٹی جینز شرٹ پہنے رکھتے ہیں، اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ Bankrupt ہونے کی وجہ سے اُنھیں محض دس پونڈز میں مہینہ بھر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

یہ بات بھی اُن کی زبان سے اُس وقت پھسل گئی جب وہ مجھے بتا رہے تھے کہ شاہ صاحب! میں دین کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ اپنے ماضی کی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ''صاحب! اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ کو جہاں کوئی Homeless شخص نظر آئے اُسے کھانا کھلا دیا کریں۔'' کہنے لگے ''جناب! میں ضرور کھانا کھلا دوں لیکن میں تو خود صرف دس پونڈز میں پورا مہینہ گزارتا ہوں۔'' اُن کی یہ بات سُن کر نہایت بے وقوف انسان کی طرح بغیر سوچے سمجھے میں نے اُن سے کہا کہ آپ اُن دس پونڈز میں خود بھی گزارہ کریں اور اُسی میں سے کسی بھوکے کو کھانا بھی کھلایا کریں۔

کچھ عرصے بعد ہی میں نے دیکھا کہ وہ صاحب اچھے لباس میں رہنے لگے۔ پیدل چلنے کے بجائے ٹیوب میں سفر کرنے لگے۔ بغیر نوکری کیے دوسروں کی مالی مدد کرنے لگے۔ ایک روز مجھے کہنے لگے ''شاہ صاحب! لوگ بڑا شک کرتے ہیں کہ یہ جاب تو کرتا نہیں، پھر اِتنا کھلا خرچ کیسے کرتا ہے۔'' میں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ آپ برائے نام کوئی جاب کرلیں تاکہ لوگوں کو بتا سکیں کہ جاب کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔

چار پانچ سال بعد جب میں UK گیا تو وہ صاحب میرے پاس آئے۔ بہت خوش ہو کر ایک لیٹر مجھے دکھایا۔ میں نے پڑھا تو وہ Increment Letter تھا۔ ماہانہ 2500 پونڈز (پانچ لاکھ پاکستانی روپے) Increment اُنھیں دی گئی تھی۔ کہنے لگے ''میں پارٹ ٹائم جاب کرتا ہوں۔ آفس نہیں جاتا۔ گھر پر بیٹھ کر ہی ٹیلی فون پر کام کرلیتا ہوں جس کی یہ Increment کمپنی نے دی ہے۔'' ذرا غور کیجیے کہ رب تعالیٰ اُنھیں کس طرح وسیع رزق عطا فرما رہا تھا۔

جب ہم اللہ کے بندوں کی خدمت کرنے لگتے ہیں خاص طور پر ایسے بندوں کی جو مالی لحاظ سے بہت زیادہ خوش نصیب نہیں ہوتے تو اللہ ہمیں وسیع رزق سے نوازنے لگتا ہے۔ ہم بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں......وہ بے چارہ غریب ہے...... بھائی! وہ کیسے غریب ہے؟ نواز شریف صاحب اور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے سامنے سڑک پر بیٹھ کر بھیک مانگنے والا دونوں برابر ہیں۔ کیوں کہ اگر نواز شریف صاحب 400 ارب روپے کی ملکیت رکھتے ہیں تو وہ روپیہ اُنھیں رب کے در سے ہی ملا ہے۔ نواز شریف صاحب بھی رب کے در کے بھکاری ہیں اور جو سڑک کے کنارے بھیک مانگ رہا ہے اُسے بھی رب ہی عطا کرنے والا ہے۔ تو

ایک بھیک مانگنے والے کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ دوسرے بھیک مانگنے والے کو کہے کہ یہ بے چارہ غریب ہے۔ میں اور آپ ہم سب اللہ کے در کے بھکاری ہیں۔

ملکیت کا احساس دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے اِس لیے کہ جو چیز کسی کی ملکیت ہوتی ہے مرنے کے بعد وہ ساتھ جاتی ہے۔ انسان خالی ہاتھ اِس دُنیا میں آیا اور خالی ہاتھ ہی واپس چلا جاتا ہے۔ دُنیا میں سب چیزیں اُس کے اِستعمال کے لیے ہوتی ہیں۔ جیسے ہم کسی ہوٹل میں کمرہ لیتے ہیں تو اُس میں دُنیا بھر کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ ٹیلی فون، ٹی وی سکرین، انٹرنیٹ، سلیپرز، دیگر بہت سی چیزیں ہم اِستعمال کرتے ہیں اور واپسی پر ہم اُس ہوٹل کے کمرے کی کوئی چیز ایک پنسل تک ساتھ لے کر نہیں آتے۔ صرف وہی سامان واپس لے کر آتے ہیں جو ساتھ لائے تھے۔ اِسی طرح اِس دُنیا میں ہم خالی ہاتھ آئے تھے۔ رب تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور ہمیں بہت سی چیزیں عطا کیں تاکہ ہم بہتر زندگی گزار سکیں اور جب ہمارا واپسی کا بلاوا آ جاتا ہے تو خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں۔ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے، میں اِسے Own کرتا ہوں۔

سب اللہ کے در کے بھکاری ہیں۔ ایک کو رب نے بھیک میں وسیع رزق عطا فرما دیا جب کہ دوسرے کو وسیع رزق عطا نہیں فرمایا۔ لیکن یہ حق زیادہ رزق حاصل کرنے والے فقیر کو بھی نہیں کہ وہ دوسرے کو غریب کہہ دے کیوں کہ ہیں تو دونوں ہی بھکاری۔ اپنا تو کسی کے پاس بھی کچھ نہیں۔ پھر امیر و غریب کا سوال کیا؟ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔

The person is less fortunate as far as finances are concerned.

جو بندہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے Less fortunate بندوں کی خدمت کرتا ہے اللہ اُس کا رزق بڑھا دیتا ہے۔ اُسے غیب سے رزق ملنے لگتا ہے۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آتی کہ کہاں کہاں سے رزق آ رہا ہے۔

اِس کے ساتھ ساتھ میں اور آپ بہت بڑا جُرم کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ ہماری بہت سی ضروریات پوری کرتا ہے۔ وہ صبح سے شام تک ہمیں عطا کرتا رہتا ہے۔ پورے مہینے میں ایک چیز ہمیں عطا نہیں ہوتی تو ہم لاکھوں عطا ہونے والی چیزیں بھول جاتے ہیں۔ عطا نہ ہونے والی ایک چیز کے لیے جگہ جگہ بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں میرے لیے دُعا کر دیں مجھے یہ چیز مل جائے۔

اگر ہم اپنے اِس رویے کو گہرائی سے دیکھیں تو ہمیں احساس ہو گا کہ یوں ہم ناشکری کے مقام پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ناشکرگزاری اور رب کا شکوہ ہے کہ ہم خود پر ہونے والی بے پناہ نوازشات کا ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ عطا نہ ہونے والی کسی ایک چیز کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ جب ہم لوگوں کے پاس جا کر کہتے ہیں رب نے یہ نہیں دیا، رب نے یہ کام نہیں کیا تو ہم دراصل رب کے بندوں کے سامنے رب تعالیٰ کا شکوہ کر رہے ہوتے ہیں جو ہمیں سزاوار نہیں ہے۔ رب کا فرمان ہے:

''اگر احسان مانو گے تو میں تمھیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔'' (ابراہیم: 7)

نعمتوں کی شکرگزاری کا بہترین انداز عملی شکرگزاری ہے۔ زبانی شکرگزاری کے بجائے ہم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کے ذریعے اُس کے بندوں کی خدمت کرتے رہیں۔ اِس طرح ہمیں یہ بات یاد رہے گی کہ یہ چیز میری نہیں ہے۔ میرے رب کی ملکیت ہے۔ یہ میرے رب نے عطا کی ہے۔ میں نے خود اِسے حاصل نہیں کیا۔

خاص طور پر جب ہم اپنے مخالفین کے کام آتے ہیں تو نعمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ہمارا وہ رویہ اِس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے میرے رب کا ہے۔ اِس پر رب کے سب بندوں کا حق ہے۔ خواہ وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: جب فقیر کے احباب میں حکمران بھی ہوں اور اُن کے دور میں 14 بے گناہ افراد قتل کر دیے جائیں تو کیا فقیر کا فرض نہیں کہ وہ حکمرانوں کو سمجھائے کہ حکومت چھوڑ کر مقدمے کا سامنا کریں؟

جواب: صاحب! پہلی بات، اگر کوئی فقیر ہے تو اُس کے احباب میں حکمران شامل نہیں ہوتے۔ اِس لیے پہلے یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اُس کے در پر آنے والے حکمران اُس کے احباب ہیں یا دوسروں کی طرح دُعا کرانے والے۔

دوسری بات، فقیر سنت پر عمل کرتا ہے، ڈنڈا اِستعمال نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کو اپنے کردار سے رب کی طرف بلاتا ہے۔ یہی سنت ہے۔

تیسری بات، اگر جبر سے کام لیا جائے تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جبر سے لوگ دُور بھاگتے ہیں۔ اگر حکمرانوں میں فقیر کے پاس آنے سے رفتہ رفتہ کوئی تبدیلی آ رہی ہے تو جبر سے وہ تبدیلی بھی جاتی رہے گی۔

فقیر کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ ایک ریڑھی فروش ہو یا صدر۔ فقیر دونوں کو ایک ہی طرح سے Treat کرتا ہے بلکہ وہ ریڑھی والے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ حکمران سے یہ کہہ کر کہ آپ کو تو سلام کرنے والے بہت ہیں لیکن اِسے میرے علاوہ کوئی سلام کرنے والا نہیں۔

سوال: آپ نے اپنی ایک کتاب میں فرمایا کہ ''بی بی صاحبہؓ'' کا نام نہ لیں۔ بچوں کے سامنے اُن کا ذکر نام لیے بغیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جب ہم روٹین میں ذکر کرتے ہیں تو صرف بی بی صاحبہؓ بھی کہیں گے تو سمجھ آ جائے گی کہ کن محترم ہستی کا ذکر ہو رہا ہے۔ بچوں کے سامنے اُن کا ذکر کرتے ہوئے یوں کہہ لیجیے۔ آپ ﷺ کی چہیتی صاحبزادیؓ یا پھر آپ بی بی صاحبہؓ کا نام احترام کے القابات لگا کر لیا کریں۔ کتاب میں میں نے بی بیؓ صاحبہ کا نام لینے سے اِس Sense میں منع کیا تھا کہ بغیر احترامی القابات کے اُن کا نام نہ لیا جائے۔

یہ کسی پر Binding نہیں ہے۔ دراصل میں نے اپنی مرضی سے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کیوں کہ میں نہیں سمجھتا کہ میری زبان اِس لائق ہے کہ اِتنی بڑی ہستی کا نام لے سکے۔ میرے نزدیک اُن کا نام لینا گستاخی ہے کیوں کہ وہ بہت بڑا مقام رکھتی ہیں۔ لوگوں کو بی بی صاحبہؓ کے مقام کا اندازہ نہیں ہے۔

سوال: انسان اشرف المخلوقات ہے اِس پر جنات کیسے قابض ہو سکتے ہیں؟

جواب: بھائی! 30 سال سے یہی میں لوگوں کو سمجھا رہا ہوں کہ جس انسان کو فرشتوں نے سجدہ کیا اُس پر جنات جیسی مخلوق کیسے حاوی ہو سکتی ہے۔

جب میں جنات سے بہت Superior ہوں تو جنات مجھے چمٹ کر کیا کریں گے۔ درحقیقت کچھ لوگوں نے اِسے رزق کا ذریعہ بنالیا ہے کہ جب کسی کی بیماری سمجھ نہیں آتی تو کہہ دیتے ہیں اِس پر جن آگیا ہے۔ میں 30 سال سے لوگوں کے لیے دُعا کر رہا ہوں On Average (اوسطاً) 1500 افراد Per week مجھے ملتے ہیں۔ اِن 30 سالوں میں شاید دو یا تین Cases ایسے میرے پاس آئے جن پر واقعی جنات نے تصرف حاصل کر لیا تھا، وہ بھی آدھے منٹ میں چلے گئے۔

جوہر اور ارض

دُنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز مثلاً والٹیئر، بنجمین فرینکلن، سقراط، افلاطون وغیرہ جنھیں ہم عموماً مذہب سے دُور سمجھتے ہیں، وہ سب دُعا پر بہت Firmly یقین رکھتے تھے۔ So much so سقراط کے خیالات و نظریات اُس کے دور کے لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے کیوں کہ وہ عام انسان کے خیالات کی نسبت بہت بلند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ نہ صرف سقراط کے خلاف ہو گئے بلکہ اِس مخالفت کی وجہ سے اُسے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا۔ زہر کا وہ پیالہ پینے سے پہلے سقراط نے دُعا کی۔

اِسی طرح افلاطون اپنے اُستاد کے خیالات و نظریات کو Promote کرتا رہا۔

انسان کا واسطہ دُنیا میں دو چیزوں سے پڑتا ہے

1۔ جوہر

2۔ ارض

اِن دو چیزوں کو ارسطو نے بہت خوب صورت طریقے سے Define کیا۔ اُس کی بیان کردہ Definition کو بہت بعد میں ایک بہت بڑے عالم، فلاسفر اور ولی اللہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں واضح کیا۔

کسی کے پاس علم کا جتنا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے وہ اُتنے ہی مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ علم کی بلندیوں پر پہنچا ہوا شخص گفتگو کے وقت بہت اِختصار سے کام لیتا ہے۔ وہ مخاطب کی ذہنی سطح پر اُتر کر اُسے بات سمجھائے گا اور نہایت آسان الفاظ اِستعمال کرے گا۔ اُس کی بات دل میں اُترتی چلی جائے گی کیوں کہ اُس کے پیچھے علم کی قوت ہوتی ہے۔

جتنا کسی انسان کے پاس کم علم ہوتا ہے۔ وہ اُسی قدر الفاظ کے ساتھ کھیلے گا اور لمبی بات کرے گا۔ اپنا مدُعا بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی اِصطلاحات اور موٹے الفاظ اِستعمال کرے گا لیکن پھر بھی اُس کی بات مخاطب کے دل میں اُتر نہیں پائے گی۔

ہمارے گھروں میں آدھ انچ Diameter کا Water tap لگا ہوتا ہے جسے ہم ٹونٹی کہتے ہیں۔ اُس میں سے پانی کی ایک Certain مقدار گزر سکتی ہے۔ اُس سے زیادہ پانی گزر ہی نہیں سکتا چاہے اُس کے پیچھے

سمندر موجود ہو۔ ہم سب کے گھروں کی چھتوں پر واٹر ٹینک موجود ہیں۔ آپ ٹونٹی کھولتے ہیں۔ اُس ٹینک کی Capacity کے مطابق وہ ٹونٹی پانی فراہم کر رہی ہوتی ہے۔ ہم اُس ٹونٹی سے آنے والے پانی کے پریشر سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ واٹر ٹینک پوری طرح بھرا ہے، آدھا ہے، کوارٹر ہے یا پھر خالی ہونے والا ہے۔

اِسی طرح زیادہ علم والا انسان اگرچہ بہت سادہ انداز و الفاظ میں مختصر گفتگو کر رہا ہوتا ہے مگر اُس کی گفتگو کے پیچھے علم کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔

ارسطو نے جوہر اور ارض کو Define کرتے ہوئے کہا۔

''جوہر وہ ہے جو قائم رہتا ہے۔ ارض وہ ہے جس کو ثبات نہیں۔''

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اِسی بات کو ایک خوب صورت مثال سے یوں واضح کیا:

''پھول جوہر ہے کیونکہ اُس کے خواص قائم رہتے ہیں جب کہ پھول سے اُٹھنے والی مہک اور رنگ ارض ہے کیوں کہ پھول کو ٹہنی سے توڑ کر دھوپ میں رکھ دیں تو اُس کا رنگ بھی خراب ہو جاتا ہے اور خوشبو بھی اُڑ جاتی ہے۔ ہوا میں پھیلنے والی مہک عارضی ہوتی ہے۔''

اِس موضوع پر علما و محققین میں ایک طویل عرصے تک بحث چلتی رہی کہ انسانی اعمال جوہر ہیں یا ارض لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اِس مسئلے کو یوں حل کیا:

''انسانی اعمال بیک وقت جوہر بھی ہیں اور ارض بھی۔''

ارض اِس لیے کہ انسان کی وفات کے ساتھ ہی اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ جب زندگی میں انسان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ اُس غلطی کو Correct کر لے تو اُس کا مداوا ہو جاتا ہے۔ یوں یہ اعمال ارض ہیں لیکن روزِ قیامت انسان کے ہاتھ اِس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ نامۂ اعمال کیا ہے؟ ایک سکرول، لسٹ یا تفصیل انسان کے اعمال کی۔ اعمال کو دوام حاصل ہے۔ اِسی اعمال نامہ کی بنیاد پر روزِ محشر ہم سب کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کہاں کہاں جانا ہے۔ یوں اعمال جوہر میں تبدیل ہو جائیں گے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اِسی بات کو واضح کیا کہ انسانی اعمال دراصل ارض ہیں جس سے جوہر جنم لیتا ہے۔ انسانی جسم ارض ہے کیوں کہ یہ فنا ہو جائے گا، اِس میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے جب کہ جسم میں مقید رُوح جوہر ہے۔ کیوں کہ اُس کو فنا نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم کسی شخص کی صورت کو اہمیت دیتے ہیں حالاں کہ صورت کو فنا ہو جانا ہے۔ صورت کی کچھ حقیقت نہیں۔ جو چیز دیرپا ہے وہ رُوح ہے۔ کسی انسان کی رُوح جتنی نیک ہو اُس انسان کی سیرت اتنی ہی پاکیزہ ہوتی ہے۔

ہم اپنی شادی کے وقت صورت کو سیرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز جو والد صاحب کے دوست بھی تھے، میں والد صاحب کی وفات کے بعد اُن سے بہت قریب ہو گیا۔ اُن کے صاحبزادے کو ایک لڑکی پسند آ گئی۔ رب تعالیٰ نے اُسے بے پناہ خوب صورتی سے نواز رکھا تھا لیکن اُس کا ایک Problem تھا کہ طبیعت میں غصہ اور لڑائی جھگڑے کی خو بہت تھی۔ والد صاحب بیٹے کو سمجھاتے رہے کہ ایسے مزاج کی حامل لڑکی سے شادی نہ کرو لیکن بیٹا کسی طور یہ بات سمجھنے پر آمادہ نہ تھا۔ آخر ایک روز اُنھوں نے مجھے اپنے آفس بلایا اور کہنے لگے ''میرے بیٹے کو سمجھاؤ کہ صرف خوب صورتی کی بنیاد پر کی گئی شادی زیادہ بہتر ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ بیوی کی خوب صورتی کی عمر صرف دو گھنٹے ہوتی ہے۔ دو گھنٹے بعد وہ ساری عمر بیوی کی سیرت پر ہی نظر رکھتا ہے اور اُس کی اچھی یا بُری سیرت کو بھگتتا ہے۔ اچھا یا بُرا......''

یہ بہت پرانی بات ہے۔ تب میں Late 20s میں تھا۔ اُس وقت مجھے اپنے اُن عزیز کی بات کچھ زیادہ سمجھ نہ آئی کہ Wife کی ظاہری خوب صورتی کی عمر صرف دو گھنٹے ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال میں نے جا کر اُن کے صاحب زادے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ نہ مانے اور اُسی لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھے بہت بعد میں اِس بات کے وزن کا احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی کچھ باتیں میں آپ کے سامنے Quote کرنا چاہتا ہوں۔

میرے والد صاحب کی وفات پر جب سبھی رشتہ دار رسمی و روایتی انداز میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم پر بڑی ذمہ داری آ گئی ہے اِسے اچھے طریقے سے نبھانا، اُنھوں نے مجھ سے کہا۔ ''سرفراز! تمھیں معلوم ہے میں تمھارے باپ کا دوست تھا۔ تمھارا باپ تو دُنیا سے چلا گیا لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اب میں تمھیں اپنا دوست بنا لوں۔'' میں نے کہا ''یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔'' کہنے لگے ''سب لوگ روایتی جملے بول کر ایک رسم نبھا رہے ہیں۔ اِن کی باتیں مت سنو۔ میں تمھیں ذاتی تجربے سے بتانا چاہتا ہوں کہ میں جب تمھاری ہی عمر میں تھا تو میرے والد صاحب کی Death ہو گئی تھی۔ نو بہنوں کی شادیاں کرنا تھیں جو میں نے کر ڈالیں۔ اِسی طرح باقی ذمہ داریاں بھی میں پوری کرتا رہا۔ ایسی ہی ذمہ داریاں اب تم پر آ گئی ہیں۔ اِن ذمہ داریوں کو جب تم پورا کر رہے ہو گے تو اگر کبھی گھر والے تم پر بگڑیں تو اپنے دل میں کبھی یہ خیال نہ آنے دینا کہ ایک تو میں اِنھیں سپورٹ کرتا ہوں، اُوپر سے اِن کی گالیاں بھی سنتا ہوں۔ یہ کھاتے بھی ہیں اور غراتے بھی ہیں مجھ پر۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم اِن کو سپورٹ کر کے ان پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہو گے۔ یہ تمھاری ذمہ داری ہے جسے تم نے پورا کرنا ہے۔ جب انسان اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے تو وہ کسی پر احسان نہیں کر رہا ہوتا۔ اِس لیے کبھی مت سوچنا کہ ایک تو کھاتے ہیں اُوپر سے غراتے بھی ہیں۔

1973ء میں میرے والد صاحب کی Death ہوئی تھی۔ اب اِس عمر کو پہنچنے کے بعد پتا چلا کہ اِس بات میں کتنا وزن تھا کہ میں اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہوں، کسی پر احسان نہیں کر رہا۔ یہ سوچ انسان کو بہت سی قباحتوں سے بچا لیتی ہے اور زندگی کو Comfortable بنا دیتی ہے۔

ایک بار میں اُن کے گھر گیا تو وہ اپنے کتے کو پکڑ کر فیڈر سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ پینے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ اِس کے باوجود کتے کو گردن سے پکڑ کر اُس کا منہ دودھ والے برتن میں ڈالنے کی کوشش

کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ پنجابی میں کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔ وہ انتہائی تعلیم یافتہ انسان تھے۔ میں کچھ دیر انھیں یہ سب کرتے دیکھتا رہا، پھر پوچھا ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' کہنے لگے ''اِس کی عمر بہت ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اِس کی بینائی جاتی رہی۔ اِسے پتا نہیں چلتا کہ اِس کی خوراک کا برتن کہاں ہے اِس لیے مجھے اِسے زبردستی خوراک کے برتن کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔'' میں نے کہا ''میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے کہ کتے کا Blind ہو جانا اُس کے بہت ضعیف ہونے کی علامت ہے اور تب اُسے Mercy انجکشن دے دینا چاہیے تاکہ وہ سکون کی موت مر جائے۔''

اُنھوں نے میری بات سن کر کتے کو چھوڑ دیا۔ بہت حیرت، غصے اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا ''سرفراز یار! مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی کہ تم بھی مجھے وہ بات کہو گے جو سارے لوگ کہہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا ''کیوں کیا ہوا؟'' کہنے لگے ''اِس کتے نے اپنی جوانی سے لے کر اندھا ہونے تک میرے گھر کی رکھوالی کی۔ یہ میری خدمت کرتا رہا۔ آج یہ اندھا ہو گیا ہے۔ اِسے میری خدمت کی ضرورت پڑ گئی ہے تو کیا میں اِسے گولی مار دوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اُنھوں نے ایک ملازم اُس کتے کے لیے رکھا جس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ کتے کو ہر تیسرے روز رکشہ میں بٹھا کر ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کرانے، انجکشن لگوانے اور دوائیاں لینے کے لیے لے کر جاتا۔

ہو سکتا ہے آپ کو یہ اچنبھے کی بات نہ لگے لیکن یہ دیکھیے کہ علم انسان کی سوچ کو کیسے ایک نیا رنگ عطا کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ انسان کے بڑے ہونے کی علامت ہے کہ اگر کسی نے جوانی میں آپ کی خدمت کی ہے تو جب اُسے اپنے بڑھاپے میں آپ کی خدمت کی ضرورت پڑے تو آپ اُسے Abandon نہ کریں۔

ایک روز وہ شام کو میرے آفس آئے، پوچھنے لگے ''گھر کب جانا ہے؟'' میں نے کہا ''آٹھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھتا۔ کام Clear کر کے ہی آفس سے نکلتا ہوں۔ خیریت ہے؟'' بولے ''میں نے گھر جانا تھا سوچا کہ تم مجھے ڈراپ کر دو گے۔'' میں نے پوچھا ''آپ کی گاڑی کدھر گئی؟'' یہ 77-1976ء کی بات ہے۔ کہنے لگے ''یار گاڑی بھی ہے اور ڈرائیور بھی۔ آج جب صبح آفس کے لیے آ رہا تھا تو چوبرجی چوک کے پاس ایک بس سٹاپ پر مجھے علی گڑھ کا ایک کلاس فیلو نظر آیا جو وہاں وین کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اُسے یوں کھڑا دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہم دونوں نے 1936ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کیا تھا۔ لیکن آج یہ یہاں ویگن کے انتظار میں کھڑا ہے جب کہ میں اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی میں نے یہ سوچا، ساتھ ہی اندر سے ایک آواز آئی، لعنت ہے تم پر۔ بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے کے دوسروں کو حقیر سمجھ رہے ہو۔ یہ آواز سننے کے بعد مجھے لگا کہ مجھے خود کو سزا دینی چاہیے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی گھر لے جاؤ اور مجھے یہیں اُتار دو۔ میں وہاں سے پیدل چل کر بس سٹاپ تک گیا اور اپنے اُس کلاس فیلو کے ساتھ ویگن میں بیٹھ کر آفس آیا۔ آج میں نے تہیہ کر لیا کہ تکبر کی یہ سزا خود کو دوں گا کہ آج سے اِس بڑی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔''

اور واقعی میں نے دیکھا کہ اِس کے بعد وہ اُس گاڑی میں نہیں بیٹھے لیکن ڈرائیور کو بھی نوکری سے نہیں نکالا۔ جب Flood آیا تو بہت سے لوگ Gulf اور Middle Eastern States جا رہے تھے۔ ڈرائیور نے درخواست کی کہ آپ مجھے فارغ بٹھا کر تنخواہ دیتے رہتے ہیں، مجھے شرم آتی ہے۔ آپ مجھے دبئی بھجوا دیں۔ یوں وہ دبئی چلا گیا۔ دو سال بعد واپس آیا تو جاب تلاش کرتا رہا۔ اُس کو جاب نہ ملی تو اُن کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آج کل ایئرپورٹ سے مختلف شہروں کے لیے ٹیکسیاں چل رہی ہیں، سوچ رہا ہوں اگر کہیں سے پیسے مل جائیں تو کار خرید کر Cabbing شروع کر دوں۔ وہ بولے ''تم گھر جاؤ۔ میں بیگم صاحبہ کو فون کرتا ہوں جو گاڑی تم چلایا کرتے تھے، وہی لے لو۔'' یوں اُنھوں نے وہ گاڑی ڈرائیور کو تحفتاً دے دی۔

یہ باتیں سنانے کا مقصد اُن صاحب کی عظمت بیان کرنا تو ہے ہی یہ اُن کا حق بھی بنتا ہے کہ وہ دُنیا سے چلے گئے ہیں۔ اللہ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اُن کے اِس طرزِ زندگی میں بہت سے سبق چھپے ہوئے ہیں کہ ہمارے رویے دوسروں کے لیے کس طرح کے ہونے چاہییں۔

بات صورت اور سیرت پر ہو رہی تھی۔ ہم کسی بھی شخص پر بے دریغ Comment کر دیتے ہیں۔ ہم یہ سوچ اور سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ہم دوسروں کے بارے میں جو Comments کر رہے ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ گرفت ہو جائیں گے۔ دُنیا و آخرت میں اُن کی وجہ سے ہماری گرفت ہو جائے گی۔ عموماً ہمارے Comments سطحی معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سوچتے کہ کسی پر اگر تہمت لگائیں گے تو اِس پر سزا ہے۔ اگر Comments حقائق پر مبنی تھے تو بھی ہم نے کسی شخص کو اُس کی غیر موجودگی میں بدنام کر دیا۔ ہم نے کسی کی غیبت کر کے اُس کے عیب کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر دیا۔ رب کے حکم کہ دوسروں کی پردہ پوشی کرو کی نافرمانی کی...... اپنے اِس رویے کی وجہ سے ہم گرفت میں آ جاتے ہیں۔

منکر نکیر ہمارے کندھوں پر بیٹھے ہمارے اچھے اور بُرے اعمال لکھ رہے ہیں۔ ہمیں بروزِ قیامت اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ روزِ ازل سے ابد تک کھربوں لوگ دُنیا میں آئے کیا ہر انسان کی شناخت اور ریکارڈ جدا جدا ہے...... میں اِس کی صرف ایک سائنسی توجیح پیش کرتا ہوں۔ یہ Total picture نہیں۔ سائنس کی تحقیق کے مطابق ہم میں سے ہر انسان کا ایک DNA کوڈ ہوتا ہے جو سب کا Separate ہے۔ ایک انسان کا DNA دوسرے سے نہیں ملتا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کا DNA ٹیسٹ ہونا ہوتا ہے تو آخری داڑھوں کی جڑ کے اُوپر والا مسوڑھا Cotton bud سے اچھی طرح رگڑا جاتا ہے اور جونہی وہ Cotton bud جذب کرتا ہے اُس نمی سے DNA Test ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا جب کوئی شخص شدید غصے اور غیظ و غضب میں بولتا ہے تو اُس کے منہ سے تھوک اُڑتا ہے۔ نارمل انداز میں بات کرتے ہوئے بھی ہمارے منہ سے ہوا نکلتی ہے۔ یہ ہوا ہمارے منہ میں موجود Moisture کی وجہ سے نم ہو جاتی ہے۔ اور اِسی نمی میں ہمارا DNA موجود ہوتا ہے۔ ہمارے لفظ ہوا کی لہروں پر Travel کرتے ہیں۔ مختلف الفاظ کی فریکوئنسی اور Vibration مختلف ہوتی ہے۔

اگر کوئی آدمی "یہ" بولتا ہے تو اُس کی Vibration اور فریکوئنسی مختلف ہوگی۔ "کیوں" بولتا ہے تو اِس کی فریکوئنسی اور Vibration مختلف ہوگی۔ گویا ہمارے ہر حرف کے ساتھ ہمارا DNA ہوا میں چلا جاتا ہے۔ یہ DNA مرتا نہیں بلکہ قائم رہتا ہے۔ DNA ہمیشہ رہنے والا (Everlasting) ہے۔

ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ روز قیامت اِسی طرح Reproduce ہوگا۔ امریکہ میں ایسے بہت سے تجربات ہو چکے ہیں۔ وہاں ایک لائبریری بھی قائم ہو چکی ہے جس میں Recaptured آوازیں محفوظ کی گئی ہیں۔ انگریزوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آواز اور الفاظ کو ٹیپ کیا اور اِس کے بعد اُنھیں Reproduce کر دیا گیا۔

یہ ایک مہنگا طریقہ ہے اور کمرشل بنیادوں پر ابھی اِسے متعارف نہیں کرایا جا سکا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ متعارف ہو جائے گا۔ اگر انسان آج سے دو ہزار سال پُرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آواز کو ہوا میں سے Recapture اور Reproduce کر سکتا ہے تو رب تو پھر رب ہے۔ ہم جو لفظ دوسروں کے بارے میں کہتے ہیں وہ ہمیں سنوا دیے جائیں گے اور اُن کی وجہ سے ہماری گرفت ہو جائے گی۔ اِس لیے غیبت کو بہت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے لیکن ہم سب کی Pastime hobby ہی غیبت ہے۔

بات جو ہر اور ارض کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ انسانی اعمال تباہ نہیں ہوتے۔ روزِ قیامت رب تعالیٰ اِن تمام اعمال کو ہمارے سامنے لے آئے گا اور اِن کی وجہ سے ہماری گرفت ہوگی۔ مجھ جیسے گناہ گار شخص پر لازم ہے کہ اپنے اعمال کے بارے میں محتاط رہے۔ کیوں کہ اِن اعمال کے لیے ہمیں اللہ کے حضور جواب دینا ہے۔

سوال: ہم سب Unknowingly مختلف طرح کے بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اِس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: الحمدللہ! ہم سبھی مسلمان ہیں۔ ہر مسلمان اِس بات پر بہت Clear ہے کہ اُسے غیر اللہ کی عبادت نہیں کرنی تو ہم اِن ظاہری بتوں کی پوجا نہیں کرتے۔ لیکن آپ نے جو کہا کہ ہم Unknowingly مختلف بتوں کو پوجتے رہتے ہیں۔ یہ بت دراصل ہم نے اپنے اندر پال رکھے ہوتے ہیں۔ مثلاً انا کا بت، علم کا بت، سٹیٹس کا بت، دولت کا بت، عقل کا بت، عاجزی کا بت۔

ہم سبھی کہتے ہیں کہ تکبر بہت بُری خصلت ہے لیکن اِس کے باوجود ہماری انا ہمیں تکبر کی طرف لے جاتی ہے۔ ہم میں سے کسی کو علم کا تکبر ہے کہ میرے پاس بہت زیادہ Knowledge ہے۔ کسی کو Status کا تکبر ہے کہ میں بہت بڑا افسر ہوں۔ کسی کو دولت کا تکبر ہے کہ میں اپنی امارت سے جسے چاہوں خرید لوں۔ کسی کو عقل کا تکبر ہے۔

تکبر سب ہی خوف ناک ہیں۔ لیکن ایک تکبر ہولناک ہے اور وہ ہے "عاجزی کا تکبر"۔ ہم میں سے ایک بہت بڑی تعداد عاجزی کے تکبر میں مبتلا ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اندر بہت زیادہ عاجزی ہے کیوں کہ ہم سب سے جھک کر ملتے ہیں۔ ہر ملنے والے کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب ہم پر کوئی تنقید کر دے تو ہم ساری محبت اور احترام کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر حقیقی معنوں میں

عاجزی ہوتی تو ہمیں کسی کی تنقید سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

اشفاق احمد خاں کے مرشد تھے فضل شاہ صاحب جو "بابا نور والے" کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ پاس روڈ پر اُن کا مزار ہے۔ میری بھی ایک ملاقات اُن سے ہوئی تھی۔ ایک بار ایک شخص بابا نور والے کے پاس آیا اور بہت بدتمیزی کی۔ غالباً منو بھائی یا حنیف رامے اُس شخص کو مارنے کے لیے جب اُٹھے تو فضل شاہ صاحب نے اُنھیں روکتے ہوئے کہا:

"منڈیو بہہ جاؤ...... اینی دُنیا آ کے میری تعریف کر دی اے اوہناں نوں تے تسیں کدی نئیں ماریا...... اج اک بندے نے آ کے سچ بولیا اے تے تسیں اوہنوں مارن ٹُر پئے او۔"

یہ ہے حقیقی عاجزی......

جب کوئی جذبہ ہمیں رب کے بتائے ہوئے Standard سے دُور لے جائے تو سمجھ لیجیے کہ ہم انا کے بت کی پوجا کرنے لگے ہیں۔ کچھ بھی کہنے یا کرنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ یہ قدم رب کے طے کردہ Standard اور سنت کے خلاف تو نہیں۔ جب ایسا کرنا سیکھ لیا تو یہ زندگی بھی سنور جائے گی اور آخرت کی زندگی بھی بہتر ہو جائے گی۔

راہِ حق کی رُکاوٹیں اور بے غرض عبادت

انسان کی خواہشات اور محسوسات حق کی راہ میں کچھ حاصل کرنے میں بہت بڑی رُکاوٹ بنتے ہیں۔ انسانی خواہشات کے ساتھ ساتھ مختلف آلائشیں بھی ہمیں راہِ حق میں آگے بڑھنے سے روکتی رہتی ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خوب صورت مثال کے ذریعے اِسے یوں بیان کیا ہے کہ ایک میٹھے ٹھنڈے پانی کی نہر ہے۔ اُس کے کنارے پر کوئی کھڑکی، دروازہ یا جھروکا نہیں ہے۔ ایک اُونچی دیوار ہے، جس پر ایک پیاسا آدمی چڑھ کر بیٹھا ہے۔ وہ ٹھنڈے میٹھے پانی سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے لیکن دیوار کی بلندی اُس کے اور پانی کے درمیان حائل ہے۔ ایک طرف پیاس کی شدت ہے تو دوسری طرف پانی تک رسائی حاصل نہ کرسکنے کی بے بسی۔ یہ بے بسی اُسے غصے کی طرف دھکیلتی ہے۔ وہ غصے میں دیوار کی ایک اینٹ اُکھاڑ کر اُسے پانی میں پھینکتا ہے۔ اینٹ زور سے پانی میں گرتی ہے تو ایک دم پانی اُوپر کو اُچھلتا ہے۔ اُس آدمی کو یہ منظر اتنا اچھا لگتا ہے کہ وہ ایک ایک کر کے دیوار میں سے اینٹیں اُکھاڑ کر پانی میں پھینکنے لگتا ہے اور پانی کی آواز سن کر اور Splash دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ کھیل کھیلتے کھیلتے دیوار کم ہوتے ہوتے زمین کی سطح کے برابر آگئی۔ آدمی نے نہر کے کنارے بیٹھ کر سیر ہو کر پانی پیا اور اپنی پیاس بجھائی۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ راہِ حق میں رُکاوٹ بننے والے محسوسات کو جب انسان ایک ایک کر کے ختم کرتا رہتا ہے تو وہ حق کی منزل کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ آسانی سے اِس بات کو سمجھنے کے لیے میں محسوسات کو خواہشات اور آرزوؤں کا نام دے رہا ہوں۔ جب انسان غصہ، کینہ، حرص، حسد، بغض، غیبت جیسی تمام آلائشوں کی دیوار کو ایک ایک اینٹ کی صورت ختم کرتا رہتا ہے تو پھر وہ وقت آتا ہے جب آدمی اور پانی کے درمیان دیوار کی بلندی حائل نہیں رہتی۔ یوں انعامات تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔

رب تعالیٰ نے ہماری آنکھ اِس طرح بنائی ہے کہ یہ روشنی کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ جو ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں یا کہتے ہیں اِس کمرے میں روشنی ہوگئی ہے تو درحقیقت ہمیں روشنی دکھائی نہیں دے رہی ہوتی بلکہ روشنی جب کسی چیز پر پڑتی ہے اور وہاں سے Reflect ہوتی ہے تو وہ Reflection ہمیں دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ یوں چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں اور کمرہ روشن دکھائی دیتا ہے۔

روشنی لطیف ہے جب کہ انسانی آنکھ کثیف۔ آنکھ کثیف چیزوں کو تو دیکھ لیتی ہے لیکن لطیف چیزوں کو

نہیں۔ ہمارا جسم کثیف ہے لیکن رُوح لطیف ہے۔ ہمیں اپنا جسم تو دکھائی دیتا ہے لیکن رُوح نہیں۔ لطیف چیزوں کو دیکھنے کے لیے ہمیں اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرنا پڑتی ہے کہ جس سے لطیف چیزیں نظر آسکیں۔ رُوح کی لطافت بڑھ جائے تو ہم لطیف چیزیں دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ نورِ حق اِنتہائی لطیف ہے۔ اِس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لیے بھی اپنی رُوح کو لطافت کے بلند مقام پر لے جانا پڑے گا...... ہماری سوچ کی پاکیزگی و لطافت براہِ راست ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوگی۔ جتنی ہماری سوچ پاکیزہ ہوتی جائے گی اُسی مناسبت سے ہمارے اعمال پاکیزہ ہوتے جائیں گے۔ جب ہمارے اعمال پاکیزہ ہوتے چلے جاتے ہیں تو رُوح کی لطافت بڑھنے لگتی ہے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ ہم اپنی رُوح کو لطیف کرنے کے لیے اپنی سوچ کو پاکیزہ کرلیں...... ہماری سوچ Influence ہو جاتی ہے غصہ، حرص اور طمع سے۔ جب ہم کسی فقیر کے پاس جا کر Request کرتے ہیں کہ مجھے علم سیکھنا ہے، مجھے راہِ حق کی تلاش ہے اور میں راہِ سلوک پر چلنا چاہتا ہوں تو بظاہر لگے گا کہ فقیر نے میرے الفاظ کو اِسی طرح قبول کرلیا۔ لیکن در اصل وہ میرے اِن الفاظ کو باطنی آنکھ سے دیکھے اور تولے گا کہ حقیقت میں اِس راہ پر میں کیوں چلنا چاہتا ہوں۔ کیا اِس لیے کہ میرے دُنیاوی کام آسانی سے ہونے لگیں یا اِس لیے کہ میری دُعائیں قبول ہونے لگیں یا اِس لیے کہ مجھے کشف و کرامات حاصل ہو جائیں اور خلقِ خدا کو متاثر کرسکوں یا اِس لیے کہ مجھے علم مل جائے اور لوگ مجھے پیر سمجھنا شروع کردیں یا اِس لیے کہ واقعتاً مجھے قربِ الٰہی حاصل ہو جائے۔ قربِ الٰہی کے حصول کی یہ خواہش بغیر کسی لالچ کے ہے۔ مجھے چونکہ رب سے پیار ہے اِس لیے میں اُس کی دوستی اور قرب کا خواہش مند ہوں...... فقیر میرے الفاظ کو تول لے گا۔

فقیر سب کے بھرم رکھتا ہے۔ وہ میری نیت کو تول لینے کے بعد بھی مجھے کبھی نہیں جتائے گا کہ سرفراز صاحب! آپ کہہ تو یہ رہے ہیں کہ مجھے بس رب کا قرب اور دوستی چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے لیکن درحقیقت آپ کے ذہن میں کوئی اور غرض چھپی ہے۔ فقیر کبھی اپنے پاس آنے والے کو شرمندہ نہیں کرتا لیکن وہ مجھے علم کی وہی قسم دے گا جس کے حصول کی خواہش میرے دل میں چھپی تھی۔ یوں میں اپنی من چاہی راہ پر نکل جاؤں گا۔

بغیر غرض اور لالچ کے قرب کی خواہش رکھی جائے تو اُس کے انعامات بہت اعلیٰ ہیں۔

میں جن بزرگ (سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے اور اُن پر اپنی خاص الخاص رحمتیں نازل فرمائے، اُن کے ایک خادم تھے جنھیں ہم سب لوگ مجید بھائی کہتے تھے۔ میں جب اُن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو واپسی پر روزانہ مجید بھائی مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے کہنے لگے ''سرفراز بھائی! مجھے شاہ صاحب سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ نہ علم نہ کوئی دُنیاوی چیز...... مجھے اُن سے دُعا بھی نہیں کرانی۔ مجھے تو بس اُن سے پیار ہے۔ اُن سے پیار کی وجہ سے میں اُن سے ملتا اور اُن کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ اللہ کے حضور میرے لیے دُعا کردیں کہ میں اُن سے پہلے دُنیا سے چلا جاؤں کیوں کہ اُن کا جانا میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔'' رب تعالیٰ نے اُن کی

خواہش پوری کر دی۔ شاہ صاحب کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے مجید بھائی انتقال کر گئے۔ چند ہفتے بعد شاہ صاحب بھی دُنیا سے پردہ فرما گئے۔ تب میں وہاں جا کر بیٹھنے لگا جہاں شاہ صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ اُن دنوں برسات زوروں پر تھی۔ ایک روز دو نوجوان میرے پاس آئے کہ مجید بھائی کی قبر بارش کی وجہ سے بیٹھ گئی ہے اور اندر سے کفن نظر آ رہا ہے۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے کچھ لوگوں سے کہا کہ Polythene paper لے کر فوری طور پر قبرستان پہنچیں اور قبر ٹھیک کر دیں تا کہ پانی قبر کے اندر نہ جائے۔

اگلے دن وہ لوگ میرے پاس آئے تو حیران کن بات بتائی کہ تین روز کی مسلسل بارش کی وجہ سے قبر بیٹھ چکی تھی اور صرف نصف قبر پر مٹی باقی رہ گئی تھی۔ ہم نے اُس مٹی کو بھی ہٹا کر نئے سرے سے قبر ٹھیک کر کے مٹی اُس پر ڈالی۔ ہم نے دیکھا کہ اِتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کفن میلا نہ ہوا تھا۔ اُس پر مٹی کا ذرہ تک نہ تھا اور مجید بھائی کے جسم میں لوچ اُسی طرح موجود تھا جس طرح زندہ آدمی کے جسم میں لچک ہوتی ہے۔

اُن لوگوں کی بات سن کر میں سوچ رہا تھا کہ ایک شخص ایک ولی اللہ کی خدمت بے غرض ہو کر کرتا ہے تو اُس کو ایسا انعام ملتا ہے، اگر کوئی بغیر کسی غرض اور لالچ کے اللہ کی بندگی کرے تو اُس پر انعامات کی بارش کی کیا اِنتہا ہو گی......!!!

سوال: کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کا رزق لکھ دیا گیا ہے لیکن اُسے نہیں معلوم کہ وہ پڑا کہاں ہے۔ عین ممکن ہے کہ رزق مغرب میں پڑا ہو اور انسان اُس کو مشرق میں تلاش کرتا رہے؟

جواب: ایک بنیادی بات ہم سب کو سمجھ لینی چاہیے کہ رب تعالیٰ نے ہر جان دار کا رزق اُس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے اور وہ رزق اُسے مل کر رہے گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"کوئی شخص اِس دُنیا سے جا نہیں سکتا جب تک اپنی تقدیر میں لکھا رزق نہ کھا لے۔"

رب تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے ہر جان دار کا رزق ایک مقام پر لکھ دیا ہے...... حقیقت تو یہ ہے جو چیز تقدیر میں لکھ دی گئی وہ انسان کو مل کر رہے گی۔ خواہ وہ کسی بھی مقام پر ہو۔ رب تعالیٰ بندے کو اُس جگہ پر لے جائے گا جہاں اُس کے لیے رزق لکھا ہو گا۔

ہمیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ہم رزق صحیح سمت میں تلاش کر رہے ہیں یا نہیں...... ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا رزق ہماری تقدیر میں لکھا ہے جو ہمیں رب نے عطا کرنا ہے اور رب تمام کائنات پر محیط ہے۔ رب کسی ایک جگہ تک Limited نہیں ہے اِس لیے ہم یہ فکر نہ کریں کہ نہ جانے ہم صحیح ڈائریکشن میں رزق کی جستجو کر بھی رہے ہیں یا نہیں...... ہمارا کام صرف کوشش کرنا ہے۔ کیوں کہ رب نے فرمایا ہے۔

"ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اُس نے کوشش کی۔"

سوال: کہا جاتا ہے کچھ دُعائیں ایسی ہیں جنھیں پڑھنے سے رزق میں برکت ہوتی ہے؟

جواب: میری یہ بات آپ کو گراں گزرے گی کہ رب تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق عموماً کسی نہ کسی غرض کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم اِس مخمصے میں رہتے ہیں کہ میں رب تعالیٰ کا ذکر کروں تو یہ ذکر مجھے اُس مقام پر لے جائے جہاں میری برکت سے لوگوں میں رزق تقسیم ہونے لگے۔ لوگوں کی دُعائیں قبول ہونے لگیں...... میں رب تعالیٰ کو اِس انداز میں یاد کروں کہ مستجاب الدعوات ہو جاؤں، صاحبِ کشف و کرامات ہو جاؤں۔

میں اِس مخمصے میں رہنے کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی رکھتا ہوں کہ مجھے آپ ﷺ سے پیار ہے۔ میں سنت پر عمل کرتا ہوں۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ میری دُعائیں، میرا رب تعالیٰ کو یاد کرنا، اُس کی عبادت کرنا یہ سب میرے اِس دعوے کو ثابت نہیں کرتا۔

آپ ﷺ سے زیادہ عبادت گزار کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ سے کبھی دُنیا نہیں مانگی۔ پھر میں کیسا اُمتی ہوں کہ رب تعالیٰ کا ذکر، اُس کی عبادت، اطاعت اور بندگی اِس لیے کرتا ہوں کہ مجھے کچھ خاص چیزیں حاصل ہو جائیں۔

جو لوگ رُوحانیت میں بلند مقام پر پہنچے اُن کی زندگی کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ وہ رب کے عشق میں ڈوب کر اُس کی عبادت کرتے تھے۔ رب اُن کی اِس ادا سے اِتنا خوش ہوا کہ اُنھیں نہ صرف اُن کی دُنیاوی بلکہ اُخروی زندگی میں بھی حیران کن انعامات سے نوازا۔

بجائے رب کو کسی خاص غرض کے تحت یاد کر کے ایک خاص مقام حاصل کرنے کے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم رب تعالیٰ کو بے غرض و بے لوث ہو کر پکاریں۔ ہم عبادت کے ساتھ اپنی کوئی غرض یا لالچ Attach نہ کریں۔ رب تعالیٰ کی عبادت صرف اور صرف اِس لیے کریں کہ وہ لائق عبادت ہے۔ پھر سب انعامات خود بخود مل جائیں گے۔

آپ رب تعالیٰ کو بے غرض ہو کر پکاریئے۔ پھر دیکھیے کیسے کیسے انعامات ملتے ہیں۔ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہوں گے اُس کمرے میں چھوٹی موٹی بیماری اور درد کے ساتھ جو داخل ہو گا خود بخود صحت یاب ہو جائے گا۔ آپ دُعا بھی نہیں مانگیں گے صرف یہ کہیں گے "جاؤ میاں تمھیں رب رزق عطا فرما دے گا" تو رب اُس کا رزق وسیع کر دے گا۔ یہ سب بے غرض عبادت کے انعامات ہیں۔

ہم غرض کے ساتھ عبادت کر کے اُن انعامات کو محدود کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ رب کو لائق عبادت سمجھ کر پکاریئے پھر دیکھتے جایئے کہ کس طرح آپ پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

سوال: وطنِ عزیز میں آج کل سیاسی بے چینی ہے۔ سچ وجھوٹ میں فرق مشکل ہے۔ ایسے میں بطور قوم ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: رب تعالیٰ سے اگر ہم اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی طلب کرتے رہیں اور اِس کے بعد آئندہ کے لیے توبہ کر کے رب سے دُعا کریں ''اے رب! تُو ہم پر رحم فرمادے۔ ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرمادے'' تو اُمید ہے کہ رب ہم پر کرم فرمادے گا۔

لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہمیں اِس پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ ہمیں جو شکایات دوسروں سے ہیں مثلاً حکمران جھوٹ بولتا ہے، ٹیکس نہیں دیتا یا اِسی طرح کی اور برُائیاں...... تو کیا ہم اپنے اندر سے وہ تمام برائیاں ختم کر چکے ہیں؟

جس روز بطور فرد ہم نے اپنا جائزہ لینا شروع کر دیا، ہمیں جن برُائیوں کی شکایت دوسروں سے ہے ہم نے اپنے اندر سے اُنھیں نکال کر باہر پھینک دیا تو اُسی روز پوری قوم سدھر جائے گی۔

ہر ایک آدمی کے ٹھیک ہونے سے پوری قوم ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر ہمیں حکمرانوں سے شکایت نہیں ہو گی۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جیسی قوم ہو ویسا ہی حکمران اُس پر مسلط کیا جاتا ہے۔

سوال: جب کسی شخص کو قانون میں رہتے ہوئے انصاف نہ ملے تو وہ کیا کرے؟

جواب: ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہیے۔ اپنی آواز اُن لوگوں تک پہنچائیے جو آپ کو انصاف دینے کے ذمہ دار ہیں۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ سبھی لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ اچھے اور بُرے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ فرق صرف ڈگری کا ہے...... کسی جگہ 80 فی صد زیادہ اچھے اور 20 فی صد قدرے کم اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی جگہ 20 فی صد اچھے لوگ ہوتے ہیں اور 80 فی صد وہ لوگ ہوتے ہیں جو زیادہ اچھے نہیں ہوتے۔ ہم اپنی آواز انصاف کے ایوانوں میں پہنچاتے رہیں۔ کہیں نہ کہیں سے انصاف ضرور ملے گا۔

سوال: کیا وطن سے محبت ایمان کا تقاضا ہے؟ کیونکہ اِسلام میں Nationalism کا تو کوئی تصور نہیں؟

جواب: آپ نے بالکل صحیح فرمایا اسلام میں قومیت (Nationalism) کا نہیں بلکہ اُمہ کا تصور ہے۔ جغرافیائی تقسیم کے بعد جو Nations وجود میں آتی ہیں اسلام میں اُن کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن ہم جس خطے میں رہتے ہیں اگر اُس کی جغرافیائی حدود متعین کر دی گئی ہیں تو پھر اُس خطے سے وفاداری ہم پر فرض ہو جاتی ہے۔ اُس خطے کے اندر لاگو قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ ہمارے پاس جس ملک کی Nationality ہو، ہمیں اِس کے ساتھ وفادار ہونا چاہیے۔

سوال: ہم احادیث اور سیرت النبی ﷺ کی کتب کس Author کی لیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیث کی کتب Compile کی جاتی ہیں۔ احادیث آپ ﷺ کے فرمودات ہیں۔ اُن کا کوئی Author نہیں ہوتا۔ آپ صحاح ستہ میں سے کوئی بھی کتاب پڑھ لیں۔ عام طور پر لوگ صحیح مسلم وصحیح بخاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر عرض کر دیتا ہوں کہ آپ احادیث کی کوئی سی بھی

مستند کتاب پڑھ لیں۔ خاص طور پر ایسی کتب پڑھیں جن میں موضوعات کے حساب سے احادیث کو مرتب کیا گیا ہو۔ جیسے آج سے پچاس پچپن سال پہلے فقیر الدین فقیر کی Compile کی ہوئی کتاب "The Treasure" میرے ہاتھ لگی جس میں Food (غذا) کے حوالے سے تمام احادیث کو جمع کیا گیا تھا۔

اگر اِس قسم کی کتاب آپ پڑھیں گے تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق سنت کی روشنی میں آپ کو راہنمائی آسانی سے مل جائے گی۔

رُوحانیت میں گائیڈ کی اہمیت

ہم میں سے بڑی اکثریت بمعہ میرے ایسے حضرات کی ہے جنھیں رُوحانیت کے اصل Concept اور مقصد کا ادراک نہیں ہے۔ ہمارا رُوحانیت کے بارے میں عام طور پر یہی Concept ہوتا ہے کہ اِس کا اصل مقصد کشف و کرامات کا حصول ہے۔ اگر ہم اپنے ذہن کو کھنگالیں اور گہرائی و دیانت داری سے خود اپنا مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات سامنے آئے گی اور وہ یہ ہے کہ ہمارے Subconscious میں رُوحانیت کے حصول کی وجہ یہ موجود ہے کہ اِس سے دُنیا کا حصول ہمارے لیے آسان ہو جائے گا اور ہمارے دُنیاوی کام آسانی سے ہونے لگیں گے، ہمارے دُنیاوی کام اٹکیں گے نہیں۔

ہم نے کبھی غور نہیں کیا کہ رُوحانیت کی تعلیم دینے والے عام طور پر دُنیاوی چیزوں سے تہی دامن ہوتے ہیں یا اُن کے دل دُنیا کی محبت اور خواہشات سے خالی ہوتے ہیں۔

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ رُوحانیت درحقیقت حاصل کیسے ہوتی ہے؟ اِس کا جواب آسان لفظوں میں یوں دیا جاسکتا ہے کہ جو انسان اپنی Instincts کو کنٹرول کرلیتا ہے، اپنی خواہشات کو دبا سکتا ہے، اپنے جذبوں پر حاوی ہوسکتا ہے اور اپنے تمام رویوں کو سنت کے مطابق ڈھال لیتا ہے یا اُس کے اعمال و رویے سنت کے اِتنے قریب ہوجاتے ہیں جتنا کہ Humanly possible ہو تو اُسے رُوحانیت حاصل ہونے لگتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنت کے مطابق خود کو ڈھالنے سے رُوحانیت کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اِس بات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں رُوحانیت کے اصل مقصد کے بارے میں Clear ہونا چاہیے اور وہ ہے Single purpose کہ ہمیں قربِ الٰہی حاصل ہو جائے۔ اِس مقصد میں دُنیا کہیں نہیں ہے۔ مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ مجھے رب مِل جائے، میں رب سے قریب ہو جاؤں۔ اِس مقصد کے حصول کا آسان ترین راستہ جس میں غلطی کا امکان نہیں، یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال وافعال اور رویوں کو سنت کے مطابق ڈھال لیں۔ ہم اِتباعِ سنت کرلیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ جب ہم اپنے اعمال وافعال اور رویے سنت کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں یا اُنھیں کم سے کم اُس Extent تک لے جاتے ہیں جو Humanly possible ہے تو ہم آپ ﷺ کو بحیثیت اُمتی عزیز ہونے لگتے ہیں۔

جس طرح ماں باپ کو اپنا وہ بچہ بہت عزیز ہوتا ہے جو اُن کے نقشِ قدم پر چلتا ہے، اُن کے احکامات کی پیروی کرتا ہے، اُسی طرح آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے والا انسان آپ ﷺ کو عزیز ہوجاتا ہے اور جو آپ ﷺ کو عزیز ہو گیا وہ رب کو عزیز ہو جائے گا۔ کیوں کہ تب بندہ بندگی کے اُس مقام پر چلا جاتا ہے جہاں رب بندے کو پسند کرنے لگتا ہے۔ یوں اُس بندے کو رب کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

رُوحانیت کی اِس راہ میں شیطان بندے کو سو طریقوں سے بہکائے گا اور ایسی ایسی Justifications پیش کرے گا کہ اُس کے رویے اِتباعِ سنت سے ہٹنے لگیں گے۔

ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول ازبر ہے ''مومن وہ ہے جسے نہ کوئی چیز پانے کی خوشی ہو اور نہ کسی چیز کے کھونے کا غم۔'' لیکن اگر میرے دس روپے کہیں گر جائیں تو میں پیسے کھو جانے کے غم میں تین دن اُس جگہ سے نہیں اٹھوں گا اور زبان سے یہ جملہ بھی دہراتا رہوں گا کہ مومن وہ ہے جسے کسی چیز کے کھونے کا غم نہیں ہوتا۔ میرے پاس ایک صاحب آئے اور بتانے لگے میرے گھر میں چوری ہوگئی ہے۔ گھر میں موجود تمام ملازموں کو پولیس سے پٹوا لیا لیکن پھر بھی پتا نہیں چل رہا کہ کس نوکر نے چوری کی ہے۔ میں نے کہا ''صاحب! آپ الحمدللہ مسلمان ہیں۔ یہ تو بتائیے کہ اِسلام کے کس قاعدے اور قانون کے تحت آپ نے بے گناہ نوکروں کو پٹوایا اور اُن سب پر شک کیا؟ مار کھا کر بے گناہوں کے حلق سے جو چیخیں گونجی ہوں گی آپ سمجھتے ہیں کہ اُن چیخوں کی قیمت اِتنی بھی نہیں جتنی مالیت کا آپ کا سامان چوری ہوگیا؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ بے گناہوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے سے آپ کو گناہ ہوا؟'' ملازم کی پیشانی پر یہ سن کر جو پسینہ آئے گا کہ مالک نے مجھ پر شک کیا ہے، اُس پسینے کی قیمت کھوئے ہوئے مال سے ہزار گنا زیادہ ہے۔

میں نے اُن صاحب سے عرض کیا ''میں اور آپ دعویٰ دار ہیں آپ ﷺ کے اُمتی ہونے کے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ کے یہاں کوئی چیز چوری ہوجاتی تو آپ ﷺ کسی ملازم پر شک کرتے؟ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ آپ ﷺ کا تو زندگی بھر یہ رویہ رہا کہ آپ ﷺ کے رویے سے کسی دشمن کو بھی شرمندگی نہ ہو۔''

اِس مقام پر آنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانیت کا اُس درجے کا احترام کرنے لگیں کہ ہماری کسی بات سے کسی کو دل میں بھی شرمندگی محسوس نہ ہو۔ اُس مقام تک آنے کے لیے ہمیں اپنے چھوٹے رویوں اور افعال کو بھی سنت کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ یہ سب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی بھی چیز پر Reaction ظاہر (Show) کرنے سے پہلے اور کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے سوچ لیں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ نے کیا عمل فرمایا۔ ہم بھی خاموشی سے وہ طرزِ عمل اپنالیں۔

اگر ہم اِس Point سے آغاز کردیں اور اپنے اُوپر بڑا Strict ڈسپلن لاگو کرلیں کہ ہم نے اپنی زندگی کے ہر شعبے اور فعل کو سنت کے مطابق ڈھالنا ہے تو ہماری رُوحانی ترقی شروع ہوجائے گی۔ ہم اُوپر جانا شروع ہوجائیں گے۔

رُوحانیت کے مدارج میں بہت سے خطرات چھپے ہوتے ہیں۔ جو لوگ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے ہیں وہ Typical shape and sole کے شوز پہنتے ہیں جس میں Spikes ہوتے ہیں۔ وہ کوہ پیما رسیوں اور ایک خاص Hammer کی مدد سے بلندی پر چڑھتے ہیں تا کہ وہ نیچے نہ گرنے پائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپ کا گائیڈ کام آتا ہے۔ آپ کا گائیڈ Scaling Gear کا کام کرتا ہے۔ وہ آپ کو واپس گرنے نہیں دیتا۔ جہاں آپ غلط پاؤں رکھنے لگتے ہیں اور گائیڈ کو خدشہ ہوتا ہے کہ آپ Slip ہو جائیں گے وہ آپ کو Warn کرتا ہے Watch your step تو آپ سنبھل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور مصیبت آتی ہے۔ انسان کا اندر اِس ڈانٹ اور وارننگ کو برداشت نہیں کرتا۔ وارننگ سے انا مجروح ہوتی ہے اِسی لیے گائیڈ سب پہلے آپ کی انا کو ختم کرے گا۔ آپ کی انا کو کچلنے کے لیے وہ بہت سے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے نقائص بیان کرے گا۔ حالاں کہ سنت یہ کہتی ہے کہ دوسرے شخص کے نقائص اُسے تنہائی میں بتائے جائیں۔

جب گائیڈ آپ کے نقائص پر Publicly آپ کو شرمندہ کرتا ہے تو شروع میں یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ پھر رفتہ رفتہ سمجھ آنے لگتی ہے کہ مرشد اپنے اُس مرید کو جو اعلیٰ عہدے پر فائز اور باعزت ہو، Publicly زیادہ کیوں رگڑتا ہے؟ دراصل اِس طریقے سے وہ مرید کے اندر سے انا کو نکال رہا ہوتا ہے۔ انا نکلنے کے بعد جب وہ مرید کو کسی کام پر ڈانٹتا یا Warn کرتا ہے تو تب اُس کی انا مجروح نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ وہاں ہوتی ہی نہیں۔ تب مرید اپنے گائیڈ (مرشد) کی وارننگ کو خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ جب آدمی بلندی پر چڑھتے چڑھتے چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اُس کے نیچے گرنے کا احتمال نہیں رہتا۔ اِس کی مثال مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت خوب دی۔

کچا انگور (گوزہ) بیل پر اپنے گچھے میں لگا ہوا رفتہ رفتہ جب پک جاتا ہے تو پھر وہ اپنی سابقہ حالت کو لوٹ نہیں سکتا۔ پکا ہوا انگور کبھی کچے انگور کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

آپ کا گائیڈ یا مرشد آپ کو گائیڈ کرتے کرتے اُس مقام تک لے جاتا ہے جہاں آپ کے گرنے اور Slip ہونے کا خدشہ نہیں رہتا۔ یوں آپ رُوحانی مدارج طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اُس خاص مقام تک آنے کے لیے آپ کو گائیڈ کی ضرورت رہتی ہے۔ ہم مرشد یا گائیڈ کو نہ جانے کیا کیا درجہ دے دیتے ہیں۔ وہ تو ہماری طرح مجبور انسان ہے جو اللہ کے در پر بیٹھا ہے۔ اللہ کے حکم کے بغیر وہ بھی اپنی کمر پر بیٹھی مکھی تک نہیں اُڑا سکتا لیکن ہم اُس سے نہ جانے کیا کیا توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور جب اُن توقعات کا ڈھانچا دھڑام سے گرتا ہے تو ہم کہتے ہیں مرشد ہی غلط تھا۔ ہم اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے کہ ہم نے ہی مرشد کو Superhuman سمجھ لیا تھا۔

رُوحانیت کے مدارج گائیڈ کے بغیر طے کرنے سے ہم ہر قدم پر پھسلنے لگتے ہیں اور جہاں سے چلے تھے بعض اوقات اُس سے بھی نیچے جا گرتے ہیں جب کہ گائیڈ ساتھ ہو تو ہم ہر قدم پر بہت محتاط رہتے ہیں۔ کیوں

کہ ہم مرشد کی Watchful eye میں رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت ہمارا نگران ہوتا ہے۔

ہر مرشد کا Guidance کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ 1970s میں میرے ایک Colleague جب کبھی ملک سے باہر ٹور پر جاتے تو گورنمنٹ اُنھیں ہوٹل Expense کے علاوہ دو سو ڈالر الاؤنس بھی دیا کرتی تھی۔ اِس الاؤنس میں کھانا پینا بھی شامل ہوتا اور فیملی شاپنگ بھی...... بھٹو صاحب جو سگار پیتے تھے اُس کی قیمت ایک سو ڈالر تھی۔ میرے وہ Colleague عام طور پر اپنے الاؤنس میں سے ایک یا دو اُسی طرح کے سگار میرے لیے تحفتاً لے آتے۔ میں ایک سگار پی لیا کرتا لیکن یہ سال یا دو سال میں محض ایک بار ہی ہوا کرتا تھا۔

ایک بار میرے ایک جاننے والے صاحب نے بڑے شاہ صاحب (سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو میں اُنھیں وہاں لے گیا۔ بڑے شاہ صاحب نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ بہت عزت سے اُنھیں بٹھایا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو باتوں باتوں میں بڑے شاہ صاحب اُنھیں کہنے لگے "میاں! رُوحانیت کا سفر کٹھن ہے۔ اگر انسان سگریٹ پی رہا ہو تو اُس کی Smell اور دھواں رُوحانیت کی راہ کو کھوٹا کرتا ہے۔ انسان کی پرواز کی راہ میں رُکاوٹ آتی ہے۔ لوگ سگریٹ کی Smell کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن سگار کی Smell اُنھیں پیاری لگتی ہے۔ سگار چاہے سال دو سال میں ایک بار ہی کیوں نہ پیا جائے اُس کی Smell رُوحانیت کی راہ میں رُکاوٹ ڈالتی ہے۔"

اب یہ سب باتیں اُنھوں نے کہی تو میرے ساتھی سے تھیں لیکن میں سمجھ گیا کہ اصل میں مجھ سے کہا جا رہا ہے۔ اِس کے بعد جب کبھی وہ Colleague میرے لیے سگار لے کر آئے تو میں نے وہ لوگوں میں بانٹ دیے۔ مرشد کا تربیت کا ایک انداز یہ بھی تھا۔

دوسرا انداز یہ تھا کہ مجھے ایک رُوحانی معاملہ درپیش تھا۔ کئی سال سے ہر جمعہ کی نماز میں اُسے Encounter کرتا تھا۔ ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مرشد صاحب کی نماز میں موڈ خوش گوار دیکھا تو موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عرض کیا "حضور ہر جمعہ کو فرض نماز کے بعد یہ معاملہ ہوتا ہے۔" (معاملہ کی Details میں نہیں جاؤں گا۔) میری بات سن کر وہ وہیں رُک گئے۔ بڑے غصے سے آنکھ ٹیڑھی کر کے مجھے دیکھا اور کہنے لگے "ایک تو تم نے مجھے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔" میں نے کہا "آئی ایم سوری سر۔ معاملہ ٹھیک ہو گیا۔"

مرشد صاحب کی یہ خوبی بڑی زبردست تھی کہ اگر کسی نے پلٹ کر فوراً سوری کر لیا تو وہ سب بھول جایا کرتے اور اُن کا موڈ ٹھیک ہو جاتا۔

پتا یہ چلا کہ وہ رُوحانیت کے جس مقام پر ہیں اور جو کچھ اُن کے مرشد نے اُنھیں سکھایا ہے اور جو اُن کے اپنے رویے اپنے مرشد کے ساتھ رہے ہیں وہ یہی ہیں کہ مرشد کے سامنے نہ تو کبھی ذکر کا ذکر کرنا ہے کہ آپ نے مجھے یہ ذکر بتایا ہے اور میں یہ کرتا ہوں۔ ذکر کے دوران جو محسوس ہو، جو مشاہدہ و واردات ہو اُس کا ذکر نہیں کرنا۔

جب تک انسان رُوحانیت کی راہ پر چلتے چلتے اُس پوائنٹ تک نہیں آجاتا کہ جہاں پھسلنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے تب تک اُسے مرشد کی زیرِ نگرانی رہنا چاہیے تاکہ وہ قدم قدم پر ٹوکتا رہے اور جب پھسلنے کا خدشہ یا امکان ختم ہو جائے تو انگور والی مثال کے مصداق آدمی کا پرانی کیفیت میں لوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا اور نہ ہی یہ امکان کہ پھسل کر Initial point پر چلا جائے گا۔ ایک ولی اللہ نے اِس کی مثال یوں دی کہ پسے ہوئے آٹے کو گوندھ کر اُس کی روٹی پکالی جائے تو پھر اُس روٹی کو پسے ہوئے آٹے میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ رُوحانیت کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد وہ Real سفر شروع ہوتا ہے کہ جہاں پھسلنے اور واپس جانے کے امکانات نہیں رہتے لیکن اِس Real سفر سے پہلے انسان کو بہت Watchful رہنا پڑتا ہے۔

اِس راہ میں شیطان مختلف کہانیوں، قصوں اور Justifications کے ذریعے انسان کو بہکاتا ہے۔ اِس بہکاوے سے بچنے کے لیے سب سے اچھی Yardstick آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ شیطان ہمیں جو مرضی دکھاتا اور کہتا رہے جب ہم اپنے ہر عمل اور قدم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی کسوٹی پر پرکھنے لگتے ہیں تو رُوحانیت کا سفر جاری ہو جاتا ہے۔

سوال: دُعا کرانا سنت ہے پھر اپنے مرشد کے علاوہ کسی بزرگ سے دُعا کرانے سے منع کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: بیماری میں علاج کرانا سنت ہے۔ مریض نے ایک ڈاکٹر سے علاج شروع کرایا۔ ایک خوراک کھائی۔ کہیں جاتے ہوئے راستے میں ایک ڈاکٹر کا بورڈ دکھائی دیا وہ اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس ڈاکٹر نے اپنی سمجھ کے مطابق مریض کی بیماری کو Diagnose اور Prescribe کیا۔ اور اُس سے بھی دوا کی ایک Dose کھا لی۔ پھر وہ تیسرے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جو اپنی سمجھ کے مطابق اُسے دوائی دیتا رہا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا مریض کبھی ٹھیک ہو پائے گا؟

جب آپ کسی مرشد کے پاس انڈر ٹریننگ ہوتے ہیں تو اُن کا ٹریننگ کرنے کا اپنا اُسلوب ہوتا ہے۔ جیسے Kindergarten کا اپنا طریقہ تدریس اور اُسلوب ہوتا ہے۔ Montessori سسٹم کا اپنا سلیبس اور طریقہ تدریس۔ اِسی طرح پبلک اور گریمر سکول کا سلیبس، اُسلوب اور طریقہ تدریس مختلف ہوگا۔ اگر بچہ Kindergarten میں پڑھ رہا ہے اور Montessori کی ٹیچر سے ٹیوشن لے رہا ہے تو سوائے کنفیوژن کے بچہ کیا حاصل کرے گا؟ جب ہم اپنے مرشد سے ٹریننگ لے رہے ہوں اور کسی دوسرے بزرگ (جو اچھے اور اپنے مقام پر ہیں) کے پاس جا کر دُعا کراتے ہیں تو اُن سے سیکھنے لگتے ہیں۔ اب آپ کی ٹریننگ تو اپنے مرشد کے پاس ہو رہی ہے لیکن آپ دوسرے بزرگ سے بھی تعلیم لینے یا سیکھنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ Confuse ہو جائیں گے اور جب انسان کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے تو کسی مقام پر نہیں پہنچ پاتا۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ مدد کے لیے صرف اپنے مرشد کے پاس جائیں۔ دوسرے بزرگوں کے پاس سلام کے لیے جائیے۔ اپنی ہمت و سکت کے مطابق اُن کی خدمت کیجیے۔ لیکن نہ تو اُن سے کچھ پڑھنے کے لیے مانگیے اور نہ اُنھیں دُعا کے لیے کہیے تاکہ آپ اُدھر مائل نہ ہو سکیں۔ مرشد کے علاوہ کسی دوسرے بزرگ سے دُعا نہ کرانے

میں یہ حکمت ہے ورنہ دُعا کرانا تو سنت ہے۔

سوال: جس کسی کی تربیت کا حصہ جس کے پاس ہو وہ مل جاتا ہے۔ یہ کیسے پتا چلے گا کہ مرشد کون ہے؟ نیز اگر حصہ نہ ہو تو کیا کسی طریقے سے اُسے Generate کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جہاں حصہ ہے رب تعالیٰ انسان کو وہاں پہنچا دیتا ہے۔ انسان کی Effort کو اُس میں کم ہی دخل ہوتا ہے۔ یہ عالم الاسباب ہے۔ رب یہاں ایسے اسباب پیدا فرما دیتا ہے کہ انسان وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہ غلطی نہ کریں کہ اِس انتظار میں اپنی جگہ بیٹھے رہیں کہ جہاں میرا حصہ ہے وہ مجھے خود ہی مل جائے گا اور جب مرشد خود میرے پاس آ کر میری ٹریننگ کریں تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اِس سے پہلے پہلے میں ہر وہ کام کر لوں جس کی خواہش میرے دل میں ہے۔ ایسا رویہ رکھنے والا انسان رُوحانیت میں کہیں نہیں پہنچ پاتا۔ آپ نیکی اور عبادات کی راہ پکڑے رکھیے، رب آپ کو خود وہاں پہنچا دے گا جہاں آپ کا حصہ ہے۔

سوال: اگر ہمارے ہاتھوں کسی کا نقصان ہو جائے تو ہم کیا کریں؟

جواب: رب تعالیٰ سب سے بڑھ کر غفور الرحیم ہے۔ اُس سے بڑھ کر کوئی غفور الرحیم نہیں۔ رب تعالیٰ تو مواقع ڈھونڈتا ہے کہ انسان ذرا سی زبان ہلائے، معافی مانگے اور وہ اُسے معاف کر دے۔ رب تعالیٰ کو سزا دینے سے زیادہ معاف کرنا پسند ہے۔

ہم سے زندگی میں جتنی بڑی بھی غلطیاں ہوئی ہیں اگر ہمیں پتا چل جائے کہ ہماری کسی غلطی سے کسی کو دُکھ پہنچا تو ہم اُس کے پاس جا کر معافی مانگ لیں اور جو نقصان اُسے پہنچایا تھا اُس کا بہترین انداز میں مداوا کرنے کی کوشش کریں، ہونے والے نقصان سے زیادہ تلافی کریں اور تمام عمر بطور مداوا اُس انسان کی دل جوئی کرتے رہیں۔

رب تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے۔ وہ کرم کرنے والا ہے۔ معاف کرنا اُسے پسند ہے۔ جب اُس کے بندے نے ہمیں معاف کر دیا تو رب بھی معاف کر دیتا ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے جو بندوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ رب کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا۔ غور کیجیے کہ رب نے اپنے بندوں کو کس بلند مقام پر بٹھا دیا۔ اِس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ رب ہم سے راضی رہے تو ہم اُس کے بندوں کو راضی رکھیں۔ ہم نے جس بندے کا قصور کیا ہے۔ اُس سے معافی مانگ لیں اور اگر وہ معاف کر دے تو یقین رکھیں کہ اللہ بھی معاف کر دے گا۔ اور ویسے بھی اللہ فرماتا ہے ”مجھ سے اچھے گمان رکھو۔ میں اچھا ہی کروں گا۔“ اِس لیے ہم ہمیشہ رب سے اچھے گمان رکھیں۔

سوال: سپلیمنٹ سنٹرم (Centrum) میں جیلاٹین کی مقدار ہونے کی وجہ سے کیا اُسے اِستعمال کرنا ٹھیک ہے؟

جواب: مسلمانوں کے دُنیا کی کل آبادی کا 20 فی صد حصہ ہونے کی وجہ سے تمام Manufacturers اب حلال و حرام کا خیال رکھتے ہیں اور ایسی تمام ممنوعہ چیزیں جنھیں مسلمان استعمال نہیں کرتے، اُنھیں پراڈکٹ

کے اجزا کی تفصیل میں نمایاں طور پر Mention کرتے ہیں۔

جیلاٹین فری سنٹرم سپلیمنٹ بھی تیار کیا جاتا ہے جس کی پیکنگ پر لکھا ہوتا ہے جیلاٹین فری۔ آپ جیلاٹین فری سنٹرم استعمال کر لیجیے، اُس میں کوئی پرابلم نہیں۔ اگر اِس کے حصول میں آپ کو دقت ہو رہی ہے تو سنٹرم سے بھی بہتر ایک پراڈکٹ موجود ہے ''فارماٹون'' جس میں جیلاٹین فری ٹیبلٹ بھی آتی ہے۔ آپ وہ اِستعمال کر لیں اس کے Results سنٹرم سے بہتر ملیں گے کیونکہ وہ Stomach (معدے) کو خراب نہیں کرتی۔

خلقِ خدا سے محبت

راہِ سلوک میں کئی سلسلے رائج ہیں۔ اگر چہ یہ سلاسل علیحدہ علیحدہ دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ جس طرح دریا علیحدہ علیحدہ منبع سے جاری ہوتے ہیں لیکن بالآخر سبھی دریا سمندر میں جا گرتے ہیں۔ اِسی طرح طریقت کے تمام سلسلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں پہنچنے والے بندوں کو آپ ﷺ کی دہلیز پر پہنچا دیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کے در سے وہ رب کے در تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔

جس طرح سلاسل کے منبع علیحدہ ہیں، اسی طرح اِن کا طریقہ تدریس و تربیت بھی جُدا جُدا ہے۔ کسی سلسلے میں ذکر جہری پر زور دیا جاتا ہے تو کسی میں ذکر خفی پر۔ کہیں عبادت کو چھپا کر کرنے کی تاکید کی جاتی ہے تو کہیں مل جل کر حلقے کی صورت ذکر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ کہیں ٹریننگ کا طریقہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ مرشد اپنے پاس علم کی نیت سے آنے والے شاگردوں کو خلقِ خدا سے محبت کا سبق دیتے ہیں...... مخلوق خدا صرف انسانوں تک محدود نہیں...... رب تو ہر شے کا مالک ہے اِس لیے مرشد سب سے محبت پر زور دیتے ہیں۔

راہ سلوک میں ایسے صوفی بہت کم گزرے ہیں جنھیں اُن کی زندگی میں ہی شہرت مل گئی ہو جب کہ علما کو عموماً اُن کی زندگی میں ہی ناموری نصیب ہو جاتی ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بھی ابتداً بہت بڑے عالم کے طور پر مشہور تھے۔ بڑے بڑے جید علما حصولِ علم کے لیے اُن کے پاس آیا کرتے۔ لیکن پھر اُن کی زندگی میں ایسا موڑ آیا کہ جہاں اُن کی ملاقات شاہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور اُن کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ عالم سے صوفی بن گئے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی میں بطور عالم جب کہ دُنیا سے جانے کے بعد بطور صوفی مشہور ہوئے۔ یہ وہ واحد صوفی ہیں جن پر امریکہ و یورپ میں بہت تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اُن کی 800 ویں سالگرہ پر انگلینڈ میں باقاعدہ تقریبات منعقد ہوئیں اور انگریزوں نے اِن تقریبات میں حصہ لیا۔

آج مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو رہا ہے۔ اُن کے نزدیک بھی محبت و عشق ایسا Medium ہے جس کے ذریعے ایک شیر کو گھر میں پلنے والی بلی کی طرح معصوم بنایا جا سکتا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باتیں کہہ کر کوئی نئی بات نہیں کی۔ آپ ﷺ نے کئی صدیاں پہلے اِس بات کو

عملی طور پر ثابت کیا۔ آپ ﷺ رحمت اللعالمین ہیں۔ آپ ﷺ کے پاس بدترین دشمن کے لیے بھی سوائے محبت ورحمت کے کچھ نہ تھا۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ غیر مسلم، مشرک یا منکر ہی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے کوئی ایسا موقع Point out نہیں کر سکا نہ کرسکتا ہے کہ جہاں آپ ﷺ نے کسی سے ذاتی وجہ سے بدلہ وانتقام لیا ہو یا سزا دی ہو۔

بدقسمتی سے ہمارے نظریات وعقائد ہندوانہ رُسوم سے متاثر ہیں۔ اِس کی وجہ تو یہ ہے کہ ہم بھی ماسوائے عرب سے آنے والی ایک قلیل تعداد کے ہندو سے مسلمان ہونے کے بعد بھی طویل عرصہ ہندو معاشرہ میں رہتے رہے جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں ہمارے Concepts زیادہ Clear نہیں۔ ہمارا سارا زور ذکر اذکار، چلوں اور مجاہدوں پر ہے جب کہ اگر ہم اپنی زندگی سے خلقِ خدا سے محبت کو نکال دیں تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ رب تک پہنچنے کا آسان راستہ رب کی مخلوق سے محبت ہے۔ جس طرح ماں کے دل میں گھر کرنے کا آسان ترین راستہ یہ ہے کہ اُس کے بچے سے پیار کیا جائے۔ رب تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ وہ جس آدمی کو اپنی مخلوق سے پیار کرتے دیکھے گا اُس سے پیار کرنے لگے گا۔

خلقِ خدا میں مقبول ہونے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اُس سے پیار کریں۔ پیار کے جواب میں ہمیں پیار ملے گا۔ لیکن اگر ہماری عادات اچھی نہیں تو خلق خدا سے ملنے والا پیار چند ہی دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ اِس پیار کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے ہمیں اپنی عادات واطوار کو اللہ کے احکامات اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی عادات واطوار اور اخلاق کو سنت کے مطابق ڈھال لیتا ہے یا سنت کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے تو مخلوقِ خدا اُس سے پیار کرنے لگتی ہے اور وہ اُس میں مقبول ہونے لگتا ہے۔

کلاس VI یا VIII میں ایک بات پڑھی جس کا مفہوم تھا کہ اگر انسان سے خلقِ خدا راضی ہے تو سمجھ لیں کہ اُس سے رب تعالیٰ راضی ہے۔ ہم ذکر اذکار پر بہت زور دینے کے بجائے اُنھیں اعتدال میں رکھیں اور خلقِ خدا سے پیار کو زیادہ ترجیح دیں۔ اہلِ فقر میں ایک Factor بہت Common ہے کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کرتے اور اُن کے کام آتے تھے۔ خود بھوکے رہ کر خلقِ خدا کو کھانا کھلاتے۔ خود تکلیف اُٹھا کر خلقِ خدا کو راحت پہنچاتے۔

انسان یہ سب اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ خلقِ خدا سے پیار کرتا ہو۔ اِسی لیے بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”فقیر کبھی مدعی نہیں ہوتا کیوں کہ جس سے وہ پیار کرتا ہے اس کی زیادتیوں پر شکایت کیسی!“

ایک اور مقام پر اُنھوں نے فرمایا:

”جو جمع کرتا ہے وہ فقیر نہیں حریص ہے۔“

فقیر دل کھول کر دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔ میں سب سے ایک گزارش کیا کرتا ہوں کہ بھائی! زندگی کا ایک اُصول بنا لیجیے کہ جان توڑ کر محنت وکوشش کر کے بہترین رزق کمائیے لیکن اپنی ذات پر کم سے کم خرچ

کریں۔ جو بچ جائے اُسے خلقِ خدا پر خرچ کر دیں......

انسانی فطرت میں ہے کہ جو چیز انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہے وہ اُس کی کمائی ہے۔ جب ہم اپنی عزیز چیز کو خلقِ خدا پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں تو رب کے قریب ہونے کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا فقیر سیاسی وسماجی حالات سے متاثر ہوتا ہے اور کسی قسم کا جہاد بھی کرتا ہے یا وہ اوراد و وظائف میں ہی مصروف رہتا ہے؟

جواب: فقیر مسلسل جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ فقیر اپنے جذبات واحساسات اور عقل کا اسیر نہیں ہوتا...... وہ صرف اور صرف شریعت سے Govern ہوتا ہے۔

ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے امیر کی اطاعت کرے۔ فقیر مسلمان امیر کے خلاف بغاوت نہیں کرتا لیکن بُرائی کے خلاف جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ وہ مخلوق کی نہ صرف بُرائی کی طرف توجہ دلاتا ہے بلکہ اُس بُرائی سے نجات حاصل کرنے کے راستے بھی دکھاتا ہے جو جہاد ہے۔ ہاں البتہ فقیر یہ کبھی نہیں کرے گا کہ سڑکوں پر نکل کر جلوس کی قیادت کرے۔ کیوں کہ اُسے وہ حدیث یاد رہتی ہے جس کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کو وہاں بیٹھنے کے سوا چارہ نہیں۔ ہم وہاں بات چیت کرتے ہیں۔ فرمایا اگر بغیر بیٹھے نہ مانو تو راستہ کو اُس کا حق دو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ راستہ کا کیا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نگاہ نیچے رکھنا، تکلیف دہ چیز ہٹانا، اسلام کا جواب دینا، اچھائیوں کا حکم دینا اور بُرائیوں سے روکنا۔ (صحیح مسلم)

اُس کے نزدیک آپ ﷺ کا یہ فرمان رہتا ہے کہ چلتے راستے میں رُکاوٹ نہ ڈالو۔ اِس لیے فقیر راستہ نہیں روکے گا۔ وہ رات کو دس بارہ بجے لاؤڈ سپیکر پر ہنگامہ برپا نہیں کرے گا کیوں کہ یہ سنت نہیں ہے۔ فقیر ممکنہ حد تک اپنے حلقۂ اثر میں بُرائی کو Point out کرتا اور اُس بُرائی سے بچنے کا طریقہ بتاتا ہے۔

یا وہ اُس وقت عملی جہاد کے لیے سب سے پہلے اپنے آپ کو Volunteer کردے گا جب دیکھے گا کہ کافر ملک نے اس کے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔

حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے پاس بہت سے اُمرا و وزراء آیا کرتے تھے جن کے ہاتھ وہ بادشاہ کو پیغام بھجواتے کہ تمھارا فلاں فلاں کام ٹھیک نہیں، اُسے درست کر لو لیکن بادشاہ توجہ نہ دیتا تھا۔ حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے کبھی ایسا نہ کیا کہ بادشاہ کے خلاف کوئی جلوس نکالا ہو یا اِس قسم کے احتجاج کا کوئی اور راستہ نکالا ہو۔ ایک صبح بادشاہ کو خبر ملی کہ تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر دیا ہے۔ بادشاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنے ایک وزیر کو جس سے حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ بہت پیار کرتے تھے اُن کے پاس دُعا کے لیے بھجوایا۔ وزیر نے جا کر دُعا کی درخواست کی تو حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے

دیوار سے تلوار اُتارتے ہوئے فرمایا اب دُعا کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ تاتاریوں کے خلاف جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔

فقیر کا یہ رویہ ہوتا ہے۔

سوال: اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک تو قربِ الٰہی کے حصول کا طریقہ اِتباعِ سنت ہے۔ میں اَن پڑھ انسان ہوں۔ علم فقہ اور علم حدیث حاصل نہ کر سکا۔ مجھ جیسے نالائق شخص کے لیے اللہ کا قرب حاصل کرنے کا Safest راستہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی نقل کر لیں اور آپ ﷺ کے نقشِ پا کو Follow کر لیا جائے۔

سوال: سچے ولی اللہ اور سچے مرشد کی پہچان کیا ہے......؟

جواب: میرے خیال میں سچے ولی اللہ کی پہچان کے دو طریقے ہیں:

1- Litmus Test

2- Long-term Test

جس طرح ہم پہچان لیتے ہیں کہ کوئی چیز Acidic properties رکھتی ہے یا Alkaline۔ اِسی طرح ہم سچے ولی اللہ کو بھی پہچان لیتے ہیں اور وہ یوں کہ اگر کوئی شخص واقعی ولی اللہ ہے تو اُس میں ایک عجیب سی کشش ہمیں محسوس ہو گی۔ ہم اُس سے بار بار ملنا چاہیں گے۔ اُس سے مل کر اور بات کر کے ہمیں سکون محسوس ہوتا ہے جیسے کندھوں سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ اُس سے مل کر ایک بے نام احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص سچا ہے۔ یہ Litmus Test ہے۔

دوسرا Test قدرے لمبا ہے۔ اگر ہم ایسے شخص سے بار بار مل رہے ہیں...... ضروری نہیں کہ روزانہ ملیں۔ اپنے Periodical معمول کے مطابق اُن سے ملاقات کرتے رہیں تو ہم نامحسوس انداز میں تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کبھی ہمیں نصیحت نہیں کرتا کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، دھوکا نہ دو۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے رویے اور عادات بہتر ہونے لگتے ہیں۔

مجھ جیسا انسان جس کے پاس سوائے جھوٹ و فریب کے کچھ نہیں ساری رات گانا سن کر ولی اللہ کے پاس جا کر کہتا ہے۔ حضور! تہجد پڑھ کر فارغ ہوا تو سوچا آپ کو سلام کر لوں...... ولی اللہ دل سے جانتا ہے کہ یہ انسان گانا سن کر آ رہا ہے لیکن وہ میرا بھرم قائم رکھے گا۔ وہ یہ تو نہیں کہے گا ہاں تم نے نماز پڑھی۔ البتہ یہ کہہ دے گا بہت اچھی بات ہے۔ تشریف رکھیں، چائے پییں، یوں اُس نے جھوٹ پر گواہی بھی نہیں دی اور مجھے Encourage بھی نہیں کیا لیکن میرا بھرم قائم رکھا۔ فقیر اپنے پاس آنے والے کو نیک ہونے کی نصیحت نہیں کرتا لیکن اُس کے پاس جانے سے انسان نیک ہونے لگتا ہے۔

یہی ایک سچے اور صحیح ولی اللہ کی پہچان ہے۔ لیکن سچے مرشد کی پہچان بہت دشوار ہے...... یہ تو دلوں کے سودے ہیں اور دلوں کے سودے Logic اور عقل سے نہیں بلکہ جذبے سے ہوتے ہیں۔ اگر جذبہ سچا ہے تو سچا

مرشد آپ کو ضرور ملے گا۔ تلاش شرط ہے۔

سوال: کیا قادیانیوں کے ساتھ کسی قسم کا کاروبار کر لینا چاہیے؟

جواب: قادیانیوں کے بارے میں ملک کے دو معتبر ادارے پاکستان کی پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ علما سے لمبی مشاورت کے بعد یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔ اس فیصلے کے بعد یہ Issue ہمیشہ کے لیے طے پا گیا کہ وہ مسلمان نہیں۔ اب ان کے ساتھ اس ملک میں اقلیتوں کا سا سلوک ہونا چاہیے۔

قادیانیوں کے ظاہر اور عبادات میں مسلمانوں سے مماثلت ہے اِس لیے مسلمان دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جب کہ دیگر مذاہب مثلاً عیسائیوں، یہودیوں، وغیرہ اور مسلمانوں کے ظاہر اور عبادات میں مماثلت نہیں اس لیے وہاں دھوکے کا امکان بھی کم ہے۔ قادیانیوں سے نہ ملیں اور مماثلت کی وجہ سے دھوکا کھانے سے محفوظ رہیں۔

سوال: ایک بار آپ نے فرمایا تھا کہ مرشد کی غیر موجودگی میں مرشد سے درخواست کرنی ہو تو اُن کی طرف توجہ کریں...... تصور نہ کریں۔ توجہ اور تصور میں فرق واضح فرما دیں؟

جواب: تصور یہ ہے کہ کسی کی شکل آنکھوں کے سامنے لے آئیں اور خیال ہی خیال میں یہ محسوس کریں کہ آپ اُس کے سامنے بیٹھے ہیں۔ جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو شیخ کا تصور کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

توجہ یہ ہے کہ آپ ذہنی طور پر پوری طرح مرشد کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اپنے ذہن کو اُن کی طرف مرکوز کر دیں۔

''حصہ''

سوال: کیا مرشد اپنے مرید کو بتا دیتا ہے کہ میرے پاس تمھارا جتنا حصہ تھا، تمھیں دے دیا؟

جواب: جب ہم کسی ملک جاتے ہیں تو وہاں جانے سے پہلے اُس ملک کے قوانین، معاشرتی اقدار اور رسم و رواج کے بارے میں کتب پڑھتے ہیں تا کہ ہمیں وہاں جا کر کوئی دقت نہ ہو۔ اِسی طرح جب ہم کسی ادارے میں جاب شروع کرتے ہیں تو اپنی ڈیوٹی Join کرنے سے پہلے وہاں کے طور طریقے، ڈسپلن اور قوانین کے بارے میں معلومات اکٹھی کر لیتے ہیں تا کہ ادارے میں کام کرتے ہوئے دقت نہ آئے۔ رُوحانیت ایک ایسی فیلڈ اور Discipline of knowledge ہے جس میں داخل ہونے سے پہلے ہم اپنے مفروضوں کی بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید یہی رُوحانیت ہے۔ لیکن جیسے جیسے رُوحانیت کے بارے میں ہمارے Concepts (تصورات) Clear ہوتے ہیں ہمیں پتا چلتا ہے کہ رُوحانیت ہمارے ذہن میں تیار کیے گئے خاکے سے مختلف ہے۔ کنفیوژن وہاں پیدا ہوتی ہے کہ جہاں ہم الفاظ کے ظاہری معانی پر نظر رکھتے ہیں اور اُن کا اصل مفہوم جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ہم رُوحانیت کی راہ پر تو چلنا چاہتے ہیں لیکن اس راہ میں Do's اور Don'ts کو نہیں سننا چاہتے۔ ہم شرائط پوری کیے بغیر رُوحانیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح جاب کے لیے ہمیں کچھ شرائط کو پورا کرنا ہوتا ہے اِسی طرح رُوحانیت کے حصول کے لیے ہمیں اُس کی کچھ Prerequisites کا خیال رکھنا ہوتا ہے، اُنھیں پورا کرنا ہوتا ہے۔ جیسے ہم دریا میں تیرنا چاہتے ہیں تو تیراکی سیکھتے ہیں تا کہ ڈوب نہ جائیں۔

رُوحانیت کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کی اِس طرح ٹریننگ کر دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھال سکے۔ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات اور زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنا سکے۔ جب کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید رُوحانیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے پاس مافوق الفطرت قوت آ جائے جس کا وہ بے مہابا استعمال کر سکے۔ حالاں کہ سچ تو یہ ہے کہ جو رُوحانیت کو اِس طور پر استعمال کرتا ہے وہ اِس کے لیے جواب دہ ہے۔

رُوحانیت کا اصل مقصد تو انسان کی ایسی ٹریننگ کرنا ہے کہ وہ اخلاق کی بلندیوں پر چلا جائے اور دوسروں

کے لیے نفع بخش ہو جائے۔ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''لوگوں میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لئے زیادہ نفع دینے والا ہو۔''

مرشد کا کام آپ کو پرائمری سکول کے ٹیچر کی طرح ہل ہل کر سبق یاد کرانا نہیں، وہ تو اپنے پاس آنے والے شخص کو ابتدا ہی میں تول لیتا ہے کہ اِس کی طبیعت، فطرت اور IQ level کیسا ہے۔ پھر وہ اُسے اُسی کے مطابق Handle کرتا ہے۔

فقیر کے پاس ایک وقت میں بہت سے لوگ آتے ہیں۔ کچھ آنکھ کا اشارہ سمجھ کر عمل شروع کر دیتے ہیں، کچھ کو Indirectly سمجھانا پڑتا ہے، کچھ کو Directly بتانا پڑتا ہے تو کچھ کے ساتھ Rough ہونا پڑتا ہے۔ مرشد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والوں کو یہ بتا دے کہ What is what...... اور پھر وہ نظر رکھے کہ جہاں وہ شخص Detrack ہونے لگے، غلطی کرنے لگے، وہ اُسے سمجھا دے کہ یہاں تم غلطی کرنے لگے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

جب کسی مرید کی تربیت مکمل ہونے لگتی ہے اور مرشد سمجھتا ہے کہ اب مرید اُس مقام پر آ گیا ہے کہ دوسروں کی تربیت کر سکتا ہے اور اُنھیں سبق دے سکتا ہے تو مرشد اُسے کسی دوسرے علاقے میں بھیج دے گا کہ وہاں جا کر لوگوں کی تربیت کرو۔

اب یہ سوچنا درست نہیں کہ میں مرشد کے پاس گیا ہوں تو وہ پہلے دن ہی مجھے بتا دیں گے کہ اُن کے پاس میرا کتنا حصہ ہے اور اُن کے کمرے کی کس Shelf پر کس Jar میں میرا وہ حصہ رکھا ہے۔

''حصہ'' سے مراد تو یہ ہے کہ مرشد کے پاس آنے والے مرید کی صلاحیت، Capacity (استعداد) اور IQ level کیا ہے۔ وہ تربیت کو کس حد تک Absorb کرے اور سیکھے گا اور کس مقام تک جا سکتا ہے۔

ایک مقام اصحابِ کہف کا بھی تھا۔ ایک مقام اُس فقیر کا بھی تھا جو غار میں اِس ایمان کے ساتھ جا بیٹھا کہ میرا رب پتھر میں بند کیڑے کو رزق دیتا ہے وہ مجھے بھی اُس غار میں رزق دے گا۔ ایک مقام وہ بھی ہے کہ غار میں بیٹھے فقیر کے پاس ایک شخص آیا لیکن واپس جاتے ہوئے اپنا کھانا غار ہی میں بھول گیا۔ فقیر نے بھوک سے مجبور ہو کر اُس کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اندر سے آواز آئی کہ یہ ناجائز ہے۔ اُس آواز کو سنتے ہی اُس نے اپنا وہ ہاتھ ہی کاٹ ڈالا کہ یہ ناجائز چیز کی طرف بڑھا کیسے......!

''کوئی شخص ٹریننگ کے ذریعے جس مقام پر جا پہنچا وہ اُس کا حصہ کہلائے گا۔''

بعض اوقات تربیت کے دوران Distractions آتی ہیں۔ کوئی چیز یوں Layer down کر لیتی ہے کہ انسان Half way میں رہ جاتا ہے۔ آگے نہ پیچھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ پر ایک نظر ڈال کر حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا تھا

''تمھارے اِس مرید کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔''

مرشد نے اپنے پاس آنے والے شخص کے بارے میں اندازہ لگایا کہ اس انسان میں اتنی صلاحیت ہے

کہ یہ نیکی کے بلند مقام پر جا سکتا ہے اور پھر اُسی حساب سے اُس کی تربیت شروع کر دی۔ لیکن اِسی دوران اُس شخص کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا جیسے فرض کیجیے کہ اُس کے اکلوتے بیٹے کی Death ہو گئی۔ چوں کہ ابھی تربیت مکمل نہ ہوئی تھی اِس لیے وہ بیٹے کی وفات کو رب تعالیٰ کی مرضی سمجھ کر قبول نہ کر سکا۔ صدمہ اِتنا لیا کہ Distract ہو گیا اور آدھے رستے میں رہ گیا۔ یوں اُس کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک اُسے نہ لے جا سکی۔ ضروری نہیں کہ مرشد پورا حصہ دے کر مرید کو بتا بھی دے کہ میں نے تمھارا حصہ تمھیں دے دیا۔ سوچنا بھی اِس راہ میں شاید زیادہ درست نہیں ہو گا کہ میرا مرشد مجھے انجکشن کے ذریعے علم Inject کر دے گا۔ پھر یہ مرشد کا کام تو بس یہ ہے کہ اپنے پاس آنے والے کو سیدھا راستہ دکھا دے اور اُس راہ کے آداب بتا دے کہ کن چیزوں سے بچنا اور کن کو Follow کرنا ہے اور یہ واضح کر دے کہ جتنی محنت کرتے جاؤ گے اُتنا ہی آگے بڑھتے جاؤ گے۔ اب یہ مرید کا اپنا اختیار ہے کہ وہ اِس راہ میں کتنی محنت کرتا ہے۔

کلاس IV میں ہمیں یہ تو پتا تھا کہ پاکستان میں چار موسم ہیں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ بادل کتنی قسم کے ہوتے ہیں۔ کلاس XIII میں ہمیں یہ تو پتا چل گیا کہ Alkaline and Acidic materials کیا ہوتے ہیں۔ اُن کو پہچاننے کے لیے ہم محلول میں Litmus paper ڈبو کر دیکھ لیتے تھے کہ یہ Alkaline ہے یا Acidic material لیکن ہم کلاس XIII میں آکسیجن بنانا نہیں سیکھ پائے۔ میٹرک میں پہنچنے کے بعد ہمیں انرجی اور پاور کے فرق کا پتا چل گیا اور یہ بھی کہ بجلی انرجی ہے یا پاور اور بجلی کی کتنی اقسام ہیں۔ لیکن تب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ نیوکلیئر سائنس کسے کہتے ہیں۔ M.Sc. میں ہمیں Almost پتا چل گیا کہ Nuclear bomb کیسے بنتا ہے۔

اِسی طرح ہم رُوحانیت میں سیکھتے چلے جاتے ہیں اور سیکھنے کی رفتار کو یہ چیز Determine کرتی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کو کس حد تک قرآن و سنت کے مطابق ڈھالا؟

اگر ہم نے اپنی روزمرہ زندگی قرآن و سنت کے مطابق نہ ڈھالی۔ اگر ہم صبر، ایمان، بندگی اور اطاعت کے حوالے سے آگے نہ بڑھے تو ہم میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت اُتنی تیزی سے نہیں بڑھے گی جتنی بڑھنی چاہیے۔ اِس کا مطلب ہو گا کہ ہم دُنیاوی مشاغل میں زیادہ مصروف ہیں کیوں کہ جب ہمارے اندر ایمان، صبر، توکل، بندگی و عبادت کا جذبہ بڑھے گا نہیں اور ہم دُنیاوی چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ رہیں گے، ہمارا ذہن دُنیاوی اُمور میں مصروف رہے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم علم زیادہ نہیں سیکھ پائیں گے۔ جس طرح Looms خواہ کتنے ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہوں، پاور، ایئر، ہینڈ یا جیٹ Looms ہی کیوں نہ ہوں، کپڑا تب تک نہیں بُنا جا سکتا جب تک تانا بانا نہ تیار کیا جائے۔ اسی طرح جب تک ہم رُوحانیت کا تانا بانا نہیں بُنیں گے، ہم علم نہیں سیکھ سکتے۔ اور وہ تانا بانا یہ ہے کہ ہمارا ایمان رب پر کتنا پختہ ہے......! ہمارا رب پر توکل کتنا ہے......! ہم رب کی اطاعت و بندگی کس درجے کی کرتے ہیں......! ہمارے اندر صبر کتنا ہے......! کیوں کہ اگر یہ سب ہمارے اندر اعلیٰ درجے کا ہو گا تو رُوحانیت کی راہ میں جب ہمیں جھٹکے لگیں گے تو ہم Detrack نہیں ہوں گے۔

ہم بھی اپنی گاڑی میں Alloy wheel لگوانے کے شوقین ہیں۔ ہم Alloy wheel خریدتے ہیں۔ Alloy wheel کی Strength کیا ہے؟ ہماری گاڑی کا Weight اور Maximum speed کیا ہے؟ گاڑی کی بریک کی شدت کیا ہے؟ اِس کا بریکنگ Distance کتنا ہے؟ اگر ہمیں یہ سب پتا نہ ہو اور محض خوب صورتی کی بنیاد پر Alloy wheel کو چن لیں تو امکانات یہ ہیں کہ Full speed سے چلتی ہوئی گاڑی اگر کسی گڑھے میں جا لگے تو wheel ٹوٹ جائے گا لیکن اگر ہمیں پتا ہو کہ Alloy wheel کی Strength یہ ہے کہ اِسے چار ہزار ٹن Press پر Solid steel lump سے Manufacture کیا گیا ہے اور چار ہزار ٹن کا Forging press اِس Wheel کو Shape دے رہا ہے۔ اِس کے بعد اِس کی Machining کر کے اِسے Solid piece میں لے لیا گیا ہے۔ اگر ہماری گاڑی کا وزن دو ٹن ہو اور Loading کے ساتھ یہ تین ٹن ہو جائے اور ہم 260 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلا رہے ہوں اور وہ کسی گڑھے سے جا ٹکرائے تو Wheel کریک نہیں ہو گا۔

اِسی طرح جب ہم رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہیں یا آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ رب تعالیٰ کی دوستی حاصل کرنے کی راہ پر چلتے ہیں تو ہمیں کو آزمایا جاتا ہے، ہمیں جھٹکے لگتے ہیں یہ جانچنے کے لیے کہ رب پر ہمارا بھروسا کتنا مضبوط ہے۔ ہم پر مشکلیں آتی ہیں اور یوں ہمارا صبر آزمایا جاتا ہے۔ رزق کم کر کے ہمارا توکل آزمایا جاتا ہے...... دُنیاوی مصروفیات بڑھا کر یہ Check کیا جاتا ہے کہ یہ عبادت کو ترجیح دیتا ہے یا دُنیاوی Prefrences کو۔

رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہوئے جب یہ دُنیاوی Tests آئیں گے اور ہم نے اپنی استعداد کو بڑھایا نہیں ہو گا تو ہم ناکام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم نے اپنے اندر استعداد پیدا کر لی، ایمان پختہ کر لیا، توکل اِتنا مضبوط کر لیا کہ بدترین حالات اور نقصانات میں بھی یہ یقین رہے کہ رب مالک ہے جس نے پہلے عطا کیا تھا وہ آیندہ بھی عطا کرے گا انشاء اللہ۔ لوگوں کی طرف سے دیے جانے والے دُکھوں پر انسان مسکراتا رہتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے دی جانے والی تکلیف کو بغیر کوئی Reaction show کیے Smiling face کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے۔ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے وقت نکال کر اِس جذبے کے ساتھ عبادت کرتا ہے کہ میرا رب عظیم ترین ہے، وہ اِس قابل ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے۔

جب انسان میں یہ تمام خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں تو پھر وہ Distract نہیں ہوتا۔ پھر وہ ہر وقت رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اُس کا ذہن مسلسل رب کے لطف و کرم اور رب تعالیٰ کے کارخانۂ قدرت پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ جس شدت سے انسان اُس کی طرف متوجہ رہتا اور اُس بارے میں غور و فکر کرتا ہے اُتنی ہی Superior quality کا علم اُسے عطا ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ علم درجہ بدرجہ عطا ہوتا ہے۔ علم کی کوالٹی وقت کے ساتھ ساتھ Improve کرتی ہے اور یہی پرواز ہے۔

پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب علم کی عطا کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب انسان گفتگو کرتا ہے تو خود اپنی آواز،

لفظوں اور گفتگو سے سیکھ رہا ہوتا ہے۔ بولنے سے پہلے وہ خود اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اُس کی زبان سے کیسے جملے ادا ہوں گے۔ لفظ اِلہام کی صورت اُس پر اترنے لگتے ہیں اور وہ بولتا چلا جاتا ہے۔

جب علم سیکھنے کی یہ صورت ہو اور کسی راہ پر چلنے کا یہ انداز ہو تو پھر کون Determine کرے گا کہ حصہ پورا مل گیا یا ابھی اِس میں دس اونس اور پندرہ گرام مقدار کم ہے۔

مرشد محاورتاً یہ کہتا ہے کہ میرے پاس جو حصہ تھا وہ پورے کا پورا تمھیں دے دیا۔ اب جتنی محنت کرتے جاؤ گے، اُسی قدر بلندیوں کی طرف چلے جاؤ گے۔

بہتر ہے کہ ہم حصے یا دوسرے رُوحانی معاملات کے حوالے سے زیادہ ناپ تول میں نہ پڑیں۔ رُوحانیت کی راہ میں کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے یہ سوچا کہ میں ابھی کسی مقام پر پہنچا بھی یا نہیں...... وہ کبھی کسی مقام پر نہ پہنچ سکا۔ جس شخص نے یہ سوچا کہ مجھے اِس راہ میں ابھی تک کچھ ملا یا نہیں، وہ ساری عمر کچھ نہ پا سکا، پتھر کی طرح وہیں پڑا رہا۔ لیکن جس آدمی نے صرف اس بات پر نظر رکھی کہ مجھے قربِ الٰہی اور رب کی دوستی چاہیے اور مجھے دوست قبول کرنا رب کا Prerogative ہے، میرا حق نہیں۔ ایسا شخص رب کو راضی کرنے کے لیے زندگی گزارتا چلا جاتا ہے اور اُسے رب کی دوستی حاصل ہو جاتی ہے۔

یوں کہہ لیجیے کہ جس نے رب تعالیٰ کے ساتھ بے لوث اور یک طرفہ دوستی لگالی اُسے Sooner or later سب کچھ ضرور ملے گا۔

بھائیو! میری گزارش آپ سے یہی ہے کہ کسی دریا میں اُترنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ دریا کی گہرائی کیا ہے؟ لہروں کی Velocity کیا ہے۔ لہروں کا زور اور ڈائریکشن کیا ہے؟ اور سب سے Important یہ کہ مجھے تیرنا آتا ہے یا نہیں؟ یہ سب جاننے اور تیراکی سیکھنے کے بعد دریا میں اُتریں گے تو انشاءاللہ پار لگ جائیں گے۔ لیکن اگر دریا کی گہرائی، لہروں کی Velocity، زور اور Direction کے حوالے سے محض سنی سنائی باتوں پر دھیان دے کر دریا میں اُتر گئے تو ہو سکتا ہے ڈوبنے سے بچ نہ پائیں کیوں کہ سنی سنائی باتوں میں تضاد ہو گا۔ وہ ایک دوسرے سے میل نہ کھا رہی ہوں گی۔ یوں غلط معلومات کی بنیاد پر دریا میں اُترنے کا فیصلہ کر کے ہم ڈوبنے سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے اور پار نہیں پہنچ پائیں گے۔

رُوحانیت کے بارے میں بھی سنی سنائی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے خود اِس راہ کو قریب سے دیکھ اور جان لیں کہ رُوحانیت کا بنیادی مقصد و منزل کیا ہے...... اگر وہ مقصد و منزل بھا جائے تو پھر اُس راہ پر چل پڑیں۔

رُوحانیت کے بنیادی مقصد و منزل سے صحیح طور پر آگاہی نہ ہو تو بعض اوقات انسان راہ کو ہی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔ رب کے قرب و دوستی کے بجائے کشف و کرامات کے حصول کو رُوحانیت کا اصل مقصد و منزل جان لیتا ہے۔ گوجرانوالہ سے دس میل دور گکھڑ کے نام سے ایک علاقہ ہے وہاں ایک صاحب رُوحانیت کی راہ پر چلے اور پہلے مقام پر جنات سے اُن کا واسطہ پڑ گیا۔ وہ اُسی مقام کو منزل سمجھ بیٹھے اور جنات کی مدد سے

لوگوں کے کام کرنے لگے اور پیسہ کمانے لگے۔ جن دنوں لوگوں کا اُن کے پاس آنا کم ہو جاتا وہ اپنی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے۔ جن گاڑی چلاتا لیکن کسی کو نظر نہ آتا۔ وہ گکھڑ سے لاہور تک اسی طرح سفر کرتے۔ لوگوں میں شور مچ جاتا اور یوں اُن کی شہرت بڑھ جاتی۔ اُن کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا۔

یاد رکھیے! جنات پر قبضہ یا کشف و کرامات کا حصول رُوحانیت کا مقصد و منزل نہیں...... رُوحانیت تو نام ہے رب کی دوستی کا...... اور رب کی دوستی کا نشہ اِتنا شدید ہے کہ ایسے انسان کو جلتی آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو وہ رب کی دوستی کی راہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اس لیے رُوحانیت کی راہ پر چلنے سے پہلے اِس کا اصل مقصد اور منزل جان لیں۔ اِس راہ پر چلنے کے آداب اور شرائط سیکھ لیں۔ حصہ کا کیا ہے...... وہ تو مل ہی جاتا ہے۔

راہِ تصوف میں علم وتربیت کی اہمیت

ایک صاحب نے عمرہ وحج کے دوران وارد ہونے والی اپنی کچھ کیفیات کا ذکر کیا۔ بہت خشوع وخضوع سے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر جہاں اُنھوں نے بہت سی دُعائیں مانگیں وہاں یہ درخواست بھی کی "یاباری تعالیٰ! مجھے اپنی معرفت عطافرمادے"۔

معرفتِ الٰہی کی درخواست کرنے کے فوراً بعداُن کے ذہن میں خیال آیا کہ علم کے بغیر معرفت کیسی! بات تو سچ تھی۔ انسان کو جب تک علم حاصل نہ ہوتب تک وہ اچھے اور بُرے کی پہچان نہیں کرپاتا...... جب انسان کے اندر اچھے اور بُرے کی تفریق ختم ہو جائے تو پھر اُس میں اور شعور سے عاری مخلوق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ہم اکثر و بیشتر اولیا کرام کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُن کی برکت سے ہماری دُنیا سنور جائے گی۔ ہمارے کام آسان ہو جائیں گے۔ کوئی تکلیف نہیں آئے گی۔ ہم خوش حال زندگی بسر کریں گے۔

چند ایسے لوگ بھی مل جائیں گے بزرگوں کے پاس جاتے ہوئے جن کی خواہش ہوتی ہے کہ رب کی دوستی مل جائے۔ یہ اور بات کہ اُن میں سے اکثریت کے At the back of mind یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی دوستی ملنے کے بعد ہماری دُنیا آسان ہو جائے گی۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو واقعی اللہ کی دوستی برائے دوستی کے طالب ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ جب ایک طویل عرصہ تک اللہ کے دوست کے پاس جاتے رہتے ہیں تو ایک روز اچانک اُن کے ذہن میں یہ سوال سر اُٹھاتا ہے کہ مجھے چھ، دس، پندرہ سال ہو گئے ہیں اِن بزرگ کے پاس آتے ہوئے لیکن مجھے ملا کیا ہے......؟ میں تو وہیں کا وہیں کھڑا ہوں۔ مجھے تو کبھی نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز سنائی نہیں دی السلام علیکم یاحبیبی!

حقیقت تو یہ ہے کہ اُن بزرگ کی صحبت میں رہنے سے ہماری شخصیت و کردار میں مثبت تبدیلی آرہی ہوتی ہے لیکن ہم اُسے محسوس نہیں کرپاتے۔ وہ بزرگ ہمیں ایک خاص Treatment دے رہا ہوتا ہے جس کا ہمیں ادراک نہیں ہو پاتا۔

کچھ لوگوں کے جسم پر لباس خوش نما اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے تو ہم اُس لباس کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ خوش رنگ اور اعلیٰ کوالٹی کا ہے۔ ہم اپنے لیے بھی ویسا ہی لباس سلوانا چاہتے ہیں۔

یہ جو لباس اِتنا اچھا نظر آرہا ہوتا ہے ہم نے اُس کے حوالے سے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ خوب صورت وخوش نما نظر آنے سے پہلے تک یہ کن کن مراحل سے گزرا ہے۔ اِس کی ابتدا ہل چلانے سے ہوئی۔ ایک کسان نے پورا پورا دن ہل چلایا اور زمین میں بیج بویا۔ پھر پودے کی حفاظت کی۔ جننگ فیکٹری میں اِس روئی کی Ginning ہوئی۔ Spinning mill میں اِس نے دھاگے کی شکل اختیار کی اور اِس کے بعد Weaving mill میں دھاگے کو کپڑے کی شکل دے دی گئی۔ پھر اِس کی Dying کی گئی اور Dying کی Processing مکمل ہونے سے پہلے اِس کپڑے کو مختلف کیمیکلز کے Treatment سے گزارا گیا۔ اِس کے بعد اِس کی Finishing اور Mercerizing ہوئی۔

اِن تمام مراحل سے گزرنے کے بعد وہ خوش نما کپڑا تیار ہوا...... پھر درزی نے اِسے مہارت سے آپ کے جسم کے مطابق سلائی کیا۔ اگر درزی سمجھ دار اور کاریگر ہے تو کپڑے کی تراش خراش آپ کے جسم کے مطابق کرے گا۔ اگر وہ اپنے پیشے میں ماہر نہیں ہے تو ایک لگے بندھے Pattern پر اِس کی Cutting کردے گا اور وہ لباس آپ کے جسم پر خوب صورت نہیں لگے گا۔

اِسی طرح جب ہم کسی درویش، بزرگ یا ولی اللہ کو دیکھتے ہیں تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد شہرت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ ہم کبھی جان نہیں پاتے کہ پچھلے 45 ,40 سال میں وہ کن مراحل سے گزرا ہے، کس کس دُکھ کو سہا ہے اور کس کس امتحان میں پاس ہوا ہے۔ کہاں کہاں اِس کے پاؤں پھسلے اور اِسے دوبارہ محنت کرنا پڑی۔ ہم صرف اُس ولی اللہ کی موجودہ زندگی دیکھ کر اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اُس کے پاس بیٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

جب ہم اِن تمام مراحل پر نظر نہیں ڈالتے اور اُن بزرگ کے موجودہ مقام کو دیکھتے رہے اور اُس کے پاس جا کر بیٹھنے لگے۔ مگر میں نے اپنی زندگی کو خاص سانچے میں نہیں ڈھالا، میری زندگی سابقہ روٹین کے مطابق ہی چل رہی ہے۔

اُن بزرگ کے پاس جا کر میں بیٹھتا تو ہوں لیکن خود کو تبدیل نہیں کرتا، اُن سے کچھ سیکھتا نہیں۔ ہر مقام پر اپنی عقل کو استعمال کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں اُن بزرگ سے کچھ سیکھ نہیں پاتا۔

علم کسی شخص کو Inject نہیں کیا جا سکتا۔ کسی پہناوے کی طرح کسی کو پہنایا نہیں جا سکتا۔ یہ تو ایک Long-drawn process ہے جس سے ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے اور اِس Process سے گزرے بغیر منزل تک انسان نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح ہم نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ تک کا سفر اُس وقت تک طے نہیں کر سکتے جب تک ہم اپنے نفس اور خواہشات کے خلاف جہاد نہ کریں، اِسی طرح ہم فقر تک کا سفر طے نہیں کر سکتے جب تک ہم اپنے آپ کو تبدیل نہ کرلیں۔ ہم خود کو ایک سانچے میں نہ ڈھال لیں۔

وہ سانچا کیا ہے؟ وہ سانچا وہ فقیر ہے جس کے پاس میں جا کر بیٹھتا ہوں۔ جب تک میں اُس کی تقلید نہیں کروں گا اور تقلید کے لیے اپنی عقل و مرضی کو ایک سائیڈ پر اُٹھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ آپ سلیٹ پر ایک Neat تحریر تب تک درج نہیں کر سکتے جب تک آپ اُس پر موجود پرانی تحریر کو صاف نہ کر لیں۔ اگر ہم پرانی تحریر کو صاف کیے بغیر نئی تحریر سلیٹ پر لکھنا شروع کر دیں تو آدھا تیتر آدھا بٹیر بن جائے گا۔ نہ ہم پہلے والی تحریر کو پڑھ پائیں گے نہ بعد میں لکھی جانے والی......

فقیر کے پاس آنے سے پہلے والا علم جب تک ہم مٹا نہیں دیں گے تب تک اُس سے کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ مغربی تعلیم انسان کو بہت تنگ کرتی ہے کیوں کہ مغربی تعلیم Logic کے ذریعے سکھائی جاتی ہے۔ رُوحانی علم تقلید سے آتا ہے، دلیل سے نہیں۔ رُوحانی علم میں دلیل اختیار کرنے سے بھٹکنے کے Chances ہیں۔ دُنیا کا کوئی قاعدہ، کلیہ اور علم خواہ وہ الجبرا کی Equations، کیمسٹری کے Formulas، Trigonometry یا جیومیٹری کی Theories یا Mathematics کے Formulas ہوں یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ دینے یا دوسروں پر خرچ کرنے سے رزق بڑھتا ہے۔ ماں باپ کی خدمت کرنے سے عزت ملتی ہے۔ لیکن ہم سب کا تجربہ ہے کہ دینے سے رزق بڑھتا ہے۔ رُوحانی علم کے حصول میں ہم دلیل کو دخل دینے لگیں گے تو بھٹک جائیں گے۔

معرفتِ الٰہی علم کے بغیر اُن چار دوستوں کی مانند ہے جو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ چاروں نے نماز پڑھنا شروع کی۔ اِسی دوران مؤذن صاحب بھی آ گئے۔ ایک دوست بولا ''بھائی مؤذن! نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے اذان دی یا نہیں؟'' دوسرا دوست پہلے کو مخاطب کر کے کہنے لگا ''بے وقوف یہ کیا کہا تم نے۔ نماز میں اِس طرح بولنے سے نماز جاتی رہتی ہے۔'' تیسرا بولا ''بے وقوف! تمھیں تو کم از کم خاموش رہنا چاہیے تھا۔ تمھارے یوں بولنے اور پہلے کو Correct کرنے سے تمھاری نماز بھی جاتی رہی۔'' چوتھا دوست کہنے لگا ''بھائی! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ نماز کے دوران بولنے سے نماز جاتی رہتی ہے۔''

اگر چاروں دوستوں کے پاس نماز کے آداب کا علم ہوتا تو ایک کے غلطی کرنے سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا دورانِ نماز خاموش رہتا۔ علم کے نہ ہونے کی وجہ سے باقی تینوں نے دورانِ نماز بول کر اپنی نماز بھی کھوٹی کر لی۔

ہم علم کے بغیر فقر، درویشی، رب کی دوستی، قرب اور ولایت حاصل نہیں کر پائیں گے۔

اگر ہم خوش قسمتی سے کسی سمجھ دار بزرگ کے پاس چلے گئے تو وہ کبھی بھی پہلے ہمیں وظائف کی راہ پر نہیں ڈالے گا۔ پہلے ہماری تربیت کرے گا تاکہ ہمیں علم حاصل ہو جائے۔

ایک بات یاد رکھیے کہ علم بھی بغیر تربیت کے کام نہیں کر پاتا۔ علم سے زیادہ تربیت ضروری ہے اور تربیت میں شوق کو دخل ہے۔ جب ہمارے اندر یہ شوق پیدا ہو جائے کہ یہ بزرگ کیسے اِس مقام پر پہنچے تو میں اُس کے Footprints پر چلنے لگوں گا اور اُسی مقام پر جا پہنچوں گا۔ جب وہاں پہنچوں گا تو پھر اُس سے آگے جانے کی تگ و دو کروں گا۔

سوال: اُمتِ مسلمہ کے انتشار کو ختم کرنے کے لیے صوفیاء کرام کیا کر رہے ہیں خصوصاً آپ کا کیا کردار ہے؟

جواب: بھائی! سچ اور حقیقت تو یہ ہے کہ میری کوئی حیثیت اور مقام نہیں۔ تعلیم اور علم میرے پاس ہے ہی نہیں۔ تربیت میری نہیں ہوئی۔ ایک بے حیثیت شخص کیا کردار ادا کرے گا اس لیے آپ مجھے تو Minus کر دیں۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ اُمت مسلمہ میں موجود انتشار کے خاتمے کے لیے صوفیا کیا کردار ادا کر رہے ہیں تو اِس کا Logical جواب تو یہ ہے کہ یہ بات وہ جانیں جو صوفیا کرام ہیں یا جو اُن کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔ مجھ جیسا کندہ ناتراش کیا جان پائے گا۔ لیکن جو آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں سے سن رکھا ہے اُس کے مطابق صوفیا بہت چپ چاپ اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ مینارِ پاکستان پر جلسہ منعقد کرتے ہیں نہ جلوس نکالتے ہیں۔ آپ سے پہلے بھی گزارش کی تھی کہ اگر خدانخواستہ سسٹم میں خرابی کی وجہ سے پورا لاہور تاریکی میں ڈوب جائے تو ایک صاحبِ علم و عقل اور سمجھ دار شخص ایک موم بتی جلا کر گھر کے باہر کھڑا ہو جائے تو اِتنے بڑے شہر میں ایک موم بتی کوئی کام نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ گز Radius میں روشنی پھیلا دے گی۔ دیکھنے والے اُس شخص کو دیوانہ کہیں گے کہ اِتنے بڑے تاریک شہر میں ایک موم بتی لیے کھڑا ہے لیکن اِس ایک شخص کے اُس عمل سے دوسروں کو تحریک ملے گی اور اُس کے دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی موم بتی جلا لیں گے اور رفتہ رفتہ تاریک شہر روشن ہونا شروع ہو جائے گا۔

صوفیا کرام بھی اِسی طرح اپنا کردار ادا کرتے ہیں کہ اپنے حلقۂ اثر میں رب تعالیٰ کی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے احکامات بتاتے رہتے ہیں۔ اُنھیں ترغیب دیتے رہتے ہیں اور اُن کے لیے مثال بنتے رہتے ہیں۔ یہ دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جیسے ہم تالاب میں ایک چھوٹا سا کنکر پھینکیں تو ایک لہر اُٹھتی ہے۔ اُس کے بعد دوسری لہر حتیٰ کہ لہریں کنارے تک پھیل جاتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ صوفیا کرام نہایت خاموشی سے حالات کے تالاب میں اِصلاح کا کنکر پھینکتے رہتے ہیں اور بھلائی کی لہریں بنتی اور پھیلتی رہتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ سارا معاشرہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں صوفیا کرام بھی شاید ایسا ہی کردار ادا کر رہے ہوں گے۔

سوال: بندے کو کیسے احساس ہوتا ہے کہ اُسے رب مل گیا؟

جواب: جس سے مخلوقِ خدا راضی ہو جائے وہ سمجھ لے کہ رب راضی ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ فقیر کے مخالفین کی تعداد بے پناہ ہوتی ہے لیکن اِس کے باوجود وہ خلقِ خدا میں بڑا مقبول ہوتا ہے۔ یہ رب کے راضی ہونے کی ایک نشانی ہے۔

سوال: کیا اِسمِ اعظم اللہ کے ناموں میں سے ہے؟ کیا رب کا قرب اِسمِ اعظم سے حاصل ہوتا ہے؟

جواب: ''اِسمِ اعظم'' یہ دو الفاظ خود اپنی تشریح کر رہے ہیں کہ ''بڑا نام'' اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے سب ناموں میں سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

رب کا قرب اسمِ اعظم سے حاصل نہیں ہوتا البتہ اِسمِ اعظم اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب قربِ الٰہی حاصل ہو جائے اور قربِ الٰہی اُس وقت حاصل ہوگا جب انسان علم اور تربیت کے مراحل سے گزر چکا ہوگا۔

بغیر تربیت کے انسان صاحبِ علم نہیں بنتا۔ صاحبِ علم ہو گا تو اسے رب کا قرب حاصل ہو گا۔ رب کا قرب حاصل ہو گا تو اِسمِ اعظم تک رسائی پا لے گا۔ لیکن تب تک وہ دُنیا کی محبت سے اتنا دُور جا چکا ہوتا ہے کہ وہ اِسمِ اعظم کو استعمال نہیں کرتا۔

سوال: کیا انسان اپنی غلطیوں سے خود سیکھ کر اپنی تربیت کرتا ہے یا کسی ٹیچر کو ڈھونڈنا ضروری ہے؟

جواب: ایک زمانے میں میں نے فلائنگ کے Lessons لینا شروع کیے۔ ہمیں سکھایا جاتا تھا کہ ہمیں جس مقام پر پہنچنا ہو اُس کی Heading ورک آؤٹ کر لیں۔ جس کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں Navigation آتی ہو اور اُس Navigation میں بنیادی چیز یہ پڑھائی جاتی تھی کہ ہر مقام کا ایک Longitude اور Latitude ہے۔ زمین فرضی خطوط سے عرض وطول بلد میں تقسیم کی گئی ہے۔ فرض کریں میں لاہور سے اسلام آباد جانا چاہتا ہوں تو میں پہلے لاہور کا Longitude اور Latitude دیکھ لوں گا اور پھر اسلام آباد کے Longitude اور Latitude کو Work out کر لوں گا۔ چونکہ یہ ایک ہی Sphere میں ہیں۔ Longitude, longitude میں سے اور Latitude, latitude میں سے Minus کر لیے جائیں گے۔ دو Figures ہمارے پاس آ جائیں گے۔ اِن دونوں Figures کو آپس میں Minus کر لیں گے۔ اِس میں سے True poles کا Magnetic difference ایک اور دو Minus ہو جائے گا۔ یوں میری Compass پر Heading آ جائے گی۔

جب میں فلائنگ شروع کروں گا تو ہوا میں پہنچتے ہی میں اپنی Compass پر وہ Heading سیٹ کر لوں گا اور اُس ڈائریکشن میں جہاز کو اُڑاتا رہوں گا۔

اِس میں دوسرے Factors بھی آ جاتے ہیں کہ ہوا کی ڈائریکشن اور Velocity کیا ہے۔ اِسے ہم Wind drift کہتے ہیں۔ میں Wind drift correction میں Mark کر کے فلائی کرتا رہوں گا اور اسلام آباد جا پہنچوں گا۔ ہوا بازی کا یہ بہت پُرانا اور Basic system تھا جو آج بھی سکھایا جاتا ہے۔ اِس کے بعد VOR System آ گیا۔ مختلف جگہوں پر VOR Station لگے تھے جن سے Beep اور Radio signals آتے تھے جنھیں Follow کرتے ہوئے ہم اپنی منزل پر پہنچ جاتے تھے۔

ہمیں پتا ہونا چاہیے کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟ اگر ہماری منزل قربِ الٰہی کا حصول ہے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھیں قربِ الٰہی حاصل ہوا۔ اُن میں سے جن کے حوالے سے ہمارا دل جمے اُن کو Follow کرتے رہیں۔ راستے میں بہت سے مقام آتے ہیں جیسا کہ میں نے Wind drift کا ذکر کیا۔ کہیں Weather مل گیا تو اُسے ہم Circumvent کریں گے اور اُس کے حوالے سے ساری Heading دوبارہ Work out کریں گے۔

رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہوئے Distractions آتی ہیں۔ اگر تو تب تک ہم اُس مقام پر جا پہنچے ہوں کہ ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن Distractions کو خود بخود Avoid کر لیں یا کوئی ایسا شخص ہو

جو Point out کر دے کہ تم راستے سے ہٹ رہے ہو، صحیح راستے پر آ جاؤ...... صحیح راستے کی اِس نشان دہی کرنے والے انسان کو ہم مرشد یا گائیڈ کہتے ہیں۔ گائیڈ کا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ انسان Distraction کا شکار ہو کر راہ سے بھٹکتا نہیں۔

رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہوئے پہلا انعام یا Development یہ ہوتی ہے کہ جنات دکھائی دینے لگتے ہیں اور اُن سے بات ہونے لگتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ شاید منزل آ گئی۔ بہت سے لوگ وہیں رُک جاتے ہیں لیکن اگر آپ کا مرشد Strong ہے تو وہ آپ کو اُس مقام پر رُکنے نہیں دیتا۔ آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے لے جاتا ہے۔ اِس کے بعد کارخانۂ قدرت کی سیر شروع ہوتی ہے تو وہ پھر سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ شاید میں ولی اللہ بن گیا۔ ایک بار پھر یہاں مرشد کام آتا ہے کیوں کہ وہ اُن مقامات سے گزرا ہوا ہے۔ وہ آپ کو رُکنے نہیں دیتا۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کا کوئی مرشد ہو تو وہ رُوحانیت کی راہ میں آپ کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ ورنہ دُنیاوی معاملات میں تو شاید آپ عقل میں اپنے مرشد سے زیادہ ہوں۔

سوال: فقر کی راہ پر چلنے کے لیے دُنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے یا اُسے چھوڑ دینا چاہیے؟

جواب: ہمارے پاس آپ ﷺ کی صورت روشنی کا اِتنا بڑا مینار موجود ہے جو ساری کائنات کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ آپ ﷺ سے زیادہ پرہیزگار و عبادت گزار کوئی نہیں۔ آپ ﷺ اللہ کے محبوب ہیں۔ ایک اور بہت بڑا اعزاز جو کسی کے پاس نہیں وہ یہ کہ خود رب اور رب تعالیٰ کے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دُنیا ترک کی نہ عبادات۔ آپ ﷺ نے دُنیا بھی بھرپور انداز میں گزاری اور دین میں بھی آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم سنت پر عمل کرتے رہیں اور سنت یہی ہے کہ دین کے ساتھ ساتھ دُنیاوی معاملات کو بھی بھرپور انداز میں نبھایا جائے۔

وجدانِ حیات

ہمارے یہاں ایک عام تاثر یہ ہے کہ مغرب میں جو فلاسفرز یا Intellectuals گزرے ہیں اُن کا زیادہ رُجحان مادیت کی طرف رہا۔ اگر تھوڑا گہرائی سے دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے شاگرد علامہ اقبال کی تعلیمات نے بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اگر چہ اِن کا تعلق ایشیا سے تھا لیکن مغرب اِن کی تعلیمات پر ریسرچ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ آج غالباً یہ وہ Asian مسلمان مفکر، عالم اور فلاسفر ہیں جن پر مغرب اور یورپ میں بڑے پیمانے پر تحقیق ہو رہی ہے۔

جب مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی 800 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی تو اُن کے بارے میں چند الفاظ کہنے کے لیے مجھے پاکستان سے مدعو کیا گیا تھا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم، فلاسفر، مفکر اور درویش پر میں کیا بول سکتا تھا اِس لیے جو کچھ کہا نہ اُس کی مجھے سمجھ آئی نہ سننے والوں کو اور میں واپس چلا آیا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا:

1۔ عقل کی ایک Dimension کا تعلق مادیت سے ہے۔

2۔ عقل کے دوسرے حصے کا تعلق اعلیٰ جہتوں یا Spiritual dimension of life کے ساتھ ہے. جسے وہ وجدانِ حیات کا نام دیتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ عقل کے جس حصے کا تعلق دُنیاوی حیات سے ہے وہاں وہ عقل چوہے کا سا کام کرتی ہے. جس طرح چوہا زمین کے اندر سرنگیں بناتا ہے اور اندھیری جگہوں میں رہتا ہے، انسانی عقل کی یہ Dimension ہماری مادی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کو Deal کرتی ہے۔ یہ سب وہ ضروریات ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے زمین سے کام لیا جاتا ہے۔ انسان زمین کا سینہ پھاڑ کر اناج پیدا کرتا ہے۔ زمین سے نکلے پودے سے کپڑا بنتا ہے، رہائش کے لیے زمین پر مکان بناتا ہے اور اینٹوں کو جوڑنے کے لیے جس Material سے کام لیتا ہے وہ Material زمین سے حاصل کردہ اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔

اِس ضمن میں جب مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ عقل کی Spiritual dimension کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان یا دیگر حشرات الارض، پرندے، جانور جس شکل میں آج موجود ہیں، اِس Planet پر زندگی شروع ہونے کے وقت اِس شکل کے نہیں تھے۔ Climatic conditions، ماحول (Environment)

اور اِن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ضروریات اِن کو شکل دیتی چلی گئیں۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں زندگی Evolutionary change کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے کے مطابق یہ Change (تبدیلی) Climatic and environmental compulsions کے تحت وجود میں آتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہماری ضروریات ہمارے علاقائی و جغرافیائی، موسمی و ماحولیاتی اثرات کے تحت تبدیل ہوتی ہیں تو اِسی طرح ہماری عقل کے اُس حصے میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنی عقل کی حاجات و ضروریات کو اعلیٰ کر لیں اور اُوپر کے درجے پر لے جائیں تو عقل کے درجے میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے سوا آٹھ سو سال پہلے یہ فلسفہ پیش کیا تھا۔ اُن کے بعد ایک اور بڑے فرانسیسی فلاسفر Henri-Louis Bergson (1859-1941) جنھیں 1927ء میں لٹریچر میں نوبیل انعام بھی دیا گیا، نے بھی یہی فلسفہ پیش کیا۔ Bergson کا کہنا تھا کہ Intutions اور Immediate آنے والے خیالات Logic اور سائنس کی نسبت Superior ہیں۔ اِس Basic concept (بنیادی نظریے) کو جب اُس نے Further develop کیا تو وجدانِ حیات کو زیادہ اہمیت دی۔ Henri Bergson کے بعد علامہ اقبال نے اِس فلسفے پر بہت کام کیا اور خودی کا جو Concept دیا اور کہا۔

خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

اِس میں یہی سبق پوشیدہ ہے کہ ہم اِتنے بلند خیالات اور Higher dimension میں چلے جائیں کہ رب بندے سے خود پوچھے "تم کیا چاہتے ہو؟"

رُوحانیت، درویشی یا فقیری کی Prerequisites کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفۂ وجدانِ حیات، Bergson کی تھیوری یا علامہ اقبال کے سبق کی روشنی میں دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہمیں اللہ کا قرب اور دوستی تب تک حاصل نہیں ہو گی جب تک ہم زندگی کی اُن اعلیٰ اقدار کو اختیار نہ کر لیں جن کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا۔ مثلاً:

"اللہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

گویا معاف کرنا اعلیٰ قدر ہے۔ اِسی طرح جب ہم کسی کو قرض دیتے ہیں تو اُسے واپس لینا ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مفہوم ہے کہ مقروض کو چھوٹ دو۔ اگر ہم مقروض کے ساتھ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس سے قرض کی واپسی کا تقاضا نہیں کرتے تو یہ اعلیٰ قدر ہے۔ اگر اللہ ہمیں توفیق دے اور ہم سوچ لیں کہ مقروض نے اپنی مرضی سے قرض واپس کر دیا تو ٹھیک ورنہ ہم کبھی اُس سے اُس کا ذکر تک نہ کریں گے تو یہ رویہ اعلیٰ اقدار میں سے ہے۔

کسی نے ہمیں بُرا بھلا کہہ دیا تو ہمارا حق ہے کہ اُس سے پوچھیں کہ بھائی! میرا قصور کیا ہے جو آپ نے مجھے اِتنا بُرا بھلا کہا۔ لیکن اگر ہم مسکرا کر خاموش ہو جائیں تو یہ سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اگر ہم نہ صرف مسکرا کر خاموش ہو جائیں بلکہ اُس شخص کے ناروا سلوک کو یاد تک نہ رکھیں تو یہ اعلیٰ اقدار میں سے ہے جسے رب پسند فرمائے گا۔ کوئی ہمیں تنگ کرے تو ہم بہت خوش گوار لہجے اور نرم الفاظ میں کہیں ''بھائی! شاید آپ کو غصہ کسی اور پر آیا ہوا تھا، میں شکار ہو گیا۔'' یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن اگر میں سوچ لوں کہ شاید یہ کسی پریشانی میں ہے اپنی اس پریشانی کو کسی اور پر نکال نہ سکا، مجھے اپنا سمجھتا ہے سو مجھ پر برس پڑا، کوئی بات نہیں...... تو ہمارا یہ رویہ اعلیٰ اقدار میں سے ہے۔

ہم عقل کے اُس حصے کو اس صورت میں Further develop کر سکیں گے جب ہم اپنی عقل کی جہات کو بہت اُوپر لے جائیں گے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، Bergson اور علامہ اقبال کے سبق کے مطابق فلسفۂ اِرتقا (Evolutionary Development) کو ہم جس قدر سمجھیں گے اُسی قدر ہمارے معاملات تبدیل ہوتے چلے جائیں گے۔

اگر ہم اللہ کے پسندیدہ بندوں میں سے ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اخلاق کے اعلیٰ معیار پر جانا ہو گا اور اُس مقام پر ہم تب جائیں گے جب اُس کے بارے میں سوچنا شروع کریں گے۔ کسی عمارت کی پچاسویں منزل پر جانا ہو تو ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ آپ یہ سیڑھیاں چڑھتے جائیں گے تو پچاسویں منزل پر پہنچ جائیں گے۔

سوال: انسانی جسم کے کس حصے پر تل کی اہمیت زیادہ ہے؟

جواب: ایمان داری کی بات ہے میں نے کبھی اِس علم پر توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ مجھے لگتا ہے کہ تل اور لکیروں وغیرہ پر یقین رکھ کر میرا Focus شاید رب کی طرف سے دوسری چیزوں کی طرف Divert ہو رہا ہے۔

میں علم کے لحاظ سے تو بالکل کورا ہوں لیکن رب کے بارے میں میرے خیالات ایسے ہیں جنھیں ہو سکتا ہے پڑھے لکھے لوگ جاہلانہ خیالات کہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ رب تعالیٰ عظیم ہے، قادرِ مطلق ہے، اِس کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہے کہ میرا رب قادر ہے۔ وہ جب چاہے ستاروں کی چال بدل دے، جسم کے کسی حصے پر تل کے اثرات خواہ کچھ بھی ہوں، رب تعالیٰ جب چاہے اُنھیں تبدیل کر دے۔ ہاتھ کی لکیریں جو بھی کہتی ہوں رب اُن لکیروں کے کہنے کے خلاف بھی کر دے گا کیوں کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ یہ سب علوم موجود ہیں۔ میں اِن کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن اِن پر توجہ بھی نہیں دیتا کیوں کہ خدشہ یہی رہتا ہے کہ رب پر میرا جو Focus ہے اُس میں کسی قسم کی Deviation نہ آ جائے۔ یہ سب چیزیں کسی قسم کی Distraction کا باعث نہ بن جائیں۔

میں اپنی ساری توجہ اپنے رب پر رکھنا چاہتا ہوں اور رب تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ ہیں۔ اگر ان دو

ہستیوں کو میں نے پکڑے رکھا اور اہلِ بیت کی عزت و احترام کرتا رہا تو پھر مجھے اِن معاملات میں پڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ بھی رب پر اندھا اعتبار کر کے دیکھیے وہ مایوس نہیں کرے گا۔ پھر آپ لکیروں، تلوں اور ستاروں کے اثرات بھول جائیں گے۔

اپنے مرشد صاحب سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک روز بیٹھا تھا۔ ایک اور صاحب بھی وہاں کچھ حساب کتاب سیکھنے آیا کرتے تھے۔ اُس روز وہ کچھ Calculations کرنے کے بعد مجھے کہنے لگے ''شاہ صاحب! جو کمانا ہے دو ڈھائی سال میں کما لیجیے اِس کے بعد مشکل ہی مشکل۔'' اُن صاحب کو اندازہ نہیں تھا کہ مرشد صاحب جو مجھے دوسروں کے سامنے ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں، اُن کے دل میں میرے لیے کتنا پیار ہے۔ اُن صاحب کی بات سن کر مرشد صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا، قدرے جلال میں آ کر اُن سے کہنے لگے ''یہ کیسے کہہ دیا تم نے؟'' وہ بولے ''جناب! آپ کے سکھائے گئے علم کے مطابق یہ سب Work out کیا۔ یہ دیکھیے فلاں ستارے کی یہ چال اور فلاں کی یہ چال ہے اور End پر یہ پتا چل رہا ہے کہ دو ڈھائی سال کے بعد مشکل وقت ہے۔'' مرشد صاحب نے فرمایا ''حساب تو تم نے بالکل درست لگایا لیکن شاید تم بھول گئے کہ دُنیا میں کچھ ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جنھیں رب اِتنا علم انعام کے طور پر عطا فرما دیتا ہے کہ وہ اُنگلی کے اشاروں سے ستاروں کی چالیں یا راستے بدل دیتے ہیں۔'' یہ کہنے کے بعد اُنھوں نے آسمان کی طرف اُنگلی اٹھائی اور کہا ''بدل دے بھئی چال۔'' اور پھر اُن صاحب سے کہا ''اب دوبارہ حساب لگاؤ۔'' کچھ ہی دیر بعد باوجود سردی کے وہ صاحب پسینے میں بھیگے ہوئے تھے کیوں کہ سارا حساب بدل چکا تھا۔ میں اِس واقعہ کا خود گواہ ہوں۔ میری گزارش ہے کہ اِن باتوں پر دھیان نہ دیجیے کہ ستارے، لکیریں اور تل کیا کہتے ہیں۔ آپ ایک بار رب ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ کر دیکھیے اور یہ اندھا اعتبار رکھیے کہ میرا رب قادرِ مطلق ہے، اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ آپ اِتنا اندھا اعتبار رب پر کر کے تماشا دیکھیے وہ آپ کے معاملات کو کتنی خوب صورتی سے آپ کے مفادات کی طرف موڑ دیتا ہے۔

کافی پرانی بات ہے، گرمیوں کا موسم تھا، میں کہیں جانے کے لیے ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ گرمی کی وجہ سے مکیشن (Moccasin) پہن رکھے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے میں بیٹھا تھا اور ایک پاؤں سے مکیشن اُتارا ہوا تھا۔ ایک صاحب تیسری لائن سے اُٹھ کر میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے ''آپ کے مرشد کون ہیں؟'' میں نے سوٹ پہنا ہوا تھا، ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے اُنھیں کہا ''جناب! میرے حلیے سے کہیں آپ کو دکھائی دیتا ہے کہ میرا کوئی مرشد ہو گا۔ مجھ سے تو آپ جام و ساغر اور مے خانے کی بات کیجیے۔'' لیکن وہ مُصر رہے کہ آپ کے جو بھی مرشد ہیں وہ بہت Powerful آدمی ہیں۔ پھر بتانے لگے کہ آپ کے تلوے کے نیچے میں ایک لکیر ہے جو اِتنی نمایاں اور بڑی ہے کہ اِتنی دُور سے بھی مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لائن اُس شخص کے پاؤں میں ہوتی ہے جس کا مرشد بہت Powerful ہو۔

یہ سب علم اپنی جگہ موجود ہیں لیکن میں اِن کی طرف راغب نہیں ہوتا البتہ آپ کی دلچسپی کے لیے عرض کر

دیتا ہوں کہ اگر کسی شخص کی درمیان والی اُنگلی کی سائیڈ پر تل ہو تو وہ بہت ترقی کرتا ہے (یہ کہا جاتا ہے۔ میرا اس پر ایمان بالکل نہیں۔) اگر ہاتھ میں دل کی لکیر کے اُوپر تل ہو تو ایسا شخص لوگوں کے معاملات میں نرم دل ہوگا۔ Decisions لینے میں بہت Strong ہوگا۔ پاؤں میں جہاں اُنگلیاں آ کر جُوتی ہیں اُس پنجے کے نیچے تل ہو تو ایسا شخص سفر بہت کرتا ہے۔ کسی آدمی کے Upper arm کی Inside پر تل جتنا نمایاں ہو وہ اُتنا ہی مال دار ہوگا۔ لیکن اِن سب باتوں پر ایمان مت لے آیئے گا کیوں کہ اِن میں بہت سے Factors ہوتے ہیں مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے Upper arm کی Inside پر تل ہو لیکن وہ بھیک مانگ رہا ہو۔ آپ بھاگے بھاگے میرے پاس آئیں گے کہ آپ نے تو کہا تھا کہ ایسا شخص دولت مند ہوتا ہے لیکن وہ تو فقیر ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ وہ فقیروں میں زیادہ مال دار ہو۔ کسی چپڑاسی کی اُنگلی پر تل آ گیا تو آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ آپ نے تو کہا تھا ایسا شخص بہت ترقی کرتا ہے جب کہ وہ تو چپڑاسی ہے۔ پتا چلے گا کہ وہ شخص چپڑاسیوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

یہ سب بہت Relative چیزیں ہیں...... اِن پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ رب کے ساتھ تعلق مضبوط کر لیا جائے۔ دُعا کی، رب نے پوری کر دی۔ دل میں کوئی خواہش کی، رب تعالیٰ نے پوری کر دی۔ کسی ایسے شخص سے ملنے کو دل چاہا جو دُنیا سے تین ہزار سال پہلے جا چکا ہے، رب نے ملاقات کرا دی۔ یہ راہ بہتر ہے یا ہاتھ کی لکیروں یا تلوں کا علم؟ آپ رب سے تعلق کی راہ پکڑیے۔

سوال: نفس کی جائز خواہشات کی کیا سوچ کر نفی کرنی چاہیے کیوں کہ دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں رب کی ناشکری نہ ہو جائے؟

جواب: نفس تو لطائف میں سے ایک ہے۔ رب تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے جیسے امارت کے ساتھ غربت، خوش حالی کے ساتھ تنگ دستی، خوف کے ساتھ امن، صحت کے ساتھ بیماری، علم کے ساتھ جہالت۔ اِسی طرح رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ انسانی جسم کے نو لطائف میں قلب کے بالمقابل نفس موجود ہے...... نفس ہمیں ہمیشہ بُرائی کی طرف لے جائے گا۔

اگر ہمارا نفس یہ کہتا ہے کہ پلنگ پر سویا جائے تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زمین پر سونا سنت ہے یوں نفس مجھ سے ایک سنت ترک کرا رہا ہے۔

اِتنی بے ضرر خواہش کے پیچھے بھی نفس چھپا ہے۔ اِس لیے درویش کہتے ہیں اگر رُوحانی ترقی چاہیے تو نفس کی ہر خواہش کی نفی کر دیں کیوں کہ نفس کبھی صحیح سمت لے جا ہی نہیں سکتا۔

سوال: اگر کوئی بزرگ بیعت نہ کرتے ہوں تو اُن سے راہنمائی کیسے لی جا سکتی ہے؟

جواب: بیعت کا Underline مقصد یہ ہے کہ کسی کو اُستاد مان کر اُس کی Guidance میں اپنی زندگی کی راہ کو اُستوار کر لیا جائے۔ اگر کوئی آدمی داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ جا کر اُن کی رُوح سے مخاطب ہو کر عہد کرے کہ میں نے آپ کو اپنا مرشد مانا تو اُس پر فرض ہو جائے گا کہ وہ حضرت داتا گنج بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیمات پر

عمل کرنا شروع کر دے اور اُن کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا شروع کر دے۔

اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میری زندگی کا انداز گناہوں میں ڈوبنے والا ہی رہے اور میں کسی بہت بڑے بزرگ کی بیعت اس نیت سے کر لوں کہ مجھے کشف و کرامات حاصل ہو جائیں۔ یاد رہے، ایسا نہیں ہوتا۔ بیعت سے یہ ہوگا کہ میرے اُوپر ایک Compulsion آ جائے گی کہ میں اُن کی بتائی راہ پر چلنے لگوں گا۔

ہم بیعت پر مُصر کیوں ہوتے ہیں؟ بیعت پر مُصر رہنے کے بجائے آپ اُس بزرگ کو Follow کرنا شروع کر دیں جس کو Follow کرنے کی خواہش آپ کے اندر موجود ہے۔

اگر باپ اپنے وقت کا مانا ہوا Body builder ہے، وہ اپنے بچوں سے کہتا ہے۔ ''بیٹا! اگر تم صبح اُٹھ کر فلاں فلاں Exercise کر لیا کرو تو تمھاری باڈی کے فلاں فلاں مسلز Develop ہو جائیں گے، تمھاری باڈی خوب صورت ہو جائے گی، تمھارے اندر چُستی آئے گی۔'' اب بیٹے مجھ جیسے ہیں۔ باپ کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ ایک ملازم کا بیٹا وہاں سے گزرتے گزرتے نہ صرف وہ بات سن لیتا ہے بلکہ اُسے اپنے ذہن میں رجسٹر کر کے بتائے گئے انداز میں Exercise بھی شروع کر دیتا ہے اور Exercise کے تمام فوائد حاصل کر لیتا ہے۔ بات تو عمل کی ہے جو نصیحت پر عمل کرے گا، فائدہ پا لے گا۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو قرآن پاک کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے بڑے فائدے میں ہیں حالاں کہ وہ مسلمان نہیں۔ اِس کے برعکس کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں کہ کبھی یہ جاننے کی کوشش تک نہیں کی قرآن کا پیغام کیا ہے، اِس کی تعلیمات کیا ہیں؟ فائدہ تو اُسے ملے گا جو عمل کرے گا۔

ہم کسی کو بھی Follow کر لیں چاہے بیعت کی ہو یا نہ کی ہو...... فائدہ ہمیں حاصل ہو جائے گا۔

سوال: حج کے دوران خانہ کعبہ پر جب بھی نظر پڑتی تو دل سے بے اختیار دُعا نکلتی ''یا اللہ! مجھے اپنی معرفت عطا فرما۔'' لیکن ہر بار دُعا کے ساتھ ہی زوردار خیال آتا ''علم کے بغیر معرفت کیسی؟'' اِس خیال کا آنا کہیں Rejection تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری درخواست کو اِنتہائی وضع داری کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہو؟

جواب: میں تو اِنتہائی Optimistic انسان ہوں۔ ہر شے کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہوں اور اچھا پہلو دیکھتا ہوں۔ میں تو اسے یوں دیکھوں گا کہ رب تعالیٰ اِنتہائی مہربان ہے۔ اُس سے آپ نے اِنتہائی بلند پایہ چیز مانگی ہے لیکن اس کے لیے بنیادیں بنانا بہت ضروری ہے۔ رب تعالیٰ نے آپ کو گائیڈ کیا ہے کہ علم حاصل کر لو معرفت مل جائے گی۔ یہ تو ایک لحاظ سے Confirmation ہے کہ اگر علم حاصل کر لیا تو معرفت حاصل ہو جائے گی۔

معرفت بغیر علم کے ملے تو بے کار ہے...... یہ Rejection نہیں Indirect acceptance ہے۔

جن کی کتب پڑھ کر ہم سر دُھنتے ہیں سکول و کالج کے معیار کے مطابق یہ اَن پڑھ لوگ ہیں، لیکن یہی وہ

لوگ ہیں جنھوں نے بڑی بڑی گتھیاں سلجھائی ہیں۔ایک سوال "لیڈر کیا ہوتا ہے؟" کے جواب کے لیے لمبی لمبی بحثیں کی جاتی ہیں اور Management میں Chapters پڑھے جاتے ہیں۔ایک درویش نے اس کا بہت مختصر لیکن انتہائی خوب صورت جواب دیا "لیڈر وہ ہوتا ہے جو Credit لینے میں سب سے پیچھے اور Discredit لینے میں سب سے آگے ہوتا ہے۔"

جنھیں معرفت حاصل ہوتی ہے اُن کا علم بہت بلند پایہ ہوتا ہے۔آپ اُن سے دُنیا کے کسی علم کے بارے میں سوال کریں وہ فر فر بولنا شروع کر دیں گے۔

نشست نمبر 25

رب تعالیٰ پر بھروسا

رب تعالیٰ نے انسان کو ایک عجیب Complex مشین بنایا ہے۔اس کے کل پرزے اِتنے دقیق اور نازک ہیں کہ انسان اپنے آپ کو جتنا جی چاہے کسی بھی ڈگری تک Trained کر لے پھر بھی کہیں نہ کہیں کچھ ابہام سر اُٹھاتے رہتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک خاموشی چھا جاتی ہے۔

رُوحانیت میں ایک Term استعمال ہوتی ہے "انقباض" جو لفظ "قبض" سے Derive کی گئی ہے۔ جب رُوحانی کیفیات وقتی طور پر جامد ہو جائیں...... جو کہ ہوتی رہتی ہیں...... خیالات، اِلقا، رویا، الہام، کشف یک لخت جامد ہو جائیں، علمی نکتے ذہن میں آنا بند ہو جائیں تو اِسے انقباض کہتے ہیں۔

روز مرہ زندگی میں کبھی نہ کبھی انسان "انقباض" کا شکار ہو جاتا ہے اور ایسی ذہنی کیفیت میں چلا جاتا ہے کہ کوئی ذہنی Exercise کرنے کو جی نہیں چاہتا۔لیکن یہ کیفیت بہت کم عرصے کے لیے ہوتی ہے جیسا کہ مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

"درویش کے اندر آبِ حیات بہتا ہے، اس پر اضطرار کی کیفیت بہت وقتی ہوتی ہے۔کچھ ہی دیر بعد وہ دوبارہ اطمینان و سرخوشی کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔"

آج معلوم نہیں کیوں میں اس ذہنی کیفیت میں چلا گیا۔ذہنی ورزش کو دل نہ چاہ رہا تھا۔سوچا کہ آج آپ رُوحانیت، دین دُنیا سے متعلق جو بھی سوال کرنا چاہیں، کر لیں لیکن سوال زیادہ مشکل اور علمی نہ ہوں کیوں کہ میں اَن پڑھ آدمی ہوں۔

سوال: دُنیاوی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں؟

جواب: آپ نے پنجابی زبان کا محاورہ سنا ہوگا "موسیٰ ڈریا موت توں، موت اگے کھڑی۔" میں جتنا زیادہ گھبراتا ہوں کہ ہم اپنی دُنیاوی مشکلات کو تسبیحات و وظائف سے حل کرنے کے بجائے اُس طریقے سے حل کریں جو رب تعالیٰ بندے سے توقع رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ہر وقت مجاہدوں کی طرح عملی جدوجہد کے لیے کمربستہ رہیں اور اپنے رویوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔ہماری ساری محنت اور سوچ مثبت سمت میں ہو۔

ایک جملہ اکثر ٹی وی پر دیکھنے اور سننے میں آتا ہے، لیڈرز بھی اُسے بکثرت استعمال کرتے ہیں "ہم ایک

نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔'' دراصل ہم طے شدہ صحیح راہ پر چلنے کے بجائے اُس میں اپنی مرضی شامل کر کے خراب ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے ''ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔'' اگر ہم کہتے ہیں، ہر انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ وظیفہ کرتا ہے۔

پوری دُنیا میں جہاں Left-hand drive ہے...... جیسا کہ ہمارے ہاں ہے...... وہاں دائیں طرف سے آنے والی ٹریفک کا Right of way ہے۔ ہم اپنے ملک میں تاریخ رقم کر رہے ہیں کہ Left سے آنے والی ٹریفک کو Right of way کر دیا ہے...... یہ ہم نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں ٹریفک انجینئرنگ کے حوالے سے باقاعدہ ایک ادارہ موجود ہے TEPA۔ پوری دُنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ چھوٹی سے بڑی سڑک پر Approach کریں تو Right of way بڑی سڑک استعمال کرنے والوں کا ہوتا ہے اور اس میں بھی Preference دائیں طرف سے آنے والی ٹریفک کی ہوتی ہے۔ چھوٹی سڑک سے بڑی سڑک پر جاتے ہیں تو دُنیا بھر میں ایک نشان ہوتا ہے دو Broken lines اور اُس کے پیچھے Triangle (تکون) Paint کی ہوتی ہے۔ جس کا مطلب ہے Give way۔ ہم نے Main Road پر سپیڈ بریکر بنا لیے اور چھوٹی سڑک والوں کو Right of way دے دیا...... یوں ہم نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔

سوال: آپ نے اپنی کتابوں میں اہلِ فقر کی مختلف عبادات کا ذکر کیا ہے۔ جیسے مغرب کی نماز کے بعد نوافل اور جمعہ و اتوار کو صبح 9 اور 10 بجے کے دوران دو نفل...... کیا ان عبادات کے لیے پہلے اجازت لینا ہو گی؟

جواب: یہ نوافل کوئی بھی پڑھ لے، اجازت کی ضرورت نہیں۔

سوال: ایک ہاتھ میں دُنیا اور دوسرے میں دین لے کر چلیں تو بہت سی رُکاوٹیں آتی ہیں۔ ایسے میں کس طرح خود کو مضبوط کریں؟

جواب: دُنیا میں جس چیز کا جتنا بڑا انعام ہے اُس کے لیے اُسی قدر محنت وجدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اگر ہم رب تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی نفسانی خواہشات کی شدت سے مخالفت کرنا پڑے گی۔

جہاں اختیار نہ ہو وہاں پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ یہ دین اور دُنیا دونوں کا اُصول ہے۔

رب تعالیٰ نے ہمیں سیدھی راہ دکھانے کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ اگر ہم سیدھی راہ پر چلیں گے تو انعام بہت بڑا ہے۔

انسان کمزور نہ رہے اور مضبوط ہو جائے، اِس کا حل میرے ذہن میں یہی ہے کہ انسان صحیح راستے پر چلنے کی بھرپور کوشش کرے اور رب تعالیٰ سے توفیق مانگتا اور اپنی کوششوں کی قبولیت کی دُعا کرتا رہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نہ صرف اُس انسان کو توفیق بخش دیتا ہے بلکہ اُس کی تھوڑی کوشش کو قبول کر کے اُس کا زیادہ اجر بھی عطا کر دیتا ہے۔

سوال: نومولود بچے کو گھٹی دینے کے میڈیکل فوائد کیا ہیں؟

جواب: انگریز چونکہ نومولود بچے کو گھٹی دینے کے خلاف ہیں اِس لیے وہاں بچوں کو پیدائش کے وقت Jaundice ہو جاتا ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں بچوں کو گھٹی ضرور دی جاتی ہے۔ گھٹی چونکہ جڑی بوٹیوں سے بنتی ہے، اِس میں شہد بھی ہوتا ہے اِس لیے گھٹی دینے سے نومولود کے پیٹ کی صفائی ہو جاتی ہے اور اُسے یرقان نہیں ہوتا۔

سوال: کیا رُوحانیت یا تصوف کی راہ پر چلے بغیر دُنیا و آخرت سنواری جا سکتی ہے؟

جواب: تمام بنی نوع انسان جنھیں اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرما دے اور توفیق بخش دے اُن کے پاس آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ قرآن پاک کے تمام احکامات مکمل جزئیات کے ساتھ وہاں Applicable دکھائی دیتے ہیں۔

بہت زیادہ ریسرچ میں جانے کے بجائے اگر ہم محض آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی پیروی کر لیں، سنت کی اتباع کر لیں تو دُنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔

سوال: کوئی ایسا طریقہ بتا دیجیے کہ جاب اور بزنس کے معاملات میں مشکلات سے بچ جائیں؟

جواب: مشکلات تو ہمیشہ سے ہی رہی ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کو مالی لحاظ سے جس تنگی کا سامنا تھا آج ہماری زندگیوں میں اُس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے۔ دیانت، سچائی، ایمان داری کو اگر ہم اپنا لیں اور ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں، رب تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرتے جائیں تو ملازمت ہو یا بزنس...... رب تعالیٰ کامیابی ضرور عطا کرتا ہے۔

معاملہ خراب وہاں ہوتا ہے جہاں ہم اللہ کے وعدے پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی عقل پر بھروسا کرتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری سے مسلمان کو منع کیا گیا ہے۔ پراڈکٹ کے نقص کو واضح کرنے اور ناپ تول پورا کرنے کا حکم ہے۔ لیکن ہماری عقل ہمیں سمجھاتی ہے کہ ہم اپنے اُس Competitor کو Face نہیں کر پائیں گے جو بجلی و ٹیکس چوری، ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری کرتا ہے۔

لیکن جب انسان اپنی عقل کے بجائے رب تعالیٰ کے احکامات پر بھروسا کرتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ نفع ہو یا نقصان...... میں تو رب کی بات ہی مانوں گا۔ تجربہ و مشاہدہ یہی ہے کہ ایسے انسان کی کمائی میں دوسرے لوگوں کی نسبت بے پناہ برکت ہوتی ہے۔ اِس لیے ہم اپنی عقل کی آواز کو Shut up کرا دیا کریں اور اپنے رب کے احکامات پر ہی عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ بزنس و ملازمت دونوں میں برکت عطا کرے گا۔

سوال: اللہ پر یقین و ایمان کیسے پختہ کریں؟ پتا ہے کہ ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے پھر بھی اندر ایک بے چینی و بے یقینی کیوں رہتی ہے؟

جواب: ہم سب کا رب تعالیٰ پر یقین تو پختہ ہے لیکن رب پر بھروسا اُتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ ہمارا پورا یقین ہے کہ ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ جو کرتا ہے وہ ہمارے مفاد میں ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ بہتر جانتا ہے

کہ ہمارے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔

ہمارا یقین و ایمان تو پختہ ہے لیکن بھروسا ڈگمگا جاتا ہے۔ فلاں خاتون ہماری والدہ ہیں...... یہ یقین ہے۔ ہم گھر جائیں گے تو وہ ہمیں کھانا دیں گی، ہمارا بیڈ تیار کریں گی، یہ سب ہمارا بھروسا ہے۔ ہمیں کبھی اپنے ہمسائے سے جا کر یہ نہیں کہنا پڑتا کہ ہماری والدہ سے سفارش کر دیں کہ وہ ہمارا خیال رکھیں کیوں کہ ہمیں اپنی والدہ پر پورا بھروسا ہوتا ہے کہ وہ ضرور ہمارا خیال رکھیں گی۔ رب کے معاملے میں ہمارا یقین تو مضبوط ہے لیکن بھروسا نہیں۔ ہم اس بات کو Guaranteed نہیں لیتے کہ میرا رب موجود ہے، وہ بہتر ہی کرے گا...... میں وہ ڈیوٹی پوری کروں جو میرے ذمہ ہے، اس کے بعد رب کا کام ہے۔

جب انسان کو یہ بات سمجھ آ جاتی ہے تو مسائل حل ہونے لگتے ہیں۔ اگر مجھے یہ سمجھ آ جائے کہ میری ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ بھرپور کوشش و محنت کروں۔ اس کے بعد رب کا کام ہے کہ وہ میری محنت کا بہترین اجر مجھے عطا فرمادے۔ اگر وہ اجر اور میری محنت و جدوجہد کا نتیجہ میری مرضی کے مطابق ہو تو میں رب تعالیٰ کا شکر ادا کروں اور اگر اجر و نتیجہ میری مرضی اور توقعات کے برعکس ہو تو رب تعالیٰ پر اپنے بھروسا کو ڈگمگانے نہ دوں اور اپنے آپ کو سمجھاؤں کہ میرا رب بہتر جانتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ رب جو کرتا ہے وہ ہمیشہ میرے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ اِس لیے میں اگر وقتی ناکامی کو ہنستے مسکراتے قبول کر لوں تو رب کسی اور جگہ مجھے ضرور کامیابی عطا فرمادے گا۔

یاد رکھیے! جب ہم رب کے فیصلوں کو ہنسی خوشی تسلیم کر لیتے ہیں تو رب تعالیٰ ہمیں کسی اور جگہ ضرور Compensate کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کسی کی محنت اپنے ذمہ اُدھار نہیں رکھتا بلکہ اُس کا اجر کئی گنا بڑھا کر ہمیں عطا کر دیتا ہے۔

اگر میں نے کسی ایسی چیز کے لیے کوشش کی جو میرے لیے فائدہ مند نہیں ہے تو رب تعالیٰ میری محنت کا اجر وہاں تو مجھے نہیں دے گا لیکن اُس محنت کا اجر مجھے کسی ایسی جگہ مل جائے گا جہاں میں نے محنت نہیں کی ہوگی۔

اگر ہم اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں تو بہت سے ایسے واقعات ہمیں ملیں گے کہ Effort کے باوجود کوئی صلہ نہ ملا۔ وہاں ایسے واقعات بھی یاد آئیں گے جہاں ہم نے کوئی Effort نہ کی تھی لیکن از خود کامیابی ہمارے در تک چلی آئی۔ یہ ساری رب تعالیٰ پر بھروسے کی بات ہے۔

سوال: کیا ستاروں کے اثرات لازمی طور پر انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ستاروں کا علم موجود ہے اور یہ ایک Branch of Science ہے۔ لیکن اس پر بھروسا کرنا اور یہ سمجھنا کہ ستارے ہماری تقدیر بدل سکتے ہیں، درست نہیں۔ اسلام میں اِن باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ ہمارے ایمان کے مطابق یہ صرف رب ہے جو کائنات چلا رہا ہے اور جو رب چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔

علم و حکمت

ایشیا میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بہت مشہور ہوئے لیکن ان میں سے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے کلام پر بہت سے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ لوگ اُن کی بات کی اصل رُوح پر غور کرنے کے بجائے ظاہری الفاظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف تحریریں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے جو لہجہ اور اُسلوب اپنایا اُس میں شدت ہے۔

دراصل رُوحانی علوم یا Mystic sciences میں بات کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں بات کو سمجھانے کے لیے بزرگانِ دین نے حکایات کا سہارا لیا۔ Human psychology کے مطابق اگر کسی کو براہِ راست نصیحت کی جائے تو وہ دُور بھاگے گا لیکن اگر اسی نصیحت کو کسی دلچسپ لطیفے یا قصے کی صورت میں بیان کر دیا جائے تو اس کے مثبت اور دیرپا اثرات سامنے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی سابقہ اُمتوں کے مختلف قصے بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے رب تعالیٰ نے مختلف Warnings دیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

کل ایک محفل میں کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ادیب نے شاعر سے کہا ”خدارا کوئی کلام مت سنایئے گا۔“ پھر ایک لطیفہ سنانے لگے کہ ایک شخص کے پیچھے ایک آدمی بھاگا جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا ”بھائی! ماجرا کیا ہے؟ کیوں اُس شخص کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟“ وہ بولا ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم دونوں شاعر ہیں، اُنھوں نے اپنا کلام سنا دیا لیکن میرا کلام نہیں سن رہے۔“ اِس لطیفے میں بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو ایسا نہ کر لیں کہ سننے والا اُٹھ کر بھاگ جائے۔

حکیم بزرجمہر نے کسی بادشاہ سے کہا کہ فلاں علاقے میں ایک ایسی جڑی بوٹی ملتی ہے کہ اگر وہ مُردے کو سونگھا دی جائے تو وہ اُٹھ بیٹھتا ہے۔ بادشاہ نے اپنے غلاموں کو اُس بوٹی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ شہر شہر ملک ملک اُس کی تلاش میں گھومتے رہے لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ جب وہ مایوس ہو گئے تو اُنھیں ایک فقیر نظر آیا، اُنھوں نے سوچا کہ یہ اللہ والا شخص ہے شاید اُس بُوٹی کا کوئی سراغ دے سکے۔ جب اُنھوں نے اُس فقیر سے بوٹی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگا ”دُنیا میں کوئی ایسی بوٹی وجود نہیں رکھتی۔ جس شخص نے بھی تمھارے بادشاہ کو اس بوٹی کے بارے میں بتایا ہے وہ صاحبِ علم و حکمت تھا۔ اُس نے جس بُوٹی کا ذکر کیا اُس سے مراد کوئی

پودا نہیں بلکہ گیان اور دھیان ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اللہ سے لَو لگا لے، اپنے من کو مار لے تو اُس کا دل زندہ ہو جاتا ہے۔''

حکیم بزرجمہر نے کس خوب صورتی سے اللہ سے لَو لگانے کی اہمیت کو بیان کر دیا۔ ہم بھی علم لدنی یا رُوحانیت کے بارے میں باتیں پڑھتے ہوئے بادشاہ اور اُس کے غلاموں کی مانند الفاظ کی رُوح کو نہیں سمجھتے اور یوں آگے بڑھنے کے بجائے اِس راہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

سوال: وہ کون سا علم ہے جس کو حاصل کیے بغیر معرفت نہیں ملتی......؟

جواب: جس طرح ہمارے ذہن میں یہ Clear نہیں کہ جمہوریت کے نتیجے میں ترقی آتی ہے یا ترقی کے نتیجے میں جمہوریت، اِسی طرح یہ بھی واضح نہیں کہ معرفت علم کے ذریعے آتی ہے یا علم معرفت کے ذریعے۔

میرے خیال میں یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ آتی ہیں۔ جب انسان اللہ سے لَو لگا لیتا ہے تو پھر اُس کے دل و دماغ میں سوائے رب کے کسی اور چیز کا خیال نہیں رہتا۔ ایسے میں انسان ہر لمحہ رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اُس کا ذکر و ثنا کرتا ہے، اُس سے گفتگو کرتا ہے تو اُسے رب کی قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب رب کی قربت اسے حاصل ہوتی ہے تو علم کے دروازے اُس پر کھلنے لگتے ہیں۔ جب یہ دروازے کھل جاتے ہیں تو اُسے دانائی بھی عطا ہو جاتی ہے۔ ضروری چیز معرفت یا دانائی نہیں، ضروری یہ ہے کہ اگر ہم کوئی پھل کھانا چاہتے ہیں تو اُس کا پودا گھر میں لگانا ہو گا۔ اُس کی آبیاری و پرورش کرنا ہو گی۔ پھر کئی سال بعد اُس پر پھل لگے گا جو ہم کھا سکیں گے۔

پیری، بزرگی، دانائی، علم، معرفت...... یہ سب صرف ایک ہی صورت عطا ہوں گے جب ہم رب سے لَو لگا لیں گے اور ہمیں رب کے سوا کچھ یاد نہ رہے گا۔ وہ علم جس کے بغیر معرفت نہیں ملتی اُس کا نام رب سے لَو لگانا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ رب جب کسی بندے سے خوش ہوتا ہے تو اُسے علم عطا کرتا ہے، جب علم عطا ہے تو پھر ہم کوشش کیوں کریں؟

جواب: ہر چیز رب کی طرف سے ہے، اُس کی عطا سے ہی ملتی ہے لیکن کوشش ہم پر فرض ہے۔

سوال: کیا ولایت میں اگلے درجہ میں ترقی سے پہلے ہر بار ٹریننگ ہوتی ہے؟

جواب: ٹریننگ تو ایک ہی بار ہوتی ہے لیکن اگلے درجہ میں ترقی سے پہلے ایک ریفریشر کورس ہوتا ہے جس میں سے ہر بار گزرنا پڑتا ہے۔

سوال: رب ملنے کے بعد کبھی ایسا پل آیا کہ آزمائشوں اور مشکلات سے گھبرا کر سوچا ہو کہ یہ مشکل وقت کب ختم ہو گا؟

جواب: یہ انسانی فطرت ہے۔ ہر انسان یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ مشکل وقت کب ختم ہو گا لیکن اُس کا انداز گلہ کا نہیں بلکہ تجسس کا سا ہوتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ رب سے مدد مانگتا ہے ''یا اللہ! تو میری مدد

فرماتا کہ میں اس مشکل میں سے آسانی سے گزر جاؤں۔''

سوال: آزمائش یا مشکل کے وقت کون سی سوچ اللہ پر بھروسا کو ڈگمگانے نہیں دیتی؟

جواب: جب رُوحانیت میں اگلے درجے پر ترقی سے پہلے فقیر کو ریفریشر کورس سے گزارا جاتا ہے تو اُس میں مشکلات کی Intensity اگرچہ وہ نہیں ہوتی جو ٹریننگ کے دوران تھی۔ چیزیں تقریباً وہی ہوتی ہیں لیکن Intensity کم ہوتی ہے۔

انسان جب مشکل میں ہوتا ہے تو شیطان کہیں نہ کہیں رب پر اُس کے بھروسے کو کمزور کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ ایسے میں انسان گھبرا کر سوچتا ہے کہ یہ مشکل ختم ہی نہیں ہو رہی، نہ جانے کب ختم ہو گی؟ جب بھی ایسا خیال آئے، فوراً انسان اپنے ماضی پر ایک نظر ڈالے اور یاد کرے کہ کس طرح ہر مشکل میں رب کی طرف سے غیبی مدد آتی رہی اور وہ مجھے مشکل حالات سے نکالتا رہا۔ رب نے کس کس طرح مجھے ہمیشہ مصیبتوں سے بچا لیا۔ جب مشکلات میں گھرا انسان گزرے ہوئے وقت اور تجربے کو آواز دیتا ہے تو رب پر اُس کا بھروسا اور یقین تازہ ہو جاتا ہے۔ اُس کے اندر یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ جس نے مجھے پہلے مشکل حالات سے نکالا وہ اب بھی مجھے نکال لے گا۔ وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ یہ احساس رب پر بھروسے کو اپنی جگہ قائم و دائم رکھتا ہے اور ڈگمگانے نہیں دیتا۔

سوال: لوگوں کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کوئی ولی اللہ کس مقام پر ہیں۔ کیا ولی اللہ کو اپنے درجہ یا مقام کے بارے میں خود پتا چل جاتا ہے یا اُنھیں اِس بارے میں بتایا جاتا ہے؟

جواب: اگر مجھے کوئی جسمانی تکلیف ہے تو میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ میری غرض تو یہ ہو گی کہ میری بیماری ختم ہو جائے نہ کہ میں اِس جستجو میں پڑ جاؤں کہ یہ کس مقام کا ڈاکٹر ہے۔

اگر میں رُوحانی بیماریوں میں مبتلا ہوں تو کسی صاحبِ علم و نظر و کمالات کے پاس جاتا ہوں اور وہ مجھے اُس راہ پر لگا دیتے ہیں جس پر چل کر میری رُوحانی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اب مجھے یہ جان کر کیا لینا ہے کہ وہ صاحبِ کمالات کس مقام پر ہیں؟ مجھے تو یہ غرض ہونی چاہیے کہ اُن سے علم و حکمت حاصل کر لوں اور اُن کی بتائی راہ پر چل کر قربِ الٰہی حاصل کر لوں۔

اگر میں زمانے کے غوث کے پاس چلا گیا اور اُنھوں نے مجھ پر توجہ ہی نہ کی۔ میں پچاس سال بھی اُن کے پاس بیٹھا رہوں، مجھے اُن کے غوث ہونے کا کیا فائدہ؟

اگر میں کسی عمران کے پاس چلا جاؤں اور وہ مجھ پر توجہ ڈال دیں، مجھے وہ قرینہ سکھا دیں جو مجھے رب تعالیٰ سے قریب کر دے، جس سے میری رُوحانی بیماریاں دُور ہو جائیں تو میرے لیے وہ عمران اُس غوث سے کہیں بہتر ہیں۔

کیا ولی اللہ کو اپنے مقام کا پتا چل جاتا ہے؟

اس دُنیا میں ایک وقت میں چالیس ہزار عمران ہوتے ہیں جن میں سے اکثریت کو اپنے مقام کا اندازہ

نہیں ہوتا۔ جب وہ آگے چل کر ترقی کرتے ہیں تو اُنھیں احساس ہوتا ہے کہ رب نے اُنھیں کچھ مقام عطا فرمایا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ رُوحانیت میں Ladder پر جو Lowest مقام ہے وہاں اکثر لوگوں کو اپنے مقام کے بارے میں پتا نہیں چلتا لیکن اِس کے بعد اُنھیں اپنے مقام کا احساس ہونے لگتا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ایک ایسا علم ہے جو ایک وقت میں صرف ایک ولی اللہ کے پاس ہوتا ہے۔ وہ کون سا علم ہے؟

جواب: یہ علم کی قسم نہیں بلکہ درجہ ہے جیسے سائنس کا مضمون ہے۔ کلاس V میں بھی سائنس پڑھی جاتی ہے، میٹرک کا سٹوڈنٹ بھی سائنس پڑھتا ہے۔ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں بھی کیمسٹری اور فزکس پڑھتا ہے۔ سائنس ہی میں ڈاکٹریٹ بھی کرایا جاتا ہے۔ اب ہے تو وہی مضمون لیکن ہر سطح پر علم کی ڈگری کا فرق ہے۔ جس درجے کا علم کسی پی ایچ ڈی کو ہو سکتا ہے اُس درجے کا علم کسی ماسٹرز یا بی ایس سی کے سٹوڈنٹ کو نہیں ہو سکتا۔ تو علم ایک ہی ہے بس ڈگری کا فرق ہے۔

سوال: آخری بار یہ خواہش کب دل میں پیدا ہوتی ہے کہ چیزیں ویسی ہو جائیں جیسی انسان چاہتا ہے؟

جواب: جب تک انسان بندگی کے اُس مقام پر نہ آجائے کہ جہاں وہ رب کی غیر مشروط اطاعت کرنے لگے۔ اِس سے پہلے تک وہ چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا سوچتا ہے لیکن غیر مشروط اطاعت میں Enter ہونے کے بعد یہ خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ انسان بندگی میں داخل ہی نہیں ہوتا جب تک غیر مشروط اطاعت میں نہ چلا جائے۔

در اصل شیطان ہمارے دل میں ڈالتا ہے کہ خلافِ فطرت دُعا کر کے غلط چیز کو اپنے حق میں اچھا کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ یہ دُعا کی جائے کہ نواز شریف کی رائے ونڈ والی جائداد مجھے مل جائے۔

جب تک چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی خواہش باقی رہتی ہے تب تک انسان بندگی تو دُور کی بات اطاعت تک میں نہیں گیا ہوتا لیکن جب وہ اطاعت میں داخل ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے میرا رب جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ جو کچھ میرے رب کی طرف سے مجھے عطا ہو رہا ہے مجھے اُس میں خوش رہنا ہے۔ یہ سوچنا رب کی غیر مشروط اطاعت کی اِبتدا ہے۔ اِس لیے اولیاء اللہ کبھی رب تعالیٰ سے دُنیاوی آسائشوں کی دُعا نہیں کرتے کہ یا اللہ! مجھے محل عطا کر دے کیوں کہ اُن کے مطابق ایسی خواہش اور دُعا کرنا اُن کی اِس سوچ اور عقیدے کی نفی کر دے گا کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ اِس سے اگلا قدم یہ ہے کہ میرا رب مجھے جو عطا فرمائے گا وہ میرے مفاد میں بہترین ہو گا اور اُس سے بھی اگلا قدم کہ میری عقل اور میرا علم ناقص ہے۔ میں اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتا لیکن یہ میرا رب ہے۔ جس کو اس کائنات میں موجود تمام چیزوں کا پتا ہے اور وہ میری بہتری کو زیادہ جانتا ہے۔ میرا رب بڑا رحیم و کریم اور مہربان ہے۔ وہ جو عطا کرتا ہے بہترین ہوتا ہے۔

عقیدے اور ایمان کے اِس حصے میں فقیر نظر رکھتا ہے کہ میرا عمل کہیں اُس بات سے مختلف نہ ہو جائے جو

میں زبان سے کہہ رہا ہوں اور دل میں سمجھتا ہوں۔

حضرت علیؓ دُعا فرمایا کرتے تھے ''اے اللہ! بے شک تُو ویسا ہی ہے جیسا میں تجھے سمجھتا ہوں۔ مجھے بھی ایسا بنا دے کہ تجھے پسند آ جاؤں۔'' اِس دُعا میں ایمان کا پورا سمندر چھپا ہوا ہے۔ ابھی میں عرض کر رہا تھا کہ ہم بظاہر یہ کہتے ہیں کہ میرا رب بڑا مہربان اور رحیم و کریم ہے، میرا رب ازل سے ابد تک کی ہر چیز سے واقف ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ یہ سب زبان سے کہنے کے باوجود میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا ہوتا ہوں ''یا رب! تُو مجھے فلاں چیز عطا کر دے۔''

اگر میں رب کو ویسا سمجھنا شروع کر دوں جیسا کہ وہ ہے..... مہربان، رحیم و کریم، میری بہتری کو سب سے بڑھ کر سمجھنے والا، تو پھر اپنی Choices کے پیچھے سرپٹ بھاگنے کے بجائے اللہ سے دُعا کروں گا'' کہ یا اللہ! مجھے وہ عطا فرما دے جو میرے مفاد میں بہترین ہے اور بے شک تو ایسا ہی کرنے والا ہے۔''

سوال: آپ کے پاس جنات ہیں یا موکلات؟

جواب: میرے پاس نہ جنات ہیں نہ موکلات۔

روح کا وہ Controlling word پڑھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں! اگر ایک نوزائیدہ بچے کو تندور کا پراٹھا اور قورمہ کھلا دیں تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ پائے۔ ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ جب تک ہم رُوحانی طور پر اُوپر نہ آ جائیں اُن بزرگوں کی پڑھائیاں نہ پڑھیں ورنہ وہ ہمارے لیے Overdose ہو جائیں گی اور Overdose کا انجام آپ جانتے ہی ہیں۔

سوال: حالتِ نماز میں آنکھیں بند کر کے اگر رب کی قربت اور خشوع وخضوع محسوس ہو تو کیا آنکھیں بند کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے؟

جواب: نماز کے بارے میں حکم تو یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر ادا کی جائے لیکن اگر خشوع وخضوع آنکھیں بند کر کے حاصل ہو تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سوال: کیا رُوحانی دُنیا میں کسی ولی اللہ کو یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام مشاہدات و واردات لوگوں کی راہنمائی کے لیے کھول کر بیان کردیں؟

جواب: جب کسی شخص کو رب تعالیٰ کی طرف سے مقام عطا ہو جائے تو شروع میں حکم یہ ہوتا ہے کہ تمام چیزوں کو چھپایا جائے کیوں کہ سفر جاری ہوتا ہے اور وہ کسی خاص مقام تک نہیں پہنچا ہوتا۔ وہاں رازداری شرط ہے۔ پھر وہ وقت آتا ہے جب اُسے ایک مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہاں بھی تمام باتیں چھپانے کا حکم ہوتا ہے۔ جب وہ علم میں اُس مقام سے بھی آگے چلا جاتا ہے تو لوگوں کو علم کی طرف راغب کرنے کے لیے چیدہ چیدہ باتیں بیان کرنے کی اُسے اجازت ہو جاتی ہے تاکہ لوگ Inspire ہو کر رب کی طرف آئیں۔

اِس سے اگلے مقام پر بہت سی باتیں بیان کرنے کی اجازت مل جاتی ہے اور وہ بیان کرنے لگتا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اُسے تمام باتیں اور مشاہدات بیان کرنے کی اجازت ہو جاتی ہے۔ بہت سی باتیں اور مشاہدات وہ بند کمرے میں صرف چند خاص لوگوں کے سامنے بیان کر سکتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ علم کی عام باتیں سرِ محفل کیا کرتے لیکن خاص مشاہدات اور واردا تیں صاحبانِ علم پر مشتمل قریبی حلقے میں بند کمرے میں بیان کرتے اور رازداری کا اِس قدر خیال رکھتے کہ کمرے کا دروازہ خود اپنے ہاتھوں سے Bolt کرتے اور تسلی کر لیتے کہ کسی بھی لحاظ سے آواز باہر نہ جانے پائے۔

سوال: 70 سال کی قابلِ رشک زندگی میں کیا کوئی خواہش ہے جو ابھی تک آپ کے ساتھ ہو؟

جواب: ایک بہت بڑی خواہش میری زندگی میں ابھی تک ہے کہ کاش میں کوئی اچھا اور نیک انسان ہوتا۔

سوال: وہ لمحہ جب آپ کو کشف عطا ہوا، اُس وقت آپ کے محسوسات کیا تھے؟ عمر کتنی تھی؟

جواب: Around Forty۔ محسوسات حیرت کے تھے کہ یہ سب کیا ہے۔

سوال: کیا کبھی ایسا ہوا کہ کشف رُک گیا ہو۔ ایسے Phases کتنی بار آئے۔ سب سے طویل Phase کتنے عرصے کا تھا؟

جواب: یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے کہ درمیان میں بریک آجائے۔ انسان کمزور ہے

رُوحانی دُنیا

انسان پیدائش سے لے کر موت تک مختلف Stages سے گزرتا رہتا ہے۔ جب وہ نوزائیدہ ہوتا ہے تو اُس کی خوراک عموماً ماں کا دودھ ہوتا ہے۔ جب وہ دو سال کا ہو جائے تو ماں اپنی تمام محبت وچاہت کے باوجود اُسے Semi-solid food پر لگا دیتی ہے اور اپنا دودھ پلانا بند کر دیتی ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے لیکن ماں اُس سے محبت کرنے کے باوجود دودھ نہیں پلاتی۔ جب وہ لڑکپن میں داخل ہوتا ہے تو اُس کی خوراک بدل جاتی ہے اور اُسے Nourishing food کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوانی میں کیلوریز Intake بڑھ جاتی ہے اور نوجوان دن میں چھ بار بھی کھانا کھا لیتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ دو وقت سے زیادہ کھانا نہیں کھا سکتا۔ آخری عمر میں خوراک بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔

یہ تو مادی خوراک کا ذکر تھا۔ رُوحانی خوراک کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ جب وہ رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھتا ہے تو اُسے اُسی رُوحانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جو ماں کے دودھ کی طرح زود ہضم مگر طاقت سے بھرپور ہوتی ہے۔ جوں جوں اِس راہ میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں پڑھائیاں بھی اُوپر کے درجے کی ہو جاتی ہیں۔ نوزائیدہ بچے کو سردی گرمی اور کیڑے مکوڑوں سے بچا کر رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ اُس کا Immune system کمزور ہوتا ہے اِس لیے وہ جلدی انفیکشن پکڑ لیتا ہے اور بیماری کے وائرس اُس پر جلدی حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

اِسی طرح جب ہم رُوحانیت کی راہ پر قدم رکھتے ہیں تو اُس وقت ہمیں بیرونی خطرات جنھیں ''شیطان کا بہکاوا'' کہتے ہیں کے خلاف بہت Vigilant رہنا پڑتا ہے۔ لیکن جب رُوحانیت کا سفر طے کرتے کرتے ہم کسی نوجوان کی طرح توانا ہو جاتے ہیں تو یہ بیرونی خطرات ہم پر جلدی حملہ آور نہیں ہو پاتے اور اگر حملہ آور ہو بھی جائیں تو ہمیں قابو نہیں کر پاتے۔ پیرانِ پیر حضرت غوث الاعظم دستگیر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی گئی کتب میں مختلف وظائف، اذکار اور تسبیحات پڑھ کر ہم بھی اُنھیں کرنا چاہتے ہیں لیکن بھول جاتے ہیں کہ ہم نوزائیدہ بچے کی طرح ہیں جہاں ہمیں، بہت نرم، زود ہضم مگر طاقت والی خوراک چاہیے۔ ان کتب میں مذکور تسبیحات واذکار تو گویا 30 سالہ کڑیل جوان کی خوراک ہوتی ہیں۔ ہم اگر وہ پڑھ بھی لیں تو پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اِسی طرح کسی کتاب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ہر رُوح کی ماہیت دوسری سے مختلف ہوتی ہے اور رُوح کی ماہیت سے مطابقت رکھنے والا وظیفہ اور ذکر اذکار کرنا چاہیے۔ ہم یہ بات پڑھ کر بنیادوں کی تعمیر کیے بغیر فوراً

اور اُس کا نفس سر اُٹھاتا ہی رہتا ہے جب تک کہ صاحبِ علم اُس مقام پر آ جائے کہ جہاں رب تعالیٰ اُسے چیزیں دکھاتا ہے۔ یہ جملہ قابلِ غور ہے کہ رب تعالیٰ دکھاتا ہے، انسان خود نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں کہ انسان کی قدرت ہی کچھ نہیں۔ اِس کی حیثیت ہی کیا؟

جب رب تعالیٰ مہربانی فرماتا ہے تو ایک مخصوص حد تک اُسے اپنے کارخانۂ قدرت میں جھانکنے کی اجازت مرحمت فرما دیتا ہے۔ اُس کی کہی باتیں پوری ہونے لگتی ہیں۔ دُعائیں قبول ہونے لگتی ہیں رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں یہ خیال آنے لگتا ہے میں جو رب تعالیٰ سے کہتا ہوں وہ پورا کر دیتا ہے، میں جو دُعا مانگتا ہوں، قبول ہو جاتی ہے، میں جو چاہتا ہوں دیکھ لیتا ہوں۔ اِس خیال کی وجہ سے انسان جیسے ہی تکبر کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے تو رب اُسے جھٹکا دیتا ہے۔ کشف بند ہو جاتا ہے، کہی باتیں پوری نہیں ہوتیں، دُعائیں قبول ہونا تو دُور کی بات ہے، وہ جو کہتا ہے اُس سے 180 ڈگری Opposite رب تعالیٰ کرنے لگتا ہے تب انسان کو جھٹکا لگتا ہے اور اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ میں تو رب تعالیٰ کا حقیر بندہ ہوں، وہ جب چاہے میری دُعائیں قبول کرے اور جب چاہے رد کر دے۔ وہ ہر اختیار کا مالک اور ہر شے پر قادر ہے۔ یہ جھٹکا انسان کے اندر عجز میں اضافہ کر دیتا ہے۔

یہ Phase ہر صاحب علم و کشف کی زندگی میں آتا ہے لیکن یہ سزا نہیں بلکہ رب تعالیٰ کی ایک خاص رحمت ہے۔ رب تعالیٰ اپنے بندوں کو تکبر سے بچائے رکھنا چاہتا ہے اِس لیے اُنھیں ایسے جھٹکے دیتا ہے۔

سوال: سُنا ہے کچھ لوگوں سے اُن کی کسی بڑی غلطی کی وجہ سے ولایت واپس لے لی گئی لیکن جب اُنھوں نے توبہ کی اور کسی بڑے ولی اللہ سے سفارش کرائی تو ولایت واپس مل گئی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

جواب: ہوتا ہے۔ کشف کا رُک جانا، کہی باتوں کا پورا نہ ہونا، دُعائیں قبول نہ ہونا۔ یہ سب ولایت واپس لے جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ حالتِ انقباض کی وجہ سے ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ بڑا مہربان ہے۔ وہ اِس انتظار میں رہتا ہے کہ بندہ معافی مانگے، توبہ کرے تو وہ اُسے معاف کر دے۔ اُس کی توبہ قبول کر لے۔ جہاں بندہ اللہ سے رُجوع کرتا اور سچے دل سے معافی مانگتا ہے، حالتِ انقباض ختم ہو جاتی ہے۔

سوال: اگر کوئی ولی اللہ جذب کی کیفیت میں اپنا رُوحانی مقام کسی مرید پر منکشف کرتے ہیں تو کیا وہ مرید ازراہِ محبت شیخ اپنے پیر بھائی سے اِس کا تذکرہ کر سکتے ہیں یا اپنے شیخ کے مقام کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟

جواب: کوئی حرج نہیں۔

سوال: کیا کوئی مجذوب بھی کسی رُوحانی ڈیوٹی پر مامور ہو سکتا ہے؟

جواب: جی ہاں۔

سوال: کیا ایک غوث مجذوب ہو سکتا ہے یا ہمیشہ صرف سالک ہی غوث کے مقام تک پہنچتا ہے؟

جواب: غوث سالک ہوتا ہے لیکن اولیائے کرام پر جذب کی کیفیت کبھی کبھار طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ہر ایک

کی اپنی Self-control کی بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو حالتِ جذب میں بھی کس حد تک جانے دے۔ صاحبانِ علم جو سالک ہیں، جذب سے دُور بھاگتے ہیں اور جذب کی کیفیت طاری ہو بھی جائے تو خود کو کنٹرول میں رکھتے ہیں تا کہ خلقِ خدا کو اُن سے نقصان نہ ہونے پائے۔

سوال: مرید اپنے مرشد سے دُور ہو، خود کو Disconnected محسوس کر رہا ہو تو خود کو کیسے مرشد سے Connect کرے؟

جواب: اگر مرشد واقعی مرشد اور مرید واقعی مرید ہے تو ذرا سی توجہ Connection کو بحال کر دیتی ہے۔

سوال: کبھی مرید ہر لحہ اپنے مرشد کامل کی خوشبو اور توجہ محسوس کرتا ہے تو کبھی اُس خوشبو اور توجہ کے لیے اُسے کئی دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیا مرید کی دُنیاداری کیفیات کے زوال کا باعث بنتی ہے یا کوئی اور وجہ؟

جواب: ایسا مرید کی دُنیاداری کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ یہ اِس راہ کا اُسلوب اور طریقہ ہے۔ دُنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں، ہر شے تغیر پذیر ہے، دن رات، موسم، موڈ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح رُوحانی کیفیات بھی Up and down ہوتی رہتی ہیں۔ جب رُوحانی کیفیات پورے عروج پر ہوں تو مرید اپنے مرشد کی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات رُوحانی کیفیات اِس شدت کی نہیں ہوتیں تب مرشد کی توجہ اور خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔

سوال: کیا اولیائے کرام کو Terms and conditions کے ساتھ تصرفات عطا کیے جاتے ہیں اور Ifs and buts کے ساتھ اُنھیں استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے یا وہ جس طرح چاہیں اُن تصرفات کو استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب: جو اختیار تفویض کر دیا گیا ولی اللہ اُسے misuse یا Abuse کر سکتا ہے لیکن اُس کی سزا ہے۔ کوئی ولی اللہ جو سالک ہے کبھی کسی کو بد دُعا نہیں دے گا، کیوں کہ اِس کی اجازت نہیں، لیکن مجذوب جو ہوش و حواس میں نہ ہو اگر چہ بد دُعا وہ بھی نہیں دیتا لیکن اگر وہ غلط بات زبان سے کہہ دے تو وہ پوری ہو جائے گی۔

تصرفات کے استعمال پر پابندیاں ہیں کہ اُنھیں خلقِ خدا کی بہتری کے لیے استعمال کیا جائے۔ تصرفات کے استعمال سے کسی کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی ولی اللہ تصرفات کا غلط استعمال کرتا ہے تو سزا پاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اُس کا نام ہی ولایت کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا ہر ولی اللہ اپنے رُوحانی تصرف کی بدولت مختلف 366 صورتیں اختیار کر سکتا ہے؟

جواب: یہ ولایت کے مقام پر منحصر ہے اور اُس مقام میں بھی کس درجے پر وہ فائز ہے۔ یہ بات ولایت کے مقام کی ڈگری سے Correspond کرتی ہے۔

سوال: مذہب میں Rigidity اور Extremism سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: اپنے رویوں کو سنت کے مطابق کر لیا جائے کیوں کہ سنت میں نہ Rigidity ہے نہ Extremism۔ جب ہم اپنے رویوں کو سنت کے مطابق ڈھال لیں گے تو یہ دونوں چیزیں ہمارے قریب سے بھی نہیں گزریں گی۔

سوال: بابا شاہ جمال صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بابا موج دریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات پر حاضری کے وقت دونوں میں کوئی قدر مشترک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن واضح طور پر سمجھ نہیں آتی۔ آپ راہنمائی فرمادیں۔

جواب: دونوں کے ہاں جمال برستا ہے۔ زائر اُس جمال کو محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ اُس پر رقت طاری ہوتی ہے اور رب کی طرف راغب ہونے کی خواہش بیدار ہونے لگتی ہے۔

سوال: بعض اوقات کسی ولی اللہ کے مزار پر حاضری دیں تو وہاں کے مجاور یا ڈیوٹی پر مامور افراد کوئی چیز عطا کر دیتے ہیں جیسے پھول یا کوئی دستار۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: وہ سب صاحبِ مزار کی طرف سے ہوتی ہے۔

سوال: کبھی خواہش کے باوجود ہم کسی ولی اللہ کے مزار پر کئی دنوں یا مہینوں تک حاضری کے لیے نہیں جا پاتے۔ کیا ہمارے اندر کا میلا پن اِس حاضری میں رُکاوٹ بن رہا ہوتا ہے یا وہ ولی اللہ کسی اور وجہ سے ہمیں اپنے پاس آنے سے روک رہے ہوتے ہیں؟

جواب: اِس میں بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ وہ بزرگ اپنی باطنی آنکھ سے آپ کی رُوحانی کیفیات دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ آپ زیادہ آئیں گے تو کنٹرول سے باہر ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں آپ کی حاضری روک دی جاتی ہے۔

اگر دُنیاوی ذمہ داریاں مثلاً بچوں کی پرورش، اہلِ خانہ کے لیے ضروریاتِ زندگی کا بندوبست، ماں باپ کی خدمت، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی میں کسی مزار پر حاضری رُکاوٹ بن رہی ہے تو یہ حاضری رُک جائے گی۔

سوال: اِس دُنیا میں آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں رُوحیں رہتی ہیں۔ کیا دُنیاوی رشتوں کی طرح عالمِ ارواح میں بھی مختلف رُوحوں کا آپس میں کوئی تعلق یا رشتہ ہوتا ہے؟

جواب: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں:

میں نے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''رُوحیں مخلوط لشکر ہیں (بدن میں آنے سے پہلے اکٹھی رہتی تھیں) تو اُن سے جو جان پہچان رکھتی ہیں وہ اُلفت کرتی ہیں اور جو اجنبی رہ چکی ہیں وہ الگ رہتی ہیں۔'' (بخاری: 3336)

سوال: ہر انسان کی رُوح نے اپنی تخلیق کے بعد مختلف مشاہدات کیے ہیں جن میں سے ایک مشاہدہ و تجربہ یوم الست کا بھی ہے۔ یہ سب Data ہماری رُوح کی Sim میں موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم رُوح کے اُن تجربات و مشاہدات تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ ہمیں وہ سب کچھ یاد کیوں نہیں رہتا؟

جواب: ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ بالکل نئی جگہ پر گئے یا بالکل نئی Situation سے واسطہ پڑا تو یک دم لگا کہ جیسے اِس جگہ پر پہلے آیا ہوں یا بالکل اسی تجربے سے پہلے بھی گزر

چکا ہوں۔ یہ بالکل وہی چیز ہے۔

جوں جوں نیکی کے نتیجے میں رُوح لطیف ہوتی ہے اُس کی پرواز بڑھنے لگتی ہے تو یہ کیفیت Clear ہونے لگتی ہے۔ Data retrieve کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم رُوحانی طور پر اُس خاص مقام پر آ جائیں جہاں رُوح زیادہ لطیف ہوتی ہے۔

سوال: جب آپ دم یا دُعا کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کے آس پاس کچھ بزرگوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے؟

جواب: اپنی ذات کے بارے میں جواب دینا بڑا مشکل کام ہے، خاص طور پر جب کچھ لوگ اپنے بھول پن اور سادگی کی وجہ سے مجھے نیک انسان سمجھنے لگیں۔ میرے اندر نہ نیکی ہے نہ اچھائی۔ یہ آپ کی اچھائی، بڑا پن اور بھولپن ہے کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ آپ کے پاس دُعا کرانے کے لیے آنے والے انتہائی پُراعتماد، Bold اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود جب آپ سے ملاقات کے لیے باہر قطار میں کھڑے ہوتے ہیں تو اُن کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، پسینے چھوٹ رہے ہوتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے کسی Magnifying glass سے انھیں دیکھا اور پرکھا جا رہا ہو؟

جواب: میں اِس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ اُن کی نیکی اور بڑا پن ہے۔

سوال: بعض اوقات مرید اپنے مرشد کے پاس کسی معاملہ میں راہنمائی یا دُعا کے لیے جاتا ہے لیکن مرشد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کا ذہن Blank ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جواب: مجھ جیسے انسان کے گناہوں کی سیاہی سے بچنے کے لیے Blank ہو جاتے ہیں۔

سوال: نورِ حق لہر یا دائرے کی شکل میں ہوتا ہے۔ کیا کوئی نور Snowfall جیسا بھی ہوتا ہے؟

جواب: یقینی طور پر۔ عالمِ روحہ میں جو نور نظر آتا ہے وہ Droplets کی صورت میں ہوتا ہے۔

سوال: یوم الست کی منظر کشی کر دیجیے۔ آپ کے ذہن میں کیسا نقشہ آتا ہے؟

جواب: ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ رُوحانیت میں تمام مشاہدات و واردات بیان کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

سوال: کیا یوم الست کو ہر انسان نے اپنی مرضی سے دُنیا میں اپنے دور اور Role کا انتخاب کیا تھا یا انسان پر اسے Impose کیا گیا تھا؟

جواب: رب تعالیٰ نے انسان کو با اختیار کیا لیکن اِتنا نہیں کہ یوم الست کو وہ خود اپنے دور اور Role کو منتخب کر سکتا۔ یہ رب ہے جو ہر انسان سے اُس کے حصے کا کام لیتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''میری رحمت میرے غضب پر حاوی ہے۔'' دوسری طرف دوزخ غضب کی علامت ہے۔ پھر اللہ کے فرمان کے بعد آپ کو کیا لگتا ہے؟

جواب: میں نے تو اپنے رب کو بے پناہ پیار کرنے والا اور بے حساب رحیم و کریم پایا ہے۔ اِس کا ثبوت آپ کے سامنے بیٹھا ہے کہ مجھ جیسے گناہ گار اور سرکش انسان کو رب تعالیٰ بہت پیار سے پالتا اور Look after کرتا ہے۔

سوال: جب فیصلہ ہو چکا کہ کون سا پتھر ٹھوکروں میں رہے گا اور کون سا ''اسود'' بنے گا تو ایسے میں پتھر اپنی کم مائیگی کے احساس سے کیسے نجات حاصل کرے؟ کیا راضی بہ رضا ہو کر؟

جواب: آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ آپ کے گھر یا دفتر کا ملازم جس سے آپ چڑتے ہیں وہ اپنی Efficiency, dedication اور Zeal سے کچھ ہی عرصہ میں آپ کی آنکھ کا تارا بن جاتا ہے۔ وہ پتھر جو ٹھوکروں میں پڑا ہے، تراش خراش اور Efficiency کے بعد اپنی ماہیت اور استعمال سے انسان کے ہاتھ میں بھی آ جاتا ہے۔ کم مائیگی کے احساس سے نجات اور رب تعالیٰ سے قربت کا آسان ترین نسخہ رب تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت و بندگی ہے۔

سوال: کہتے ہیں ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ چھپا ہوتا ہے۔ اپنے اندر کے اِس بچے کو Satisfy کرنے کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟

جواب: سیٹی بجاتا پھرتا ہوں...... یہ جملہ اِصطلاحاً کہہ رہا ہوں ورنہ سیٹی بجانا آتی ہے نہ کبھی بجائی۔

ابھی میں عرض کر رہا تھا کہ میں نے اپنے رب کو ہمیشہ بڑا مہربان پایا۔ وہ اپنے بندے کی خواہشات پوری کر کے اُسے پیار کر کے اور پال کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کی سنت یہی ہے۔ جب میرا رب اِتنا مہربان ہے تو میرے اندر کا چھپا بچہ اٹھکیلیاں کیوں نہ کرے۔ میرے اندر کا بچہ رب تعالیٰ کی مہربانیوں اور اُس کے پیار کو محسوس کر کے خوش ہوتا رہتا ہے۔

نشست نمبر 28

خوشبو

ہر انسان کا ایک Aura ہوتا ہے۔ کہیں اسے Magnetic field کا نام دیا جاتا ہے تو کہیں کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کے جسم سے لہریں یا Vibrations نکلتی ہیں...... الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں یہ تجربہ بارہا کرتے ہیں کہ جب کچھ لوگوں سے ملتے ہیں تو وہ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اُن میں ہمیں اپنے لیے کشش محسوس ہوتی ہے۔ ہم اُن سے دیر تک باتیں کرنا اور اُن سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔

کچھ لوگوں سے ملاقات کے وقت ہمیں اُن میں نہ کشش محسوس ہوتی ہے نہ ہم اُن سے دُور بھاگتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں سے ملتے ہیں تو ہماری طبیعت میں کچھ زیادہ خوش گوار احساس پیدا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ سب اُن کے جسم سے نکلنے والی Vibrations کا اثر ہے۔ اگر Vibes اچھی ہیں تو ہم پر خوش گوار تاثر چھوڑتی ہیں۔ اگر وہ لہریں اچھائی کی طرف زیادہ Strong نہیں تو اُن کا نیوٹرل Effect آتا ہے۔ نہ زیادہ پسندیدگی اور نہ ہی ناپسندیدگی لیکن یہ احساس بھی صرف تب ہی پیدا ہوتا ہے جب ہم زیادہ حساس ہوں۔ یہ حساسیت قدرت کی عطا کردہ ہے یا جب ہماری رُوح بہت زیادہ لطیف ہو جاتی ہے تو ہم اُن Vibrations کو بہت تیزی سے محسوس کرتے ہیں۔

اہل فقر یا اولیائے کرام سے جب ہم ملتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے جیسے اُنھوں نے ہمارے اندر جھانک لیا ہو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کی رُوح پاکیزگی خیال، عبادت اور نیکی کے نتیجے میں اِتنی لطیف ہو گئی ہوتی ہے اور اُن کے Sensors اِس قدر حساس ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پاس آنے والوں کے جسم سے نکلنے والی Vibrations کو وصول کر لیتے ہیں اور اُنھیں اُن کی فطرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقیر چونکہ رب تعالیٰ ہی کی بندگی کر رہا ہے وہ اپنی فطرت میں اُس سنت رب کے عکس کو Develop کرتا ہے کہ وہ ستار العیوب ہے اور لوگوں کے عیبوں پر پردے ڈال دیتا ہے۔ اِس لیے اہلِ فقر بھی اُن صفات کو اپنے اندر اُجاگر کرتے ہیں۔ ایسی باتیں جن کا عیاں کرنا اُن کے لیے بے زاری یا ناخوش گواری کا باعث بنے، اُس کا وہ ذکر ہی نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے مجھ جیسے ناخواندہ لوگ بعض اوقات سمجھتے ہیں کہ شاید فقیر کو میرے

بارے میں پتا ہی نہیں چلا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اُن لہروں کو بُو کا نام دیا ہے۔ آپ جب اولیائے کرام کے پاس جاتے ہیں تو اُن کے کمرے میں Enter ہوتے ہی عجیب پاکیزگی اور خوش گواریت کا احساس ہوتا ہے جیسے اُنھوں نے کوئی عطر یا پرفیوم لگا رکھا ہو۔ دراصل فقیر نے کوئی عطر یا پرفیوم نہیں لگایا ہوتا بلکہ اُس فقیر کے خیالات کی پاکیزگی، نیکی اور عبادات میں مسلسل ہونے والا اضافہ بُو کو خوشبو میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں ہمیں اُن کے جسم سے خوشبو اُٹھتی محسوس ہوتی ہے اور اُن کے آس پاس پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔

اِس کے برعکس اگر ہم اپنے خیالات کو پراگندہ رکھیں، عبادات سے منہ موڑیں، نیکی کو قریب نہ آنے دیں تو وہی بُو ناخوش گوار شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہر فقیر کی خوشبو مختلف ہوتی ہے۔ یہ Man to man (آدمی سے آدمی) Vary کر جائے گی۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خوشبو موتیے کی ہے۔ بہت بھینی بھینی ہلکی سی۔ میں خود تو کبھی اُن کے روضے پر نہیں گیا لیکن آپ میں سے جو لوگ گئے ہیں اُنھوں نے وہاں یہ خوشبو محسوس کی ہوگی۔

حضرت امام حسینؓ کے جسم سے گلاب کے پھولوں کی خوشبو نکلتی ہے۔ اُن کے روضے پر حاضری دینے والوں نے محسوس کیا ہوگا کہ وہاں سے بھی گلاب کے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔

حضرت پیرانِ پیر غوث الاعظم دستگیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روضے سے جو خوشبو آتی ہے اُس کی سمجھ نہیں آتی کیوں کہ وہ اُن خوشبوؤں سے مختلف ہے جن سے ہم دُنیاوی طور پر واقف ہیں۔

داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے جو خوشبو اُٹھتی ہے اُس کو بھی کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بھی بہت منفرد ہے۔

ہم اپنی آسانی کے لیے سمجھنے کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو فقیر جیسی پڑھائیاں پڑھتا ہے اور رب کے جس نام کو پکارتا اور اُس کے جس کلام کا ورد کرتا ہے اُسی نسبت سے اُس کے جسم میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ یہ خوشبو تقریباً سبھی اولیائے کرام کے جسم سے اُٹھتی ہے لیکن اُس خوشبو کے حصول کے لیے خیالات کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے۔ خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ عبادات اور نیکی کی راہ پر چلنا بھی ضروری ہے، یہی راہ ہمیں قربِ الٰہی کی طرف لے جاتی ہے۔

یہ بات اکثر اِس لیے دہراتا ہوں کہ ہم نیک لوگوں سے فرمائش کرتے ہیں کہ مجھے قربِ الٰہی چاہیے، مجھے رب سے ملا دیں، وہ فقیر ہمیں رب سے کیسے ملائے؟ کیوں کہ ایسا تو ہے نہیں کہ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر رب کے حضور پیش کر کے کہے۔

O Allah! Meet Mr. so and so. He is my friend. You also become his friend.

ایسا ممکن نہیں ہے۔

مرشد کا کام تو بس اِتنا ہے کہ لاہور شہر کی پُر پیچ گلیوں سے مرید کو نکال کر موٹروے کے Starting point پر کھڑا کر کے کہے کہ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو شہرِ اقتدار تک لے جائے گا۔ اِس راستے پر چلتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف Services آئیں گی ایسا نہ ہو کہ تم وہاں کھڑے ہو کر کھانے پینے میں مصروف ہو جاؤ اور وقت ضائع کر کے اپنا سفر کھوٹا کر لو۔ اِس روڈ پر Speed limit 120 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ اِس سے Exceed کرو گے تو چالان ہو جائے گا۔ راستے میں ایک جگہ 10 کلومیٹر کا ایک ٹکڑا آئے گا وہاں تیز سپیڈ سے ایکسیڈنٹ کا خطرہ ہے۔ گاڑی اُلٹ جائے گی۔

مرشد یہ سب Warnings دے دے گا لیکن سفر مجھے خود ہی طے کرنا ہے اور اپنی محنت اور احتیاط سے شہر اقتدار تک پہنچنا ہے۔ اگر میں راستے میں اپنے مرشد کی ہدایات پر عمل نہ کروں اور شہرِ اقتدار تک نہ پہنچ پاؤں تو میں دوش اپنے مرشد کو دوں گا یا اُس گاڑی کو جس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔ اگر اس کے ٹائر کمزور ہیں اور وہ Heat absorb نہ کر پائیں، Burst ہو جائیں۔ گاڑی اُلٹ جائے تو اُس میں مرشد صاحب کا کیا قصور؟ یہ تو مجھے دیکھنا تھا کہ ٹائرز کی Condition (حالت) کیا ہے؟ پھر اگر راستے میں پٹرول ختم ہو گیا تو قصور تو میرا ہے کہ میں نے گاڑی کا ٹینک Top up نہیں کرایا۔ اگر میں نے بے پروائی کی یا کسی اور گاڑی سے جا ٹکرایا تو غلطی میری اپنی ہے، مرشد کا قصور نہیں۔

میری یہ فرمائش کہ مرشد صاحب مجھے رب سے ملا دیں، بے معنی ہے۔ میری یہ فرمائش سن کر فقیر سوائے شرمندہ ہونے کے اور کیا کرے گا۔ اِس لیے ہم فقیر سے فرمائش کرنے کے بجائے اُس کے پاس جا کر بیٹھ جائیں اور غور کریں کہ وہ اِتنے بڑے مقام پر کیسے پہنچا۔ وہ بھی میری طرح کا انسان ہے۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، ایک دماغ رکھتا ہے۔ اُس میں کچھ بھی مجھ سے مختلف نہیں پھر یہ اِتنی بلندی پر کیسے پہنچ گیا۔ میں فقیر کو Observe کرتا رہوں۔ پوچھنے سے کام نہیں بنے گا۔ پوچھنے پر شاید وہ نہ بتائے کہ وہ کیسے اِس مقام پر پہنچا کیوں کہ یہ سفر اِتنا غیر محسوس ہے کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کیسے اُوپر سے اُوپر پہنچتا چلا گیا۔ جو باتیں آپ کو بتائے گا وہ اُوپر کے درجے کی ہوں گی اُس کے اور میرے مقام میں جو Gap ہے اُسے میں کیسے Bridge کروں گا؟ اِس کا آسان طریقہ فقیر کو چپ چاپ Observe کرنا ہے۔ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں کہ کس مقام پر کیا کرنا ہے اور جب سمجھ آتی ہے تو انسان کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ فقیر بہت مشکل زندگی گزار رہا ہے۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں اور حالات کے جبر کو ہنس کھیل کر برداشت کرتا ہے۔ تکالیف پر قہقہے لگاتا ہے۔ جتنا بڑا دُکھ اُتنا بڑا قہقہہ۔ اِس سے آگے جب ہم فقیر کو Watch کرتے ہیں تو وہ دو Principles (اُصولوں) پر چلتا نظر آتا ہے:

1. وہ Giving ہے۔ Giving سے مراد یہ نہیں کہ وہ روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ رہا ہے بلکہ وہ ہر شے میں Giving ہے۔ وہ لوگوں کی زندگی آسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ہر طریقے سے دوسروں کے کام آنے کی سعی کرتا ہے۔ جو اُس کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے، وہ اُسے انکار نہیں کرتا۔ اپنا

نقصان کر کے بھی اُسے دیتا ہے۔اور دوسروں کے لیے جانی و مالی قربانی کرتا ہے۔

2۔ وہ بہت Forgiving ہے۔ دوسروں کو اُن کی غلطی کرنے سے پہلے معاف کر دیتا ہے۔اُس نے اپنی ٹریننگ ہی ایسے کی ہوتی ہے کہ وہ معاف کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگاتا۔ دراصل وہ خود کو سمجھا لیتا ہے کہ یہ بھی میری طرح کا انسان ہے، خطا کا پتلا ہے، جیسے مجھ سے غلطیاں ہوتی ہیں تو میں دوسروں سے معافی کی توقع رکھتا ہوں۔ اِسی طرح میں بھی اِس کی خطا کو درگزر کر دوں۔ یوں فقیر دوسروں کے بڑے سے بڑے قصور کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

وہ شخص جس نے معرکۂ کربلا میں حضرت علی اصغرؓ کے حلق پر تیر چلایا تھا اور جو حلق کے پار ہو گیا تھا، کافی عرصے بعد وہ شخص حضرت امام زین العابدینؓ کے گھر مہمان بن کر آیا۔ حضرت امام زین العابدینؓ نے اُس کی بہترین مہمان نوازی کی۔ رات کو قیام کرایا۔ اگلے دن جب وہ شخص رُخصت ہونے لگا تو اُن کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر چہرے پر شرمندگی کے تاثرات لیے کہنے لگا ''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں جو اِس قدر بہترین سلوک میرے ساتھ کیا؟'' حضرت امام زین العابدینؓ نے فرمایا ''میں نے آپ کو پہلے لمحہ ہی میں پہچان لیا تھا۔'' وہ شخص حیران ہو کر بولا ''پھر آپ نے میرے ساتھ اس قدر حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیوں کیا؟'' حضرت امام زین العابدینؓ نے فرمایا ''ہمیں دُنیا کی میزبانی عطا ہوئی ہے۔''

یہی تواضع فقیر کی زندگی کا حصہ ہے۔ جب ہم Giving, Forgiving اور تواضع کو اپنی زندگی میں Develop کر لیتے ہیں اور عبادات و نیکی کی راہ پر چلتے ہیں تو ہمارا رب کی طرف سفر جاری ہو جاتا ہے۔

مرشد اِن خوبیوں کے بارے میں آپ کو گائیڈ کرتا ہے۔ لیکن اُن سب خوبیوں کو اپنے اندر ہمیں خود ہی Develop کرنا ہوتا ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور محاورہ ہے

You can take the horse to the water but you can't make him drink.

اِسی طرح مرشد آپ کو یہ تو بتا دے گا کہ آپ اِن خوبیوں کو اپنے اندر کیسے Develop کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کے Behaviours and attitudes دیکھ کر یہ تو Point out کر دے گا کہ آپ یہ غلط کر رہے ہیں لیکن اُن رویوں کو Correct آپ کو خود ہی کرنا ہو گا۔

Cause and Effect کے اُصول کے تحت سبب پہلے بنے گا، اثر بعد میں آئے گا۔ یہ اور بات کہ دُعا اور قبولیت دُعا میں یہ اُصول 180 ڈگری Reverse ہو جاتا ہے۔ اس میں Effect پہلے اور Cause بعد میں ہے۔ ایک شخص رب کے حضور گڑگڑاتا ہے، یہ گڑگڑانا توفیق کی بات ہے۔ رب دیکھتا ہے کہ اِس بندے کے دل میں خواہش ہے کہ وہ رب کے حضور گڑگڑائے تو رب اُسے توفیق دے دیتا ہے۔ وہ رب کے حضور گڑگڑاتا ہے اور انعامات پا لیتا ہے۔ توفیقِ دُعا پہلے ہے، اثر بھی پہلے لیکن دُعا بعد میں۔

اِسی لیے آپ کو کہیں کہیں ایسے اہلِ فقر اور صاحبانِ دُعا نظر آئیں گے کہ نہ وہ ہاتھ اُٹھاتے ہیں نہ دُعا

کرتے ہیں لیکن دُعا قبول ہو جاتی ہے۔ مجھ جیسے لوگ جو اِس Mechanism کو سمجھتے نہیں، پریشان ہو کر کہتے ہیں۔ ''جناب! آپ نے دُعا تو کی نہیں، دُعا کر دیجیے۔'' دراصل وہاں Cause and effect کا Mechanism اُلٹ ہے۔ وہاں تو دُعا ہونے سے پہلے ہی قبول ہو گئی۔ دُعا بعد میں کی گئی۔ ورنہ دُعا کے علاوہ باقی چیزوں کے سلسلے میں Cause and effect کا Principle بہت سختی سے Implement ہوتا ہے۔ Cause کے بعد ہی اثرات و انعامات ملتے ہیں۔

سوال: جب لوگ آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُترتے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟

جواب: میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا ایک بھائی میرے جیسا نکل آیا کیوں کہ میں تو خود لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اُترتا۔

سوال: بہت سے لوگ آکر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم خواب میں آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ کسی کے خواب میں یوں جانے والی بات سمجھ نہیں آتی۔ اِس پر کچھ روشنی کی ضرورت ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسا شخص جو مجھے خواب میں دیکھنا چاہتا ہے وہ صحیح الذہن نہیں ہو سکتا۔ لوگ تو دن میں مجھے دیکھ کر ڈرتے ہیں، خواب میں کیا عالم ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ اگر کوئی خواب میں مجھے دیکھتا ہے تو یہ اُس کی اپنی ذہنی صلاحیتیں اور رُوحانی کیفیات ہیں کہ وہ جس کو دیکھنا چاہتا ہے، دیکھ لیتا ہے۔

سوال: کچھ اولیاء اللہ اپنے مریدین کے خوابوں میں جا کر مختلف معاملات کے سلسلے میں اُن کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ کیا یہ اولیاء اللہ کی Conscious effort ہوتی ہے؟

جواب: یہ Conscious effort نہیں ہوتی بلکہ مرشد اور مرید کے درمیان رُوحانی تعلق کا اعجاز ہے۔

رُوح کی اصل...... بلندی

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان عالمِ بالا سے عالم مادہ میں اُتارا جاتا ہے، بلندی سے پستی کی طرف۔ لیکن پھر وہ پستی سے بلندی کی طرف چلا جاتا ہے کیوں کہ اُس کی اصل بلندی ہے، نہ کہ پستی۔ رُوحانیت میں انسان کی اصل اُس کی رُوح کو گردانا جاتا ہے جب کہ جسم رُوح کے Carrier کا کام کرتا ہے۔

رب نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو کھنکتی مٹی سے بنایا۔ اس فرمان کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو خاکی پُتلا کہتا ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق انسان کا جسم مٹی سے بنایا گیا ہے لیکن اُس کی رُوح کی اصل بلندی ہے۔ وہ دُنیا میں اپنا وقت پورا کر کے بلندی کی طرف چلی جاتی ہے۔ انسان اپنے اعمال سے اُن بلندیوں کو چھو لیتا ہے جہاں فرشتے بھی نہیں پہنچ پاتے۔ ہم زمین میں ہل چلاتے اور بیج بوتے ہیں لیکن پھل ہمیں بلندی کی طرف ملتا ہے اور اُس کا ذائقہ بہت عُمدہ ہوتا ہے۔

انسانی اعمال میں خوفِ خدا اور خدا ترسی کے بعد صبر کا جذبہ انسان کو بہت بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ جب ہم مختلف مصائب وحوادث پر صبر کرتے ہیں، رنج والم پر صابر رہتے ہیں تو ہمارا بگڑتا کچھ نہیں، سنورتا بہت کچھ ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا زمین پر بے پناہ طوفانی بارشیں ہوتی ہیں، دریاؤں اور سمندر میں سیلاب آتے ہیں، زلزلے آتے ہیں لیکن زمین بہت استقلال کے ساتھ یہ سب کچھ سہہ جاتی ہے۔ قدرتی جنگلات میں گرمی کی شدّت کی وجہ سے آگ لگ جاتی ہے، جنگل تباہ ہو جاتا ہے لیکن ایک بہت حیرت انگیز بات ہے کہ اِس تباہ شدہ جنگل کی راکھ سے جو جنگل جنم لیتا ہے وہ کہیں زیادہ سرسبز و شاداب اور گھنا ہوتا ہے۔ اِسی طرح انسان پر مصیبتیں آتی ہیں، وہ غم میں مبتلا ہوتا ہے، اُس کے حالات دشوار ہو جاتے ہیں لیکن جب وہ صبر کر کے ہر مشکل سے نکلتا ہے تو پہلے سے کہیں زیادہ دانش ور اور صاحبِ بصیرت ہو چکا ہوتا ہے۔ بعد کی زندگی پہلی زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہو جاتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مشکلات میں مستقل صبر کا مظاہرہ کیا جائے۔

سوال: اگر مرشد کے حوالے سے کوئی مرید کے سامنے Negative comment کر دے تو مرید کو React کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب: انفینٹری روڈ پر فضل شاہ صاحب آرام فرما رہے ہیں۔ لوگ اُنھیں بابا نور والے کے نام سے جانتے ہیں۔ اشفاق احمد، منو بھائی، حنیف رامے اکثر اُن کی صحبت میں اپنا وقت گزارا کرتے تھے۔ میری بھی اُن سے

ایک ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بار اشفاق احمد بتا رہے تھے کہ بابا نور والے کے پاس ایک نوجوان آیا اور خاصی بدتمیزی کرنے لگا۔ منو بھائی جو یہ سب دیکھ رہے تھے، اُن سے یہ برداشت نہ ہوا اور وہ اُس نوجوان کو مارنے کے لیے اُٹھے۔ بابا جی نے اُنھیں کہا ''بیٹھ جاؤ۔ روزانہ اِتنے لوگ آ کر میری تعریف کرتے ہیں اُنھیں مارنے کے لیے تو تم کبھی نہیں اُٹھے، آج ایک نوجوان نے بدتعریفی کی تو تم اُسے مارنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔''

میرے نزدیک ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ کسی کے بارے میں جو مناسب سمجھے رائے قائم کر لے اور اُس کا اظہار کر دے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا ''اُنھیں اُن کی ماؤں نے آزاد جنا، تم اُنھیں غلام کیسے بنا سکتے ہو؟''

اگر کوئی صاحب کسی کے بارے میں بدترین رائے قائم کر لیں تو اُنھیں ایک حد تک اُس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس بدترین Comment کو بہت سکون اور حوصلے سے سُنا جانا چاہیے۔ یہ ایک General life کی بات میں کر رہا تھا لیکن آپ کے مرشد کے بارے میں اگر کوئی Negative comment کرتا ہے تو اُس کا احسن ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ Politely اِس سے Request کریں ''بھائی! یہ میرے مرشد ہیں۔ میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ اس کا اظہار میرے سامنے نہ کریں کیوں کہ میری دل آزاری ہوتی ہے۔''

سوال: جعلی پیروں نے صوفیا حضرات کے بارے میں عام رائے کو خراب کر دیا ہے۔ ایسے میں کیا کیا جائے؟

جواب: انگریزی کا ایک Proverb ہے۔

The taste of pudding is in eating.

میرے خیال میں اِس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ آپ مثبت سوچ و کردار کے ساتھ شمع جلاتے رہیے۔ جہاں چراغ جلے گا وہاں روشنی ضرور ہوگی پھر کوئی ثابت نہیں کر سکے گا کہ وہاں اندھیرا ہے۔

جو لوگ صوفیا کرام کو اچھا نہیں سمجھتے، ایسا سمجھنا اُن کا حق ہے۔ آپ اُنھیں وہ حق دیجیے۔ رب حق کو ثابت کر دیتا ہے بس صبر اور وقت کی بات ہے۔ رب کو ثابت کرنے دیجیے کہ کیا غلط اور کیا صحیح ہے!

سوال: لوگ آپ کے پاس شادی، کاروبار اور دیگر اُمور کے سلسلے میں مشورہ کرنے آتے ہیں۔ کیا آپ استخارہ کے بعد جواب دیتے ہیں؟

جواب: میں دُعا سے مشورہ دیتا ہوں۔ دُعا کرنا اور کرانا دونوں ہی سنت ہیں۔

سوال: رزق کی تنگی میاں یا بیوی میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتی ہے یا دونوں کی وجہ سے؟ عموماً کہا جاتا ہے کہ رزق عورت کی قسمت کا ہوتا ہے جیسا کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں رزق کی تنگی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اُسے دوسری شادی کرنے کا فرمایا۔ جس کی وجہ سے رزق تنگ ہو رہا ہو کیا اسے اپنے پارٹنر کو Let go نہیں کہہ دینا چاہیے؟

جواب: میں جواب عرض کرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب دیں کہ اگر بیوی یہ محسوس کرے کہ شوہر کی وجہ سے رزق کی تنگی ہے تو کیا وہ شوہر کو طلاق دے دے گی؟

بہت سے شوہر آپ کو ایسے مل جائیں گے اور میں شاید اُن میں سرفہرست ہوں کہ جن کے کرتوت رزق کی تنگی کا باعث بنتے ہیں۔ بیوی کو تو میں الزام دے دوں گا لیکن خود اپنے غلط اعمال کو کیسے Justify کروں گا؟

یہ صحیح ہے کہ ہر انسان کو اپنی تقدیر میں لکھا گیا رزق ہی ملتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایسی بیوی مل گئی جس کی تقدیر میں وافر رزق نہیں لکھا ہوا تو وہ دوسری شادی کر لے لیکن اگر دوسری تیسری اور چوتھی شادی کے بعد بھی رزق میں اضافہ نہ ہوا تو وہ کیا کرے گا؟

آپ ﷺ کے زمانے کا جو قصہ آپ نے Quote کیا اُس کا مطلب یہ نہیں کہ رزق کی فراوانی یا تنگی بیوی کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان کی تقدیر میں رزق لکھا ہے۔ کچھ کی تقدیر میں کم اور کچھ کی تقدیر میں زیادہ۔ جب افراد ایک کے بجائے دو ہو جائیں تو رزق اُسی حساب سے بڑھ جاتا ہے۔ جوں جوں افراد بڑھتے جائیں گے رزق میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

بجائے یہ سوچنے کے کہ کم رزق رکھنے والے انسان کو Let go کر دینا چاہیے یہ دُعا کیوں نہ کر لی جائے ''یا اللہ! ہم پر رزق وسیع کر دے۔'' ہم دُعا کرتے رہتے ہیں ''یا اللہ! میری تنخواہ بڑھا دے۔ مجھے ترقی دے دے۔ مجھے اِس پوسٹ سے بہتر پوسٹ پر لے جا۔'' آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ سب دُعائیں قبول ہونے کے باوجود تنگ دستی برقرار رہتی ہے۔ تنخواہ دو تین گنا بڑھ جاتی ہے لیکن تنگی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کو Indirectly یہ Suggest کر رہے ہوتے ہیں کہ تُو وہ کر جو ہم چاہتے ہیں۔ اِس دُعا اور Suggestion کا نتیجہ خوش حالی کے بجائے تنگ دستی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اِسی طرح ہم اولاد کی شادی کے وقت دُعا کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ اُن کی شادی ہو جائے۔ جب وہاں شادی ہو جاتی ہے تو مشکلات شروع ہو جاتی ہیں۔ رب عالم الغیب ہے اور جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ اُس کے فیصلے ہمارے لیے بہترین ہوتے ہیں۔

اگر ہم رب تعالیٰ کو Suggestions دینے کے بجائے یہ دُعا کر لیں ''یا رب! تُو مجھ پر رزق وسیع کر دے اور مجھے اس جہان اور اُس جہان میں باعزت کر دے۔'' یا پھر ایک اور دُعا کر لیں ''یا اللہ! تُو مجھے اِتنا وسیع رزق عطا فرما دے کہ میری جائز ضرورتیں پوری ہونے کے بعد اُس میں سے جو بچ جائے، وہ تیرے بندوں پر خرچ کر سکوں۔'' تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور وہی آمدنی جس میں تنگ دستی تھی، اُس میں ایسی فراخی آتی ہے کہ انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ پیسے ختم ہی نہیں ہوتے۔ ہم رب تعالیٰ سے کہتے ہیں سب عزتیں تیرے ہی لیے ہیں لیکن تُو جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے، تُو دونوں جہان میں عزت عطا فرما دے۔ اِس دُعا کے بعد ایک کھلا میدان ہے رب جہاں سے جس طرح چاہے آپ کو عزت عطا فرما دے۔ اگر ہم دُعا کرتے ہوئے اپنے الفاظ کو Cleverly phrase کر لیں تو بہت سی مشکلات سے بچ جائیں گے۔

رزق کی تنگی کا سبب بیوی کو قرار دینے کے بجائے اگر ہم اپنی دُعا کو درست کر لیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اگر آپ کو شک ہو کہ شادی کے بعد بیوی کی وجہ سے کہیں رزق کم نہ ہو جائے تو نکاح کے وقت یہ دُعا کر لیجیے ''یا اللہ! میں تیرے حبیب ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے نکاح کر رہا ہوں، تُو میری منکوحہ کو میرے لیے بابرکت کر دے۔''

سوال: کچھ مغربی سوچ کے حامل اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مُلا ازم کی وجہ سے اسلام سے بے زار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اسلام کی اصل رُوح سے روشناس کرانے کے لیے کچھ ایسے اولیاء اللہ ڈیوٹی پر دکھائی دیتے ہیں جن کا ظاہر ایک آدھ وجہ سے شریعت کے تقاضے پورے کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ کیا فیلڈ سے Related اِن اولیاء اللہ کو اپنی ڈیوٹی بہترین انداز میں پوری کرنے کے لیے سیکریٹریٹ سے کوئی Relaxation مل جاتی ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ملا ازم کی Term کو Promote کرنا کوئی زیادہ اچھی بات نہیں۔ یہ خاصا Derogatory ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جو ڈیوٹی مولوی صاحب سرانجام دیتے ہیں وہ میں اور آپ پوری نہیں کر سکتے۔ جتنا علم اللہ نے اُنھیں عطا کیا ہے وہ اُسے خلقِ خدا میں پھیلاتے ہیں۔ ایک بہت ہی Exerting ڈیوٹی انھوں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ آپ کسی بھی مولوی صاحب کو پیراشوٹ کے ذریعے کسی ایسے جنگل میں پہاڑ کی چوٹی پر اُتار دیجیے جہاں سو سو میل دور تک کسی انسان کا وجود نہ ہو۔ اُس ویرانے میں بھی وہ اذان دے کر نماز ادا فرمائیں گے۔ یہ کام اِتنا بڑا ہے کہ ہم سے اُن کی عزت کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

باقی رہ گئی بات ڈیوٹی پر مامور اولیاء اللہ کے ظاہری حلیے کی تو ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی شخص کی ظاہری و مخفی زندگی پر نظر رکھ سکیں۔ نا معلوم وہ شخص تنہائی میں کیا کرتا ہے۔ کسی کے محض ظاہر کی وجہ سے اُس پر غلط گمان کرنا ہمارے لیے باعثِ شرمندگی ہو سکتا ہے۔ نہ جانے وہ شخص اندر سے کتنا اچھا ہو۔

کسی کے ظاہر سے متاثر یا بدگمان نہ ہوں بلکہ اِس کا فیصلہ رب تعالیٰ پر رہنے دیں۔ جس کا ظاہر آپ کو ایک آدھ وجہ سے شریعت کے مطابق نہیں لگ رہا، رب اُسے کیا سمجھ کر کیا انعام دے رہا ہے۔ یہ صرف رب ہی جانتا ہے۔

کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ شریعت پر عمل کر رہا ہے یا نہیں، بہت مشکل ہے۔ چھوٹی موٹی چیزیں تو ہم ظاہراً دیکھ لیں گے مثلاً وہ شخص نماز وقت پر پڑھ رہا ہے یا نہیں، جھوٹ بولتا ہے یا نہیں، کسی کا حق تو نہیں مارتا لیکن بہت سے معاملات ہماری نظروں سے اوجھل ہوں گے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہم جب کسی کو Evaluate کر رہے ہوتے ہیں تو اُن باتوں کو Value ہی نہیں دیتے جن کو رب تعالیٰ نے سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا اور جن کی معافی تب تک نہیں ملتی جب تک متاثرہ شخص ہمیں معاف نہ کر دے۔ مثلاً یتیم کا مال کھانے کی بہت شدت سے ممانعت کی گئی ہے۔ دوسروں کا حق مارنے، کم تولنے سے شدت سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن ہماری نظر اِن سب باتوں کے بجائے محض ظاہری اُمور

پر ہوتی ہے اور اِنہی کی بنیاد پر ہم کسی انسان کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ دے دیتے ہیں۔

یہ بات شاید کسی کو پتا نہ چل سکے کہ رب کس طرح انسان اور اُس کے اعمال کو پرکھتا ہے اور کن باتوں پر اُسے انعام عطا کر دیتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اِن قصوں میں نہ پڑیں تا کہ بھٹکنے سے بچ جائیں۔

جہاں تک Relaxation کی بات ہے تو یاد رکھیے کوئی آدمی خواہ وہ کسی بھی مقام پر ہو، اُسے شریعت سے Relaxation نہیں ملتی۔ نماز کی معافی تو آپ ﷺ کو بھی نہ تھی حالاں کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ کے بعد سب سے بڑی ہستی ہیں۔ آپ ﷺ سے زیادہ دین دار اور دین کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن نماز اور روزے سے Relaxation آپ ﷺ کو بھی نہ تھی۔ سو جس کو آپ نے سیکریٹریٹ کا نام دیا وہاں سے کسی ولی اللہ کو شریعت سے متعلق Relaxation کیسے مل سکتی ہے! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دُعا کس طرح مانگیں

ہم رب کے حضور جو دُعا کرتے ہیں، اگر وہ دل سے نہیں نکلی تو پھر وہ دُعا نہیں کیوں کہ دُکھی دل سے نکلی ہوئی آواز کا نام دُعا ہے۔ دُعا کا مطلب ہی یہ ہے کہ زبان کہے یا نہ کہے دل سے آواز اُٹھے۔ ایسی دُعا اور آواز رب سنتا، قبول فرماتا اور پوری بھی کر دیتا ہے۔

قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ میں دُعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہوں۔

دُعا کا پورا ہونا دراصل بہت سی چیزوں کے ساتھ مشروط ہے۔ رب تعالیٰ اِس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے اور یہ کائنات ایک بہت Delicate balance پر قائم ہے۔ اللہ رب العالمین ہے۔ وہ ہماری طرح Haphazard کام نہیں کرتا، اُس کے کام تو Flawless planning پر قائم ہیں۔ کیوں کہ رب مکمل ہے۔ اُس کے ہاں Flaws نہیں ہیں۔ Flaws تو ہم انسانوں میں ہوتے ہیں۔

میں رب کے حضور دُعا مانگتا ہوں، رب اُسے پورا ضرور کرتا ہے لیکن اُس وقت جب میرے اردگرد کے حالات ایسے ہو جائیں کہ اُس دُعا کا پورا ہونا میرے مفاد میں ہو جائے۔ دُعا کی قبولیت کے حوالے سے ہم بہت جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور شکوہ کرتے رہتے ہیں ''یا رب! تُو میری کیوں نہیں سنتا'' حالاں کہ رب ہی تو سننے والا ہے۔

جب ہم رب کے حضور دُعا کرتے ہیں اُس وقت ہمارے دل میں یقین ہو کہ میرا رب دُعائیں سننے، قبول کرنے اور پوری کرنے والا ہے۔ آج تک وہ میری دُعائیں پوری کرتا آیا ہے، آیندہ بھی کرے گا۔ یہ یقین ہمیں اُس شکوے سے بچالے گا کہ رب تو میری دُعا سنتا ہی نہیں۔ ایک سچے مسلمان کے لیے رب سے شکوہ کرنا مناسب نہیں۔

ایک اور تباہ کن قسم کی غلطی ہم کرتے ہیں کہ اللہ پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی عقل پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ مثلاً میری عقل کہتی ہے کہ اگر میری ٹرانسفر اسلام آباد ہو جائے تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ عقل کی یہ آواز سن کر میں اپنے ایمان کے اُس حصے کو بھول جاتا ہوں کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میرا علم بھی ناقص و نامکمل ہے اور عقل بھی۔ میں اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتا جب کہ میرا رب عالم الغیب ہے۔ ازل سے ابد تک کے تمام معاملات کو جانتا ہے۔

اگر میرا ایمان یہ ہے کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میری عقل بھی ناقص اور علم بھی نامکمل تو پھر میں ہر روز پانچوں نمازوں کے بعد یہی دُعا کیوں کرتا ہوں ''یا اللہ! میری ٹرانسفر اسلام آباد کر دے۔ مجھے فلاں چیز عطا کر دے۔''

میں یہ دُعا کرنے کے بجائے اللہ کے حضور یہ کیوں نہ عرض کر دوں ''یا باری تعالیٰ! تُو نے مجھے جو علم و عقل عطا فرمائی ہے اُس کے مطابق مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے لیے اسلام آباد جانا بہتر ہے لیکن تُو بہر حال زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اگر اسلام آباد میں میری ٹرانسفر بہتر ہے تو کر دے۔'' اس دُعا کے بعد رب جو عطا فرمائے گا وہ اُس سے کہیں بہتر ہوگا جو میں مانگ رہا تھا۔

اِسی طرح میں دُعا کرتا ہوں ''یا اللہ! تُو میرا بزنس چلا دے۔'' یہ دُعا کرتے ہوئے At the back of my mind یہ بات ہوگی کہ بزنس چلے گا، انکم بڑھے گی، خوش حالی آجائے گی۔ میں نے بہت بار دیکھا کہ کسی نے بزنس کی بہتری کے لیے دُعا کی یا کروائی تو بزنس بہت اچھا چلا، انکم بھی بڑھ گئی لیکن پریشانی پھر بھی یہی رہی کہ گزارہ نہیں ہو رہا، قرض لینا پڑتا ہے۔

یہ دُعا کرنے کے بجائے کہ بزنس چل پڑے یوں دُعا کیوں نہ کی جائے ''یا باری تعالیٰ! تُو اپنی رحمت اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے مجھ پر رزق وسیع فرما دے اور اُس رزق میں برکت عطا فرما دے'' یا پھر یوں دُعا کر لیں ''یا اللہ! تُو مجھے اِتنا وسیع رزق عطا فرما دے کہ میری جائز ضروریات پوری ہونے کے بعد اُس میں سے جو بچ جائے، اُس سے میں تیرے بندوں کی خدمت کر سکوں۔''

اب رب تعالیٰ جہاں سے چاہے مجھے رزق عطا فرما دے، اُس کے خزانے بے پایاں ہیں۔ وہ بزنس سے نہ سہی کہیں اور سے مجھے وسیع رزق سے نواز دے گا۔

کسی خواہش کی تکرار ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم جو مسلسل مانگ رہے ہوں وہ ہمیں اِس لیے عطا نہ ہو رہا ہو کہ ہمارے لیے بہتر نہیں۔ غالباً 88-1987ء کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب ٹمن آباد میں بسطامی روڈ پر رہتے تھے۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ اللہ اُنھیں کار دے دے۔ جو بھی ملتا اُس سے یہی دُعا کراتے۔ ایک زمانہ گزر گیا لیکن دُعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دو بار اُن سے عرض کی ''حضور! آپ کی خواہش بالکل فطری ہے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ اِتنی دُعاؤں کے باوجود آپ کو کار نہیں مل رہی تو کہیں اس کا یہ مطلب نہ ہو کہ کار کا ملنا آپ کے مفاد میں نہ ہو۔'' تب اُنھوں نے وہ غلطی کی جو میرے جیسا ہر کمزور انسان کرتا ہے ''شاہ صاحب! اِس بات کو چھوڑیئے کہ کار کا ملنا میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں بس کار مل جانی چاہیے۔''

اس کے کچھ عرصے بعد وہ کسی کام کی غرض سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، اُن کی Wife کے بھائی بیرونِ ملک سے وطن واپس آئے تو اپنی بہن سے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ ہم By road آئے ہیں۔ بہن نے باہر نکل کر دیکھا تو Left-hand drive بالکل نئی کرولا کھڑی تھی، بے ساختہ اُن کی زبان سے نکل گیا کہ آپ کے بہنوئی کی شدید خواہش ہے کہ کرولا مل جائے۔ بھائی اچھے تھے جاتے ہوئے گاڑی کی چابیاں وہیں چھوڑ گئے کہ یہ کار ہمارے بہنوئی کے لیے تحفہ ہے۔

وہ صاحب میرے پاس آئے اور خوشی خوشی بتانے لگے کہ جناب مجھے میری پسند کی گاڑی مل گئی ہے۔ چند دنوں بعد اُنھیں اسلام آباد جانا تھا، اکلوتے بیٹے کو ساتھ بٹھایا اور روانہ ہو گئے۔ ایک بس کو اوورٹیک کیا، ٹرن لینے سے پہلے بیٹے سے پوچھا کہ سامنے کلیئر ہے۔ بیٹے نے اپنی عقل کے مطابق اوکے کا سگنل دیا جیسے ہی Left-hand drive گاڑی سے ٹرن لیا اچانک بس سامنے آگئی Head-on collision ہوا اور باپ بیٹا دونوں موقع پر انتقال کر گئے۔

یہ واقعہ مجھے یاد دلاتا رہتا ہے کہ ہم رب کے ساتھ اِتنی قطعیت کے ساتھ Indefinite terms میں Specific کام کی دُعا کرنے کے بجائے اُسے رب پر چھوڑ دیا کریں کہ اگر تو اُسے میرے لیے بہتر سمجھتا ہے تو میری یہ خواہش پوری کر دے۔ پھر اللہ ہمارے لیے جو فیصلہ کرے گا وہ ہمارے حق میں یقینی طور پر بہت بہترین ہوگا۔

ہم دُعا مانگتے ہوئے الفاظ کے بارے میں محتاط ہو جائیں اور رب کی محبت میں ڈوب کر مان کے ساتھ رب کو پکاریں کیوں کہ ایسی پکار سے رب خوش ہوتا ہے۔ رب الفاظ کو نہیں بلکہ بندے کے دل میں موجود اُس مان کو دیکھتا ہے کہ میرا رب سب سے بڑا ہے۔ میرا رب سب سے بڑا دیالو ہے، میرا رب مجھے انکار کر ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ اِتنا عظیم اور مہربان ہے کہ اُس کے ہاں سچی پکار کے جواب میں انکار ہے ہی نہیں۔

جب بندہ مان کے ساتھ رب کو پکارتا ہے تو بامراد ٹھہرتا ہے۔ ہم اپنے معاملات اللہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا کریں۔ ہم یہ نہ کہا کریں ''یا اللہ میری تنخواہ بڑھا دے، میری ترقی کر دے، میرا کاروبار چلا دے۔'' بلکہ ہم یہ کہا کریں ''یا اللہ! میرا رزق وسیع فرما دے۔''

ہم اپنا دستر خوان وسیع کر لیں کہ روز دو چار لوگ وہاں کھانا کھائیں۔ یہ عمل خود ہمارے لیے بہتر ہوگا کیوں کہ رب اِس سے راضی ہوتا ہے۔

رات کو گیارہ، بارہ بجے میں ٹی وی کے چینل تبدیل کر رہا تھا، محرم کا مہینہ تھا کہ ایک چینل پر ایک مولانا صاحب تلاوت کے بعد ترجمہ بیان کر رہے تھے۔ جسے سن کر مجھے خود پر افسوس ہوا کہ میں نے وہ آیات سینکڑوں بار پڑھ رکھی تھیں لیکن کبھی اُن کے ترجمہ پر غور ہی نہ کیا تھا۔ اُس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ جو لوگ اپنی خواہش اور بھوک کے باوجود اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیتے ہیں اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اُن کے لیے ایک ایسا حوض قائم کر دے گا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائیں گے اور پیاس بجھانے کے لیے اُنھیں خود حوض تک نہیں جانا پڑے گا بلکہ وہ حوض خود پیاسے کے پاس آجائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ رب تعالیٰ کو تین عمل بہت پسند ہیں:

1۔ بھوکے کو کھانا کھلانا

2۔ مقروض کا قرض ادا کرنا

3۔ غلام یا قیدی کو آزاد کرانا

بھوکے کو کھانا کھلانے کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ جب ہم کسی کو اپنی جیب سے کچھ دیتے یا کھانا کھلاتے ہیں تو وہ شخص ہم سے کچھ لینے کے بجائے درحقیقت ہمیں بہت کچھ دے کر جا رہا ہوتا ہے۔ یہ رب کا وعدہ ہے کہ تم میرے نام پر ایک دو، میں تمھیں اُس کا دس گنا دوں گا۔ اللہ کی راہ میں جب ہم کسی کو کھانا کھلاتے ہیں تو ایک حصہ وہ کھا لیتا ہے اور نوگنا رزق ہمارے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ یہ اُس کا ہم پر احسان ہے۔

جن لوگوں نے اپنے دسترخوان وسیع کیے اُن کے لیے دُنیا میں کبھی رزق کم نہیں ہوا۔ اللہ اُنھیں بے پناہ رزق دیتا رہا۔ یہ نہیں کہ رزق وافر ہو تب ہی دسترخوان وسیع کیا جا سکتا ہے۔ یہ توفیق کی بات ہے کہ اپنے کھانے میں ہم دوسروں کو شریک کر سکیں کیوں کہ ہم اُنھیں شریک ہی کر سکتے ہیں کھلا نہیں سکتے۔ یہ رب ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے۔

اگر میرے پاس کھانا اپنی بھوک مٹانے سے بھی کم ہے مثلاً دو روٹی کی مجھے بھوک ہے لیکن میرا ایک روٹی ہے تو میں اُس ایک روٹی کو بھی چار آدمیوں میں تقسیم کر لوں۔ یوں میں نے اُن کے ساتھ اپنی بھوک کو تقسیم کر لیا۔ رب تعالیٰ کو بندے کا یہ عمل بہت پسند ہے۔

مجھ جیسے کمزور لوگ عموماً اپنی محرومیوں کو یاد رکھتے ہیں یا نامقبول دُعاؤں کو اور بھول جاتے ہیں نعمتوں کی اُس بارش کو جو صبح شام ہم پر برس رہی ہے۔

ہمارا ایک اور رویہ بہت عجیب و غریب ہے کہ ہم غربت سے بہت خوف زدہ رہتے ہیں حالاں کہ مجھے اور آپ کو بڑا فخر ہے کہ ہم سب آپ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ ہمیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہم آپ ﷺ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ آپ ﷺ کا کوئی قول یا فعل مصلحت سے خالی نہیں۔ آپ ﷺ کی مکی زندگی کا مطالعہ کریں تو اِس میں تکالیف ہی تکالیف نظر آتی ہیں۔ مدنی زندگی میں آپ ﷺ کو حکومت عطا ہو گئی لیکن اِس کے باوجود آپ ﷺ نے مساکین کی سی زندگی گزاری۔ اور یہ دُعا بھی کی ''یا اللہ! تو قیامت کے روز مجھے مساکین میں سے اُٹھانا۔'' آپ ﷺ نے عسرت اور غربت کی جو زندگی گزاری وہ By choice تھی۔ آپ ﷺ اگر چاہتے تو پورا کوہِ احد سونے کا ہو جاتا۔

ہم آپ ﷺ کے اُمتی ہیں لیکن ہمیں سب سے زیادہ خوف غربت اور مسکینیت کی زندگی سے رہتا ہے۔ حالاں کہ تقریباً تمام پیغمبروں اور اولیائے کرام نے عسرت کی زندگی گزاری۔

آپ اولیائے کرام کو بُرا بھلا کہہ دیں، الزام لگا دیں، وہ بیٹھے مسکراتے رہیں گے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ دوسروں کی زیادتی پر خاموش رہنا اور صبر کرنا سنت ہے اور اِس کا اجر اللہ کے ہاں بے پناہ ہے۔ اہلِ فقر کے لیے یہ دُنیا ایک قید خانہ ہے۔ فقیر دن گنتا ہے کہ میں کب اِس قید سے رہا ہو کر اپنے رب سے ملاقات کروں گا۔ اُسے اپنے رب کے دیدار کا شوق رہتا ہے۔ چوں کہ اہلِ فقر کو ہر لمحہ دُنیا کے قید خانے سے رہائی کا انتظار رہتا ہے۔ اِس لیے وہ اِس دُنیا سے دل لگاتے ہی نہیں۔

بہت سے ایسے اولیا بھی گزرے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے دُنیاوی مال و دولت اور نعمتوں کی بے حد بارش کر رکھی تھی لیکن اُنھوں نے کبھی اُس دولت کو دل میں جگہ نہیں دی اور دُنیا سے دل نہ لگایا بلکہ رب کے عشق میں ڈوبے رہے اور اُس کے دیدار کے منتظر رہے۔

ہم فنا فی اللہ کی ایک Term استعمال کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ خالق اور مخلوق کا فرق کبھی کم نہیں ہوتا۔ خالق کی حیثیت بطور خالق اور مخلوق کی حیثیت بطور مخلوق قائم رہتی ہے۔ جس شخص نے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی محبت میں مٹا ڈالا، رسول اللہ ﷺ کی محبت میں خود کو مٹا ڈالا، مرشد کی محبت میں خود کو مٹا دیا، خود کو مٹا دینے کے باوجود رب کے ساتھ اُس کا تعلق بندے ہی کا رہے گا۔ ہم محاورتاً کہتے ہیں کہ فنا وہ مقام ہے جہاں انسان دوئی سے یک جائی کے مقام پر چلا جاتا ہے لیکن وہ یک جائی اس طرح کی ہے کہ خالق اور مخلوق کی حیثیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کیوں کہ نہ تو خالق کبھی مخلوق میں Merge ہوتا ہے اور نہ ہی مخلوق خالق میں Merge ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ Prerogative ہے کہ وہ جس کی دُعا چاہے سن لے، قبول کر لے اور جس کی دُعا چاہے رد کر دے۔ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے دے۔ فنا فی اللہ ہونے کے باوجود انسان کی حیثیت تبدیل نہیں ہو گی۔ کسی کو یہ جرأت نہیں کہ رب تعالیٰ کو مجبور کر سکے کہ وہ اِس کے کہنے پر چلے۔

دُعا آپ بھی کر سکتے ہیں، فقیر بھی اور پیغمبر بھی لیکن رب کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ ہم فقیر سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ فنا فی اللہ کے مقام پر چلا گیا ہے تو اُس کی کہی ہر بات پوری ہو جائے گی۔ نہیں، وہ پھر بھی رب کا محتاج ہی رہے گا۔ یہ صرف اللہ ہی ہے کہ وہ جو بھی ارادہ کرتا ہے، ہو جاتا ہے۔ یہ رب کی مہربانی ہے کہ وہ کسی شخص کی کہی باتیں پوری کر دے لیکن بہر حال حق رب کا ہے کہ وہ جہاں چاہتا ہے فقیر کی بات پوری نہیں کرتا۔

فنا فی اللہ کے مقام پر فائز لوگوں کی کہی ہوئی باتیں مسلسل پوری ہونے لگیں تو بشریت کے تقاضے کے تحت اُن کے دل میں یہ خیال آنے لگتا ہے کہ میں جو کہتا ہوں پورا ہو جاتا ہے۔ یہ خیال اُسے جوں ہی تکبر کی طرف لے جانے لگے رب تعالیٰ اُسے جھٹکا دیتا ہے، اُس کی کہی بات پوری نہیں کرتا اور یوں اُس شخص کے پاؤں زمین پر آ جاتے ہیں۔

جب ہم کسی ایسے فقیر کے پاس جائیں جو فنا فی الرسول یا فنا فی اللہ کے مقام پر ہے تو کبھی یہ نہ سوچیں کہ وہ جو دُعا کرے گا یا جو بات کہے گا وہ پوری ہو جائے گی۔ یہ مقام تو صرف رب کا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کسی مخلوق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

آپ اہلِ فقر کے پاس ضرور جائیں لیکن یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ اُن کی کہی باتیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کے مقام پر کیسے پہنچے۔ آپ اگر اُنھیں دُعا کے لیے کہیں تو یہ سوچ کر کہ اگر اللہ چاہے گا تو دُعا پوری کر دے گا۔ جب ہمارا ذہن اِن سب باتوں کے بارے میں Clear

ہو گا تو فقیر کی کہی بات پوری نہ ہونے کی صورت میں ہمیں دھچکا نہیں لگے گا اور نہ ہی اُس کے بارے میں کوئی بدگمانی دل میں پیدا ہوگی۔

ایک اور بات میں Clear کرنا چاہتا ہوں۔ اسلام میں عقل اور علم کا استعمال کرتے ہوئے کوشش کرنا فرض ہے۔ ایسے میں انسان تلوار کی دھار پر چل رہا ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اپنی کوششوں پر بھروسا اور اعتبار کرتا ہے اور نہ ہی بے عمل رہتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ رب کو سست اور کاہل لوگ پسند نہیں۔ وہ تو اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو مجاہدوں کی طرح عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں اور پوری تن دہی کے ساتھ محنت کرتے ہیں۔ لیکن بھروسا اپنی محنت اور کوشش پر کرنے کے بجائے رب تعالیٰ پر کرتے ہیں۔

ہمیں ایک Motto یاد رکھنا چاہیے کہ عبادت رب کی کی جائے لیکن زندہ رب کے بندوں کی خدمت کے لیے رہا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھرپور کوشش اور محنت کرتے رہیں لیکن ہر صورت بھروسا رب تعالیٰ پر رکھیں اور دُعا کریں ''یا اللہ! اپنی ہمت اور تیری عطا کردہ عقل اور فہم و فراست سے کام لے کر میں نے بھرپور محنت کر لی ہے، تُو اپنی رحمت کے صدقے اِس محنت کو قبول فرما لے اور اِس کا بہترین اجر عطا فرما دے۔'' یاد رکھیے اجر من جانب اللہ ہے۔

جب ہم کوشش کو Secondary حیثیت دے دیتے ہیں اور دُعا کو اولیت دیتے ہیں تو گویا ہم اپنے فرائض سے منہ موڑ کر بے عملی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

ہم جب کسی ولی اللہ کے پاس دُعا کرانے جاتے ہیں تو بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں اور یہ سوچتے تک نہیں کہ بچے اِس سے کہیں یہ تاثر نہ لے لیں کہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں، محض دُعا سے ہی کام ہو جائے گا۔ خدا کے لیے اپنے بچوں کو بے عملی کی راہ سے بچائیں۔ قرآن پاک میں واضح طور پر فرما دیا گیا ہے ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اُس نے کوشش کی۔'' معجزات اور کرامات Exceptions ہیں۔ ہم Exceptions کے پیچھے بھاگنے کے بجائے محنت کا راستہ منتخب کریں اور پھر رب تعالیٰ سے اُس محنت کے بہترین اجر کی دُعا کریں لیکن بچوں کو دُعا کے ساتھ ساتھ بھرپور کوشش اور محنت کرنا بھی سکھائیں۔

سوال: ابن العربی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: اُن کا پورا نام غلام محی الدین ابن العربی تھا۔ اُنھوں نے علم و عقل کی ایسی باتیں کہیں جو اُن کے دور کے لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اِسی وجہ سے بہت سی Controversies پیدا ہو گئیں۔ خاص طور پر جب اُنھوں نے فلسفہ وحدت الوجود متعارف کرایا تو لوگ اُسے سمجھ نہ پائے اور اِتنا فساد پھیلا کہ ہزاروں مسلمانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔

نشست نمبر 31

یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

ہم سب اِس ملک کی مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے بارش کو پسند اور ہر طریقے سے انجوائے کرتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو بارش اور انسانی زندگی میں ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ بارش ایک Cycle ہے۔ بادل ہواؤں کے دوش پر اُڑتے پھرتے ہیں، جب یہ برستے ہیں تو وہی پانی جو اِتنی بلندی پر بادل کی صورت ہوا کے دوش پر اُڑتا پھرتا ہے، زمین پر آن گرتا ہے۔ اِس بلندی کو پستی نصیب ہو جاتی ہے لیکن وہ پانی پستی میں نہیں رہتا۔ سورج کی تپش اُسے بخارات میں تبدیل کر کے دوبارہ بلندی پر پہنچا دیتی ہے جو بادلوں کی صورت ہوا میں تیرتے نظر آتے ہیں۔

اِسی طرح انسان زمین پر آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں ہوتا ہے جو آسمانوں پر ہے۔ پھر جب اِس رُوح سے متعلق جسم تخلیق کے مراحل میں ہوتا ہے تو رُوح بلندی سے پستی کی طرف سفر کرتی ہے۔ اِس عالم اسباب میں اختیار انسان کا اپنا ہے کہ وہ عیش کے دن گزار لے اور پستی میں رہے یا اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے دیے ہوئے نظام اور احکامات کے مطابق ڈھال کر وہ بلندی حاصل کر لے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہیں۔

جس طرح پانی پستی میں آنے کے بعد سورج کی تپش سے بخارات میں تبدیل ہوتا اور تپتا ہے۔ اِسی طرح انسان اگر اِس دُنیا میں اپنے لیے آرام و آسائش سے بھرپور زندگی کا انتخاب کرنے کے بجائے مجاہدے سے گزرے، کیوں کہ شریعت پر عمل باقاعدہ ایک مجاہدہ ہے، تو مجاہدے کی آنچ اُسے پھر بلندی کی طرف لے جائے گی۔

مجھ جیسے کم فہم سمجھتے ہیں کہ جب ہم مشکلات کا شکار ہوتے ہیں یا حالات کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں تو شاید یہ ہماری پکڑ یا آزمائش ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ پکڑ یا آزمائش ہی ہو۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال کے ذریعے اِسے یوں سمجھایا ہے کہ ایک بھٹیارن چنے بھون رہی تھی۔ اُس نے چنے گرم ریت میں ڈالے، چنوں کو تپش ملی تو اُنھوں نے بھٹیارن سے کہا ''تم ہمیں کیوں تپش دے رہی ہو۔ ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟'' بھٹیارن بولی ''میں تمھیں تپش نہیں دے رہی بلکہ دراصل پہلے سے زیادہ لذیذ بنا رہی ہوں جو تپش سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔''

اِسی طرح جب اُستاد شاگرد کو سزا دیتا ہے تو اُس کا مقصد شاگرد کو نقصان یا ایذا پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ شاگرد کو خامیوں سے پاک کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ اچھا اور نیک انسان بن سکے۔

یہ جو ہم دُنیا میں مشکلات کا شکار ہوتے، سختیوں کو جھیلتے اور حالات کے جبر کو برداشت کرتے ہیں تو درحقیقت یہ ہماری آزمائش نہیں ہوتی بلکہ رب تعالیٰ ہمیں بھٹی میں ڈال کر کندن بنا رہا ہوتا ہے، جیسے دھوبی کے پاس سفید کپڑا بھیجیں تو وہ اُسے بھٹی چڑھا دیتا ہے تا کہ اُس میں سے میل کچیل نکل جائے، داغ دھبے دُور ہو جائیں اور وہ پہلے کی طرح سفید ہو جائے۔ رنگین کپڑے کو وہ کبھی بھٹی نہیں چڑھاتا۔ اِسی طرح انسان حالات کی بھٹی میں ڈالا جاتا ہے تا کہ اُس کے اندر کی تمام آلائشیں نکل جائیں اور وہ بہتر انسان بن جائے۔ یہ اللہ کا پیار

ذرا غور کیجیے کیا تمام پیغمبروں نے مشکلات سے بھرپور زندگی نہیں گزاری؟ اگر یہ زندگی اچھی نہ ہوتی تو رب تعالیٰ اپنے پیاروں اور پیغمبروں کو ایسی زندگی عطا نہ کرتا۔ رب کے لیے تو اپنے بندوں کو پُرآسائش اور اعلیٰ ترین زندگی عطا کرنا کچھ دشوار نہیں۔ رب تو محض ارادہ کرتا ہے اور کام ہو جاتا ہے۔ لیکن رب کے محبوب ﷺ جن کے لیے یہ کائنات تخلیق ہوئی، اُن ﷺ کے پاس Option تھی کہ پُرآسائش زندگی گزاریں یا مشکل، لیکن آپ ﷺ نے سخت اور مشکل زندگی کو Opt کیا۔ میرے خیال میں تو یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ سخت زندگی پُرآسائش زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

نعمتیں اور مالی و مادی وسائل رب ہی کے عطا کردہ ہیں لیکن اِن مادی وسائل کو بہترین طریقے سے صرف اُسی صورت استعمال کیا جا سکتا ہے جب ہم سمجھ لیں کہ یہ سب رب ہی کے عطا کردہ ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ میرا ہے، دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اگر یہ میرا ہو تو میرے ساتھ جائے، یہاں نہ رہے۔ حقیقت یہی ہے کہ سب کچھ رب ہی کا عطا کردہ ہے اور اِس پر میرا صرف اُتنا حق ہے جس سے میری جائز ضروریات پوری ہو جائیں۔

جو انسان دُنیا میں آیا اُس کا زندگی گزارنے کا ڈھنگ ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"انسان عبادت کرے اپنے رب کے لیے اور زندہ رہے دوسروں کے لیے۔"

سوال: میاں بیوی اِنتہائی اَن بن کی صورت میں علیحدگی کے لیے جب آپ سے مشورہ کرتے ہیں تو آپ ہر صورت شادی چلانے کا ہی مشورہ دیتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: جس چیز سے رب تعالیٰ نے کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا، کوئی انسان اُسے کیسے پسندیدہ قرار دے سکتا ہے؟ اللہ رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیتا ہے۔ آپ اللہ کے کسی بندے سے مشورہ کریں گے تو وہ رشتہ جوڑے رکھنے ہی کی بات کرے گا۔

بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم قرآن پاک میں بھی ہے اور آپ ﷺ نے بھی یہی تلقین کی ہے۔ اگر کسی صاحب کی بیگم صاحبہ اُن کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں لیکن وہ صاحب جواب میں سو فی صد کہیں زیادہ بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کیا شکر کرنے کے لیے یہی احساس کافی نہیں کہ بروزِ قیامت اِس معاملے میں جواب دہی سے بچ جائیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے ذمہ واجب الادا حقوق پورے

نہیں کریں گے تو اُس کا جواب اُنھیں دینا ہوگا۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی زیادتی کا جواب زیادتی سے نہ دیا۔ بہتر ہے ہم بھی اِس سنت پر عمل کر لیں۔ پھر آپ ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ بہترین سلوک بھی ہمارے سامنے ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں بیوی کی تندخوئی اور تند بیانی کے جواب میں بھی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا جائے تو اُس کا انعام و اجر دُنیا و آخرت میں مل جائے گا۔

سوال: سات اور گیارہ کے عدد پر روشنی ڈال دیجیے؟

جواب: مسلمان ان قصوں میں نہیں پڑتا کہ کون سا عدد سعد اور کون سا منحوس ہے۔ مسلمان کا تمام تر بھروسا اپنے رب تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

میں محض بطورِ علم اِس بارے میں عرض کر دیتا ہوں ورنہ اِن اعداد کے زندگی پر اثر انداز ہونے پر میرا ایمان نہیں کیوں کہ رب تعالیٰ چاہے تو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سب کچھ بدل دے۔

سات رُوحانیت کا عدد کہلاتا ہے۔ یہ تعمیر کا عدد ہے۔ جیسے سات آسمان، زمین کی سات تہیں، روشنی کے سات رنگ۔ Numerology کے تحت اسم اللہ کے اعداد Work out کیے جائیں تو وہ گیارہ بنتے ہیں۔ لیکن گیارہ کو One plus one two نہیں کہا جاتا بلکہ یہ گیارہ ہی رہتا ہے۔

جب گیارہ لکھتے ہیں تو دو متوازی لائنیں کھینچتے ہیں۔ ہم سب کو جیومیٹری کا اُصول یاد ہے کہ Parallel lines ہمیشہ Infinity کو Show کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ Infinity ہے، لامتناہی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام کے اعداد بھی گیارہ ہی بنتے ہیں۔ آپ علم کی حد تک اعداد کے بارے میں ضرور جانیے لیکن بھروسا رب پر ہی کیجیے۔

سوال: خیال، اِلہام اور کشف کو کیسے Differentiate کیا جا سکتا ہے؟

جواب: میرے سامنے لکڑی، اینٹ یا لوہے کا ٹکڑا رکھا ہو تو میں آسانی سے جان لوں گا کہ کون سی چیز کیا ہے۔

خیال دل میں پیدا ہوتا ہے، مثلاً کسی شے پر غور کرنا شروع کیا تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ شے درحقیقت کیا ہے۔ خیال کے بعد رویا کا مقام ہے۔ فجر کی نماز سے کچھ پہلے جو خواب دکھائی دے یا آپ فجر کی نماز پڑھ کر سو جائیں تو جو خواب دیکھیں وہ عموماً سچا ہوتا ہے۔ اِلقاء و اِلہام رویا کے بعد آتے ہیں۔ انسان کسی مسئلے میں اُلجھا ہو تو رب تعالیٰ اُس مسئلے کا حل دل میں ڈال دیتا ہے۔ اِس میں ابہام نہیں یقین ہوتا ہے جب کہ کشف میں وہ ساری چیزیں اِس طرح دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے کھلی آنکھوں سے ٹی وی دیکھتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت کرے گا اور آپ اِن کیفیات سے گزریں گے تو خود بخود خیال، اِلہام، کشف کو Differentiate کرنا سیکھ لیں گے۔

سوال: کیا ہر مرشد کو اپنے مرید کا چہرہ دکھا دیا جاتا ہے؟

جواب: جس مرید نے مرشد کے وصال کے بعد اُن کی جگہ لینی ہوتی ہے عام طور پر اُس کا چہرہ مرشد کو دکھا دیا جاتا ہے۔

جس طرح آپ کسی بھی صاحبِ دُعا کے پاس چلے جائیں وہ آپ کے لیے دُعا ضرور کرے گا خواہ آپ کا چہرہ اُسے دکھایا گیا ہو یا نہ دکھایا گیا ہو کیوں کہ دُعا نہ کرنا بخل کی علامت ہے اور کوئی صاحبِ دُعا خود کو بخیل نہیں کہلوانا چاہتا۔

اِسی طرح صاحبِ علم کے پاس جو علم ہے وہ اُس کی ذاتی ملکیت نہیں۔ جو شخص بھی اُس کے پاس حصولِ علم کی نیت سے آئے گا صاحبِ علم اُسے کشف کے ذریعے پرکھ لے گا کہ اُس کی بنیادیں کس حد تک تیار ہیں۔ اگر وہ کوئی کمی پائے گا تو وہ اُسے اُن عادات پر قابو پانے کی تاکید کرے گا جو علم کے حصول کی راہ میں رُکاوٹ بن رہی ہوں گی مثلاً فرض کریں مجھے غیبت کرنے کی عادت ہے۔ میں اپنے مرشد کے پاس علم کے حصول کی غرض سے جاتا ہوں، وہ مجھے اپنے کشف کے ذریعے پرکھنے اور تولنے کے بعد کہیں گے۔ ''بھائی! ایک کام کریں لوگوں کے بارے میں Comment نہ کیا کریں۔'' یا پھر اگر میں غصے میں لوگوں پر برس پڑتا ہوں تو صاحبِ علم کہے گا کہ آپ غصے پر قابو پا لیا کریں کیوں کہ غصے کو پی جانے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے یا پھر وہ دیکھتے ہیں کہ میں کنجوس ہوں تو وہ کہتے ہیں سخاوت سنت رب بھی ہے اور سنت رسول ﷺ بھی۔ اب مجھے پتا نہیں چلے گا کہ اِس تلقین کے ذریعے صاحبِ علم مجھے علم کے حصول کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ جب وہ گراؤنڈ تیار ہو جائے گی اور صاحبِ علم محسوس کریں گے کہ میں نے اپنی عادات پر قابو پا لیا ہے اور اب زمین اِس قابل ہو گئی ہے کہ اِس میں بیج ڈالا جا سکے تو وہ مجھے علم کی کوئی اِبتدائی چیز عطا فرما دیں گے کہ آپ یہ پڑھا کیجیے۔

اگر مرشد واقعی صاحبِ علم ہے تو قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کی تلقین کرے گا کیوں کہ جب ہم کثرت سے تلاوتِ قرآن پاک کرتے ہیں تو علم کی فصل بونے کے لیے زمین خود بخود تیار ہونے لگتی ہے اور رب سے محبت دل میں جاگنے لگتی ہے۔

تلاوتِ کلامِ پاک جب ہم کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے رب ہم سے ہم کلام ہے۔ ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کا یہ اعجاز بھی ہے کہ ہمارے اندر سے بُرائیاں ختم ہونے لگتی ہیں اور پاکیزگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ صاحب علم قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت جاری رکھنے کی تلقین کرے گا اور کوئی مختصر سی چیز پڑھنے کے لیے عطا کر دے گا۔

آپ یہ مت سوچیے کہ مرشد کو میرا چہرہ دکھایا گیا ہے یا نہیں بلکہ آپ اُن کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیں۔ جو وہ کہیں آنکھیں بند کر کے کرنا شروع کر دیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ رب آپ کو دوسروں کے چہرے دکھانے لگے گا۔

سوال: کیا رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہوئے جنات کا نظر آنا لازمی ہے؟

جواب: یہ جنات انسان کے تابع ہوتے ہیں۔ جو آپ کا ماتحت ہے وہ آپ کو کیا کہے گا۔ صاحب علم سے تو جنات ویسے ہی دُور بھاگتے اور خوف زدہ رہتے ہیں۔ پاورفل صاحب علم کے پاس آ کر تو وہ ویسے ہی جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ جب انسان علم کے ایک خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے تب رب تعالیٰ اُسے ہزاروں سال پہلے اور آنے والے وقت کے بارے میں بہت کچھ دکھا دیتا ہے۔ آپ جنات سے مت ڈریے۔

سوال: زندگی کی تعریف کیا ہے؟

جواب: زندگی کی تعریف ایک لفظ میں ہے ''تغیر''۔ جب تک تغیر ہے وہ زندہ ہے، جہاں ثبات آ گیا وہ موت ہے۔

سوال: اگر ایک پڑھا لکھا شخص مایوس ہو کر خودکشی کی کوشش کرے تو اُس کے ساتھ کیسا رویہ اپنایا جائے اور اُسے کیسے سمجھایا جائے؟

جواب: میرے خیال میں سمجھانا کسی چیز کا حل نہیں ہے۔ اِس کے بجائے Personal example اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہم رب تعالیٰ پر بہت زیادہ بھروسا کرتے ہیں، آپ ﷺ کے صحیح پیروکار ہیں تو رب تعالیٰ ہم میں کچھ ایسی خوبیاں پیدا کر دے گا کہ زندگی سے مایوس انسان جب ہمارے پاس آئے گا تو ہمارے جسم سے نکلنے والی Vibrations اُس پر خود بخود یوں اثر انداز ہوں گی کہ اُس کے اندر اُمید پیدا ہونے لگے گی۔

آپ کسی درویش کی زندگی کو ایک نظر دیکھیے وہ ایک ایسی کٹیا میں بیٹھا ہو گا جو بارش روک سکتی ہے نہ دھوپ۔ اُس کے پاس کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کافی لباس، لیکن وہ بے حد خوش اور Welcoming دکھائی دیتا ہے۔ اُس سے مل کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ اِتنے نامساعد حالات میں بھی خوش ہے تو پھر میں اِتنی نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی مایوس و افسردہ کیوں......؟

جب انسان اپنے آپ کو بہترین سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو اُس سے ملنے والا انسان مایوسی کے چنگل سے خود بخود آزاد ہونے لگتا ہے۔ آپ کسی صاحبِ علم اور درویش کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھیں وہ آپ کو نصیحت نہیں کرے گا۔ ہنس کر بات نہیں کرے گا۔ لیکن جب آپ ملاقات کر کے رُخصت ہو رہے ہوں گے تو اپنے اندر ایک خوشی اور موڈ میں خوش گواریت کا احساس پائیں گے۔ یہ سب اُس کلامِ الٰہی کا اعجاز ہے جس کی تلاوت وہ درویش کرتا ہے۔

شگون یا یقین

سوال: کیا سارے علوم اللہ کے تخلیق کردہ ہیں یا کوئی علم Manmade بھی ہے؟ اگر سب علوم اللہ کے تخلیق کردہ ہیں تو پھر کسی علم مثلاً علم الاعداد پر یقین نہ رکھنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: میں علم کی حد تک تو علم الاعداد پر یقین رکھتا ہوں لیکن یہ یقین نہیں رکھتا کہ ستارے، اعداد یا شگون میری زندگی پر کوئی اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ میرا یقین یہ ہے کہ میرا رب سب سے زیادہ طاقت ور ہے، سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر کسی میں یہ قوت نہیں کہ مجھے فائدہ یا نقصان پہنچا سکے۔ اِس یقین کے بعد شگون، ستاروں اور اعداد کے اثرات کی باتیں انسان کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم رب تعالیٰ سے اچھے گمان رکھیں اور اچھی توقعات اُس سے وابستہ کریں تو وہ اچھا ہی کرتا ہے۔

ہماری تاریخ کا وہ حصہ جو قابلِ تعریف و قابلِ ذکر ہے اُس پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے کبھی سحر یا نحس گھڑی، تاریخ یا دن نہیں نکالا کہ کس گھڑی یا دن کس ملک پر حملہ کریں یا کوئی حکومتی اقدام اُٹھائیں تو کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ شگون لینے کی باتیں تب زور پکڑ گئیں جب ایمان کمزور ہو گئے۔ اللہ پر یقین اور توکل کم ہونے لگا۔ اگر Human psychology کو Study کریں تو یہ پتا چلتا ہے کہ جو کام ہم پورے یقین سے کریں اُس میں عموماً پوری کامیابی ہوتی ہے اور جس کام کو کرتے ہوئے ہمیں ناکامی کا خوف ہو اُس میں سو فی صد ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب ہم ناکامی سے ڈرنے لگتے ہیں تو ہمیں ناکامیاں ملنے لگتی ہیں۔ ایسے میں ہم نجومیوں، جوتشیوں اور پیروں سے رابطے شروع کر دیتے ہیں حالاں کہ مسلمان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ چوں کہ تمام دن رب ہی کے پیدا کردہ ہیں اِس لیے تمام دن ہی بہت اچھے ہیں۔

اِس کائنات میں موجود علوم ہوں یا کوئی بھی شے...... سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اُسی کی ملکیت ہیں۔ یہ انسان کی بھول ہے کہ فلاں اچھا کام میں نے کیا۔ درحقیقت اُس نے جو بھی اچھا کیا رب کی عطا کردہ عقل، توانائی اور فہم و فراست کو اِستعمال کرتے ہوئے کیا۔

بہت چھوٹی سی چیز ہے لیکن رب تعالیٰ نے اِس میں ایک کائنات سمو دی ہے۔ دماغ کو ہی دیکھ لیجیے۔ دماغ کے مختلف حصے ہیں جسے میڈیکل سائنس نے Lobes کا نام دیا۔ سب سے بڑا Lobe انسانی دماغ کے Front part میں ہے۔ وہیں انسان کی Short-term memory ہے اور وہیں وہ خیالات کو Perceive کرتا ہے۔ ایک Lobe دماغ کی سائیڈ پر اور ایک بیک پر موجود ہے۔ دماغ کے Centre (وسط) میں وہ حصہ ہے جو انسان کی Hearing اور Speech کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ سب رب کا عطا کردہ ہے۔ رب تعالیٰ کے عطا کردہ دماغ سے انسان چیزوں کو Discover کرتا ہے۔

ہم کہتے ہیں ہم نے فلاں چیز کو Invent کیا۔ انسان کسی شے کو Invent نہیں بلکہ Discover کرتا ہے۔ مثلاً ہم سٹیم انجن کو ایجاد کرنے کا سہرا انسان کے سر سجاتے ہیں۔ لیکن کبھی ہم نے سوچا وہ ایجاد کیسے ہوا؟ ایک کیتلی میں اُبلتے ہوئے پانی پر جب Stephenson نے غور کیا کہ اُس کا ڈھکن Steam کی طاقت سے اُوپر اُٹھتا اور پھر دوبارہ نیچے آ جاتا ہے۔ اب پانی، حدت، آگ اور بھاپ پہلے سے موجود تھی، صرف اُس آدمی کے ذہن میں خیال آ گیا کہ Steam کی طاقت کیا ہے۔ اُس نے اِس Steam کو ایک Confined جگہ پر Generate کر کے Channelize کیا اور سلنڈر میں جا کر اُس نے Piston کو Push کر کے اُس سے حرکت پیدا کی تو سٹیم انجن وجود میں آ گیا۔ مکینکل انجینئرنگ کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ دُنیا کا واحد انجن ہے جو External Combustion Engine کہلاتا ہے باقی تمام Internal Combustion Engine کہلاتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر آگ انجن سے باہر جل رہی ہو تو وہ External Combustion انجن کہلاتا ہے جب کہ آگ اگر انجن کے چیمبر کے اندر جل رہی ہو تو وہ Internal Combustion انجن کہلاتا ہے۔ وہیں سے Internal Combustion Engine کی اِبتدا ہوئی اور ٹو سٹروک (Two-stroke) اور فور سٹروک (Four-stroke) انجن بنانے کا آغاز ہوا۔ ٹو اور فور سٹروک انجن کیسے کام کرتا اور انرجی Develop کرتا ہے۔ یہ سب Discoveries ہیں Inventions نہیں۔ انسانی دماغ پہلے سے موجود چیزوں کو Discover کر رہا ہے۔ اِسی طرح تمام علوم پہلے سے موجود ہیں۔ علم الاعداد بھی اِن میں سے ایک ہے۔ آپ علم الاعداد کے موجود ہونے پر تو یقین رکھیے لیکن یہ یقین نہ رکھیے کہ یہ علم ہمارا کچھ بگاڑ یا سنوار سکتا ہے۔ یہ صرف رب ہے جو ہمارا کچھ بگاڑ یا بنا سکتا ہے۔ لیکن وہ بڑا مہربان اور رحیم و کریم ہے۔ اُس کی رحمت اُس کے قہر پر حاوی ہے۔ وہ ہمارا سب کچھ سنوارتا ہی ہے، بگاڑتا کچھ نہیں۔

سوال: حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان اپنے کمزور دل کو مضبوط کیسے کرے؟

جواب: ہم کہتے ہیں رازق رب ہے۔ زندگی و موت، عزت و ذلت رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نقصان و فائدہ سب رب کے حکم سے ہے۔ یہ سب ہم زبان سے تو کہتے ہیں لیکن ہمارے یقین میں پختگی نہیں۔

آپ نے کتب میں پڑھا ہو گا کہ درویش بادشاہوں کو کھلے عام Point out کرتے تھے کہ تم یہ غلط کر رہے ہو۔ اُن میں یہ جرأت ایمان کی پختگی کی وجہ سے تھی کیوں کہ اُنھیں پوری طرح یقین تھا کہ ہر اختیار کا

مالک میرا رب ہے، جو All-time Powerful ہے۔ اُس سے بڑھ کر کوئی طاقت ور نہیں۔ اگر میں حق کی بات کروں گا تو میرا رب میرے ساتھ ہوگا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا دل اِتنا مضبوط ہو جائے کہ ہمیں کوئی چیز خوف زدہ نہ کر سکے، نہ کسی کا عہدہ، نہ اقتدار و اختیار، نہ کسی کی دولت، نہ کسی جنگل کا جانور...... تو ہم اپنے رب پر اندھا یقین کرنا سیکھ لیں۔ دل کو مضبوط کرنے کا اِس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں۔

سوال: میں گزشتہ دو سال سے اپنے موبائل میں آپ کے لیکچرز Download کر کے سنتا رہتا ہوں۔ اُن سے بہت سی باتیں Pick کر کے ذکر اذکار، مراقبہ اور نفلی عبادات میں مصروف رہتا ہوں۔ اب مراقبے کے اِبتدائی نتائج آنا شروع ہو گئے ہیں۔ جنات اشاروں سے کچھ بتاتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی گفتگو کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن کچھ عرصے سے مراقبے کے اثرات قلب پر اثر انداز نہیں ہو رہے۔ آپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب: اللہ آپ کو مبارک کرے۔ رُوحانیت کی راہ میں آپ آگے بڑھتے رہیں۔ جنات کا معاملہ اشاروں سے کہیں آگے بڑھتا چلا جائے گا لیکن اِسے منزل مت سمجھ لیجیے گا کیوں کہ یہ تو ابتدا کی بھی ابتدا ہے۔ صاحبانِ علم تو اِسے کوئی اسٹیج ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ بس دھیان رہے کہ آپ یہاں رُکنے نہ پائیں۔ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یہ جو آپ نے فرمایا کہ کچھ عرصے سے مراقبہ قلب پر اثر انداز نہیں ہو رہا تو ذرا غور کیجیے کہ کہیں دوسروں کے ساتھ آپ کے رویے تو تبدیل نہیں ہوئے۔ رُوحانیت کی بنیاد ہمارے وہ رویے ہوتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ ہم روا رکھتے ہیں۔ اِن رویوں کا سنت کے مطابق ہونا بہت ضروری ہے۔ اِسی صورت میں رُوحانیت آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔

نشست نمبر 33

تقلید

مادی، علمی اور رُوحانی دُنیا پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ تحقیق و جستجو کرنے والے افراد بہت کم تعداد میں رب تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔ جب کہ تقلید کرنے والوں کی اکثریت ہے۔

تحقیق و جستجو کرنے والوں کی تقلید بظاہر آسان لگتی ہے لیکن بعض اوقات تقلید کرنے والے انسان کا عمل و عقل اُس کی راہ کھوٹی کر دیتے ہیں اور اُس کا پاؤں پھسلتا رہتا ہے۔ دراصل ہر انسان نے مختلف چیزوں کے حوالے سے اپنے ذہن میں کچھ بت گھڑ رکھے ہوتے ہیں۔ جب حالات و واقعات اور نتائج اُس کے مطابق نہیں ہوتے تو اُسے لگتا ہے کہ شاید یہ راستہ یا تقلید کا انداز غلط ہے۔

تقلید غلط نہیں ہوتی بلکہ اُس کے ذہن میں موجود بت اُس راستے کو کھوٹا کر رہے ہوتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے تقلید کی بہت بہترین مثال بیان کی کہ دو آدمیوں کو پیاس لگی ہے۔ ایک بینا ہے جب کہ دوسرے کو دکھائی نہیں دیتا۔ دوسرے شخص کو پانی دکھائی نہیں دیتا۔ اُسے اندازہ نہیں کہ پانی کہاں سے ملے گا۔ وہ اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ جب کہ بینا انسان دُور سے پانی کی جھلک دیکھ کر اُسی سمت چل پڑتا ہے۔ وہ شخص جو قوتِ بصارت سے محروم ہے۔ اگر بصارت رکھنے والے شخص کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے پیچھے چل پڑے تو ٹھنڈے، تازہ پانی کی ندی پر جا پہنچے گا لیکن چوں کہ اُسے دکھائی نہیں دیتا اِس لیے وہ بینا شخص سے راستے میں بار بار پوچھتا ہے، پانی ابھی کتنی دُور ہے؟ اُدھر پانی ہے بھی یا نہیں جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو؟ بینا شخص بار بار اُسے تسلی دیتا ہے کہ پانی زیادہ دُور نہیں، سامنے دکھائی دے رہا ہے، تم بس میرے ساتھ چلتے جاؤ۔ لیکن پھر بھی نابینا شخص کے سوالات جاری رہتے ہیں۔ وہ ندی پر جا پہنچتا ہے لیکن اِس کے باوجود اُسے پانی دکھائی نہیں دیتا، وہ سوال کرتا ہے، پانی کہاں ہے؟ بینا شخص اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے، تم پانی کے کنارے پر کھڑے ہو، جھک کر برتن میں پانی بھر لو۔ اندھا شخص اپنا ڈول پانی میں ڈالتا ہے تو اُس کے گیلے پن اور وزن کو محسوس کرنے کے بعد اُسے پانی کی موجودگی کا یقین آتا ہے۔

میری نظر میں تقلید کی یہ مثال بے مثال ہے۔ تقلید کرتے ہوئے انسان کو چوں کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہوتا اِس لیے اُس کے ذہن میں بار بار شکوک و شبہات سر اُٹھاتے ہیں۔ راستے میں آنے والی مشکلات، رنج والم، بھوک پیاس سے وہ بددل ہوتا رہتا ہے۔ رنج والم، دُکھ، تکلیف بیماری سب ہی کی زندگی میں آتے ہیں لیکن یہ

ہر اُس شخص کی زندگی میں زیادہ آتے ہیں جسے رب تعالیٰ نواز رہا ہوتا ہے۔ اگر تقلید کرنے والے کی سمجھ میں یہ باریک سانکتہ آجائے کہ ناکامیاں، دُکھ، غم گویا اُسے مہمیز کرنے کو ہیں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر اُسے ایڑھ لگائیں تو وہ دوڑنے لگتا ہے۔ اُردو میں اِسے مہمیز کہتے ہیں۔ تکلیفیں بھی مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ لیکن ہم عموماً اِنھیں نقصان دہ سمجھتے ہیں حالانکہ اِن میں ہمارے لیے رحمت چھپی ہوتی ہے۔

ایک واعظ منبر پر بیٹھ کر مشرکین وکفار کے لیے رحمت و بخشش کی دُعا کرتے تھے۔ کسی نے اعتراض کیا کہ اُن کے لیے ایسی دُعا کرنا شرعاً درست نہیں۔ واعظ نے کہا ”بالکل بجا۔ لیکن میں اُن کے لیے جذبۂ احسان مندی سے سرشار ہونے کی وجہ سے دُعا کرتا ہوں۔ وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے، میں بھی بھٹکا ہوا تھا۔ میں جب بھی دُنیاوی دوڑ میں اُن کا مقابلہ کرتا تو وہ مجھے اپنا Competitor سمجھ کر اپنی Elbow کا اِستعمال کرتے اور جیت جاتے۔ مجھے یوں ناکام ہوجانے پر سخت تکلیف ہوتی اور ایسے میں میں رب کی طرف رُجوع کرتا جو سب دیکھنے، جاننے اور سننے والا ہے۔ جب میری زندگی میں ایسی ناکامی کے واقعات کا اضافہ ہوتا چلا گیا تو اُن لوگوں کے ہاتھوں زک اُٹھانے کے نتیجے میں مَیں رب کی طرف بار بار متوجہ ہوتا چلا گیا۔ یوں مجھ بھٹکے ہوئے کو راہِ حق مل گئی۔ میں اُن کا احسان مند ہوں کیوں کہ اگر وہ مجھے اِتنا دُکھ اور تکلیف نہ دیتے تو میں رب کی طرف رُجوع نہ کرپاتا اور حق کی راہ کی طرف نہ آتا۔“

دُکھ، رنج، تکلیفوں کا آنا، لوگوں کے ہاتھوں مار پڑنا، حالات کا جبر برداشت کرنا...... یہ سب کچھ انسان کو رب کی راہ کی طرف لے جاتا ہے۔ جب انسان اِتنا دُکھی اور بے بس ہوجائے کہ درد برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے تو ایسے میں اُسے ایک ہی در دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے رب کا در جہاں وہ گریہ وزاری کرتا ہے۔ جواب میں اُس کے لیے رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اُسے سیدھی راہ عطا ہوجاتی ہے۔

ہم بیماری سے گھبراتے ہیں اور ایسے میں بولائے بولائے پھرتے ہیں حالاں کہ وہ ہمارے لیے باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک بار بہت بیمار پڑ گئے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیماری سے نجات کے لیے دُعا کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”اے ابوبکرؓ! کیا تم نہیں چاہتے کہ تمھارے گناہ اِسی دُنیا میں دُھل جائیں۔ یہ بیماری تو تمھارے گناہوں کو دھو رہی ہے۔“

ہم غربت، ناکامی، بیماری اور دُکھ سے گھبراتے ہیں لیکن ہم نے کبھی سوچا کہ یہ سب تو وہ چیزیں ہیں جو رب تعالیٰ کے پیغمبروں کی زندگی میں سب سے زیادہ رہیں۔ اِس لیے اِن سے گھبرائیں مت، بلکہ اِس میں پوشیدہ فائدہ کو سمجھیں کہ یہ اللہ سے قریب ہونے، درجات کی بلندی اور گناہوں سے نجات کا ذریعہ ہیں۔

سوال: کیا تصوف کسی فرقے یا شریعت سے الگ کسی راستے کا نام ہے؟

جواب: یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ ہم تصوف کو کوئی فرقہ یا شریعت سے ہٹ کر کوئی راستہ سمجھیں۔ شریعت پر چلنا بہت دشوار ہے کیوں کہ شریعت پر عمل انسان سے مسلسل قربانی کا تقاضا کرتا ہے جو کہ تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس طرح ایک فوجی کی تربیت کرنے کے بعد ہی اُسے میدانِ جنگ کی سختیاں اور صعوبتیں برداشت کرنے

کے لیے آگے بھیجا جاتا ہے کیوں کہ بغیر ٹریننگ وہ میدانِ جنگ کی سختیاں برداشت نہیں کرپائے گا۔ اِسی طرح مجھ جیسے کمزور لوگ جو شریعت کی مسلسل پابندی نہیں کرسکتے کیوں کہ دُنیاوی اغراض ہمیں سیدھی راہ سے ہٹانے لگتی ہیں۔ نفس امارہ اور شیطان کے بہکاوے ہمارے لیے صراطِ مستقیم پر رہنا مشکل بنا دیتے ہیں اور یوں ہم شریعت سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کی تربیت اِس انداز میں کی جاتی ہے کہ وہ رب کی محبت میں مبتلا ہوجائیں کیوں کہ رب کی محبت میں ڈوب جانے کے بعد شریعت پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اِس طریقے کو ہم نے تصوف کا نام دے دیا۔ ہمارے مخصوص معاشرتی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے تصوف میں بہت سی Contaminations شامل ہوگئیں جن کی وجہ سے تصوف عجیب وغریب عقائد کا ملغوبہ بن گیا اور یہ غلط فہمی جنم لینے لگی کہ شاید تصوف شریعت سے علیحدہ کوئی راہ ہے حالاں کہ ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ تصوف ایک ایسی ٹریننگ کا نام ہے جو شریعت پر عمل کو آسان بناتی ہے۔

سوال: جو شخص پابند صوم وصلوٰۃ اور باشرع نہ ہو کیا وہ صوفی ہوسکتا ہے؟

جواب: بالکل نہیں۔ کسی شخص کے ولی اللہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت وسنت کی سختی سے پابندی کرتا ہو۔

سوال: کیا کسی ولی اللہ کی رُوح اُن کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص میں حلول کرجاتی ہے؟

جواب: کسی شخص کی رُوح کا کسی اور میں حلول کرنے کا عقیدہ اِسلامی عقائد کے خلاف ہے، البتہ ہندومت میں آواگون کا تصور ہے لیکن اِسلام میں اِس کا کوئی تصور موجود نہیں۔ جو شخص دُنیا سے چلا جاتا ہے اُس کی رُوح اُس کے اعمال کے مطابق عالمِ برزخ کے دو درجوں علیین اور سجین میں سے کسی ایک میں بھیج دی جاتی ہے۔ اِن ارواح کا تعلق اللہ کے حکم اور اجازت سے اپنی جائے دفن اور رہائش گاہ سے قائم رہتا ہے لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس رُوح کو کس حد تک رابطہ رکھنے کی اجازت دے۔

سوال: میں بابا سید تاج الدین اولیاء کا نام لے کر چھ ماہ تک دُعا کرتا رہا لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔

جواب: جناب! رب اپنی مرضی کا خود مالک ہے کوئی شخص خواہ وہ کسی مقام پر فائز ہو حتیٰ کہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، رب کو اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی اپنی ہی مصلحتیں ہیں۔ وہ اِس کائنات کو بہت ہی Delicate balance پر چلا رہا ہے۔ ہماری جو دُعائیں فوری طور پر اُس کے Greater plan میں Fit نہیں ہوتیں، رب اُنھیں قبول تو کرلیتا ہے لیکن فوراً پورا نہیں کرتا۔ ہم نے اپنی زندگی میں بارہا یہ Experience کیا ہوگا کہ ہم نے دُعا مانگی اور تسلی ہوگئی کہ رب نے سُن لی ہے لیکن وہ دُعا پوری اُس وقت ہوئی جب کئی ہفتے، مہینے گزر چکے تھے اور ہم دُعا کرنا چھوڑ چکے تھے۔

بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ صاحب بہت بلند پایہ ولی اللہ ہیں لیکن اِس کے باوجود اُن میں یہ ہمت نہیں کہ وہ اپنے بات منوانے کے لیے رب تعالیٰ کو مجبور کرسکیں۔

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ رب تعالیٰ سے دُعا مانگیے۔ اُسے اُس کی رحمت کا واسطہ دے کر، اُس کے

محبوب ﷺ کا واسطہ دے کر۔ اُس کے مقربین کا واسطہ دے کر۔ کسی کا نام لے کر اُس سے دُعا نہ مانگیے۔ اللہ بہت مہربان ہے، دُعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔ آپ اُسے اُس کی رحمت کا، اُس کے محبوب ﷺ کا، اُس کے مقربین کا واسطہ دیجیے اور رب سے عرض کریں کہ دُعا قبول فرما لے۔

جان لیجیے کہ دُعائیں پوری اُس وقت ہوتی ہیں جب وہ رب کے Plans میں Fit ہو رہی ہوں۔ بعض اوقات ہماری عقل تو ہمیں راہ دکھا رہی ہوتی ہے کہ فلاں چیز رب سے مانگو، وہ تمھارے لیے ٹھیک ہے، حالاں کہ ہمارا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ چیز ٹھیک نہیں ہے۔ اور اُس کا ملنا ہمارے حق اور مفاد میں نہیں۔ رب تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ وہ ہمیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اِس لیے ایسی دُعاؤں کو پورا نہیں کرتا بلکہ اُن کے عوض ہماری کچھ اور دُعائیں پوری کر دیتا ہے یا ہمارے گناہوں میں کمی کر دیتا۔ اِس لیے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں نے اتنا عرصہ دُعا مانگی لیکن رب تعالیٰ نے اُسے قبول نہیں کیا۔

جب ہمیں یہ خیال زیادہ ستانے لگے کہ ہم اِتنی مدت سے رب تعالیٰ سے جو چیز مانگ رہے ہیں وہ عطا نہیں ہو رہی تو ایسے میں سوچیں کہ رب تعالیٰ نے بن مانگے ہمیں کتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ہماری Request کے بغیر وہ ہمارے کتنے کام از خود کرتا رہتا ہے۔ اگر ہمارے لاتعداد کام بغیر ہماری Request کے ہو رہے ہیں، بہت سی خواہشات اور دُعائیں پوری ہو رہی ہیں، ایسے میں ایک کام یا خواہش دُعا کے باوجود پوری نہیں ہو رہی تو اِس کا مطلب ہے کہ اِس کے پورا نہ ہونے میں ہی بہتری اور مصلحت ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جو ہمارے اِتنے کام ہمارے بن کہے کر دیتا ہے وہ ہمارا ایک کام کیوں نہیں کرے گا؟ اِس لیے ہم اِس ایک دُعا کا مرضی کے مطابق پورا نہ ہونا مصلحت سمجھ کر قبول کر لیں اور رب تعالیٰ کی مصلحت کو Challenge نہ کریں۔ اُمید ہے کہ اِس طرح ہمارے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

سوال: ایک دن ہم زاد کے بارے میں آپ کا لیکچر سُن کر اِتنا متاثر ہوا کہ آپ کے ایک سو پانچ لیکچر سُن ڈالے۔ زندگی بدل گئی۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ آپ پہلے سے ہی رجسٹرڈ ہیں اِس لیے اپنے مرشد کے پاس جائیے۔ میں اب اپنے مرشد سے اجازت لے چکا ہوں اور آپ سے علم کے حصول کی خواہش ہے۔

جواب: بھائی! کسی شخص کے پاس جو علم ہے اُسے رب کے دوسرے بندوں تک کھلے دل سے پہنچانا اُس پر فرض ہے۔ آپ یقیناً میرے پاس تشریف لائے ہوں گے، مجھے کشف میں دکھائی دیا ہوگا کہ آپ پہلے سے بیعت ہیں۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہوگا کہ رُوحانیت کا اُصول ہے کہ آپ جہاں بیعت ہو جائیں وہیں تک رہیں۔ دوسرے بزرگوں کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں، اُنھیں سلام کریں، اپنی ہمت و سکت کے مطابق اُن کی خدمت کریں لیکن اپنے مرشد کے علاوہ کسی سے دُعا اور مدد کے لیے نہ کہیں۔

اگر میرے علم میں آ جائے کہ میرے پاس آنے والے صاحب پہلے سے بیعت ہیں تو میری Intellectual honesty کا تقاضا ہے کہ Immediately عرض کر دوں" کہ جناب! میں آپ کی

خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ اپنا نقصان کر رہے ہیں کیوں کہ اپنے مرشد کے علاوہ کسی سے مدد کا کہہ کر آپ رُوحانیت کے اُصول اور قانون کی خلاف ورزی کریں گے۔ میرا فرض ہے کہ آپ کو اِس کوتاہی سے بچالوں۔"

میں نے یقیناً آپ کو منع کیا ہوگا لیکن وہ انکار آپ کو علم دینے سے نہیں تھا بلکہ رُوحانیت کے قانون کی خلاف ورزی سے روکنے کے لیے تھا۔ اب آپ کے مرشد نے آپ کو اجازت دے دی ہے تو بسم اللہ، سر آنکھوں پر، ضرور تشریف لائیے۔ میں آپ کی جو خدمت کر سکا ضرور کر دوں گا لیکن یہ بات Clear کر دوں کہ میں اُمی مطلق ہوں، کوئی چیز نہیں جانتا۔ میں رُوحانیت سے واقف ہوں نہ نیکی سے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں خبر کہ نیکی کسے کہتے ہیں۔ آپ اگر اِس تصور کے ساتھ آئیں گے کہ میں ایک بہت ہی کم تر اور قطعی طور پر اَن پڑھ آدمی کے پاس جا رہا ہوں تو پھر آپ کو مجھ سے مل کر کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی لیکن اگر آپ مجھے پڑھا لکھا سمجھ کر میرے پاس آ گئے تو پھر سوائے مایوسی کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔

سوال: میرے مرشد صاحب علم وکمال ہیں۔ اُن کے بے شمار مرید ہیں لیکن وہ مریدوں سے ہاتھ نہیں ملاتے۔

جواب: اپنے مرشد پر کبھی اُنگلی نہ اُٹھائیے۔ یہ گویا علمی تباہی کو آواز دینا ہے۔ آپ کو سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے آپ کو ایسے مرشد دیے ہیں جو صاحبِ علم ہیں اور جن کے بے اِنتہا مرید ہیں۔ وہ انسان ہیں یقیناً اُن کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ مریدوں کے اژدھام میں ہر ایک سے ہاتھ ملا سکیں یا بات کر سکیں۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ مرشد بھی انسان ہیں۔ اُن کا دن بھی 24 گھنٹے کا ہوتا ہے وہ اُسے 48 گھنٹوں پر نہیں پھیلا سکتے۔ بحیثیت انسان اُن کے بہت سے بشری تقاضے ہوتے ہیں، اُنھیں اپنی فیملی کو ٹائم دینا ہوتا ہے۔ بیوی کو وقت دینا، اولاد کی تربیت کرنا اور اُس کی ویلفیئر کے لیے کام کرنا اُن کا فرض ہے جس میں کوتاہی کی صورت وہ رب کے حضور جواب دہ ہیں۔

آپ کے مرشد صاحبِ کمال ہیں، روزگار کے سلسلے میں بھی اُنھیں تگ و دو کرنا پڑتی ہوگی کیوں کہ صاحبِ کمال کبھی دوسروں کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اِن تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ عقیدت مندوں کے لیے بھی وقت نکال رہے ہیں تو اُن کے لیے شکر گزاری کے جذبات اپنے اندر پیدا کریں کیوں کہ وہ اپنے اُس وقت کی قربانی خلقِ خدا کے لیے دے رہے ہیں جس میں وہ آرام کر سکتے ہیں۔

مرشد کی ذات پر اعتراض نہ کیجیے۔ یہ رویہ علمی طور پر آپ کو برباد کر دے گا۔

سوال: کسی بزرگ کو یک طرفہ طور پر اپنے دل و دماغ میں مرشد ماننے سے کیا مرشد اور مرید کا تعلق قائم ہو جاتا ہے؟

جواب: یقیناً مرشد اور مرید کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو آپ اپنا مرشد مان رہے ہیں اگر وہ واقعی صاحبِ علم ہیں تو پھر علم کا Flow بھی شروع ہو جائے گا۔

سوال: کیا تمام نفلی عبادات مرشد سے ملاقات کے بعد چھوڑ دینی چاہییں؟

جواب: نہیں۔ عبادات نہیں چھوڑنی چاہییں۔ مرشد آپ کو گائیڈ کریں گے کہ فرض عبادات تو ہر صورت آپ کو کرنی ہی ہیں۔ نفلی عبادات کے حوالے سے وہ آپ کی رُوح کی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو

Channelize کریں گے کہ کون سی نفلی عبادات کرنی چاہییں۔ فرض عبادات مقدم ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفلی عبادات کے شوق میں فرائض میں کوتاہی ہو جائے۔

سوال: اگر دل میں کوئی کام کرنے کا خیال آئے تو کیا اُس کام کو کرنے کا حکم مرشد کی طرف سے ہوتا ہے؟

جواب: آپ یہ مت سوچیے کہ اُس کام کا حکم مرشد کی طرف سے ہے یا نہیں۔ جب بھی کچھ کرنے کے حوالے سے دل میں خیال آئے تو صرف یہ دیکھ لیجیے کہ یہ کام کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر مطابق ہے تو کر لیجیے ورنہ جھٹک دیجیے۔ ایسے میں کام نہ کرنے کی صورت میں مرشد ناراض نہیں ہوں گے۔

سوال: قرآن پاک میں ایک آیت کا ترجمہ ہے ''کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔'' اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: بہت سیدھی اور سادہ سی بات ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ مختلف روایات و حکایات پڑھ کر بعض اوقات ہمارے ذہن میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے مرشد ہمیں گناہوں کے باوجود بچا لیں گے لیکن اِس آیت میں واضح ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے لیے خود جواب دہ ہے۔ اعمال کی بنیاد پر سزا و جزا کا معاملہ اُس کے ساتھ ہوگا۔ کوئی اور اُس کی سزا و جزا کو Share نہیں کر سکے گا۔

سوال: ہمارے ہاں لوگ دوسروں کا حق مار کر، سفارش، خوشامد اور دھوکے سے آگے نکل جاتے ہیں اور جو ایسا نہیں کر پاتے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

جواب: آپ نے صحیح کہا کہ وقتی طور پر تو ایسا شخص کامیاب اور آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے لیکن اُس کا انجام اگر دیکھیں تو وہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے لیکن ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اہم کیا ہے؟

جب میں پرنس کریم آغا خان کے ادارے میں کام کر رہا تھا تو میرے Seniors اِس بات پر زور دیتے تھے کہ Financial loss ہوتا ہے تو کر دیجیے لیکن ادارے کی Goodwill بچا لیجیے۔ جوانی کا اِبتدائی حصہ تھا بات کچھ زیادہ سمجھ نہ آتی تھی لیکن بعد میں وقت نے یہ بات واضح کی کہ وہ لوگ جن کی Goodwill قائم تھی، دیوالیہ ہونے کے باوجود اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں عروج عطا فرما دیا۔ میں نے اُس ادارے کے لوگوں کو دیکھا تھا کہ اگر کسی سے وعدہ کر لیا کہ آپ دس تاریخ کو Payment لے لیں لیکن بندوبست نہ ہو سکا تو گاڑی اور مکان بیچ کر اُنھوں نے Payment کی پھر اُنہی لوگوں کو ہم نے بڑے اطمینان سے زمین سے اُٹھتے اور کھڑے ہوتے دیکھا۔ اُس Goodwill کو ہم آسان لفظوں میں عزت کہہ سکتے ہیں۔

آپ غور کیجیے جن لوگوں کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، خود اُنھیں یاد نہیں کہ کہاں کہاں کتنی دولت پڑی ہے لیکن اِس انبار کے باوجود اُن کے پاس عزت نہیں۔ ہم ایک ایسے جمہوری ملک میں رہ رہے ہیں جہاں ایسی مثالیں چاروں طرف پھیلی دکھائی دیں گی۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمیں زیادہ اچھی کیا چیز لگتی ہے...... عزت یا دولت؟

کسی زمانے میں ایک اِنتہائی دولت مند صاحب سے میں نے کہا ''آپ کو اللہ نے اِتنی دولت عطا کر دی

ہے کہ آپ کو یاد بھی نہیں کہ پوری دُنیا میں یہ کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ مجھے صرف یہ بتایئے کہ آپ ایک وقت میں صرف ایک ہی سوٹ پہن سکتے ہیں۔ وہ جتنا بھی مہنگا ہو اُس کی قیمت کی ایک آخری حد ہے۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا بھی اُسی برانڈ کا سوٹ پہن لیتا ہے۔ میرے بہت سے دوست ایسا لباس پہنتے ہیں حالاں کہ وہ آپ جتنے دولت مند نہیں۔ آپ نے جو جوتا پہنا ہوا ہے میرے اردگرد بہت سے ایسے لوگ ہیں، جو ساڑھے آٹھ ہزار پونڈز (تقریباً تیرہ لاکھ روپے) کے جوتے پہنتے ہیں۔ جوتا جتنا بھی مہنگا ہو ایک وقت میں ایک ہی جوڑا آپ پہن سکتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک ہی گھڑی آپ پہن سکتے ہیں۔ ایک وقت میں اُتنا ہی کھانا کھا سکتے ہیں جو آپ کے پیٹ میں سما جائے۔ ایک وقت میں ایک ہی گاڑی میں آپ بیٹھ سکیں گے۔ خواہ وہ کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہو۔ پھر باقی سب تو بے کار ہے۔''

جو شخص بھی Elbow اِستعمال کرتا ہے جیسے خوشامد، سفارش، دھوکا...... تو ذرا سوچیے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک اہم کیا ہے...... عزت یا دولت......؟

اگر اللہ تعالیٰ انسان کو عقل و سمجھ اور صحیح غلط کی تمیز عطا کر دے تو وہ عزت کو Opt کرے گا۔ عزت کو منتخب کرنے سے دولت خود بخود آ جائے گی لیکن دولت ملنے سے عزت خود بخود کبھی نہیں آتی۔

ایسے لوگ جو آگے بڑھنے کے لیے Elbow کا اِستعمال کرتے ہیں اُنھیں عزت نہیں ملتی۔ عزت اُنہی کو ملتی ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ بالآخر دولت بھی اُنہی کا مقدر ہو جاتی ہے۔

اندھیری رات اور چاند

چند روز پہلے ایک خاتون، جنھیں میں بہن کہتا ہوں، نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کی بنی ہوئی Paintings کے Images اپنے موبائل سے مجھے دکھائے اور مجھے یاد دلایا کہ تقریباً ایک سال قبل میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ بیٹی Textile Designing کرنا چاہتی ہے وہ مناسب ہے یا اُسے کچھ اور کرنا چاہیے تو آپ نے Paintings کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں وہ Paintings دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بچی نے بہت ہی نازک اور دشوار Theme پر کام کیا تھا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی Verses کو انگریزی میں ترجمہ کر کے Paintings کی صورت Explain کیا تھا۔ وہ تمام Images جو اُنھوں نے اپنی والدہ کے موبائل پر بھیجے تھے بہت خوب تھے۔ اُن میں سے ایک Verse کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ بات ہمارے لیے ہی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے کہی تھی۔

The moon stays bright when it does not avoid the nights.

اور واقعی اگر چاند اندھیری راتوں سے دُور بھاگے گا تو کیسے چمکے گا؟

ہم لوگ اندھیری رات، دشواریوں اور رُکاوٹوں سے دُور بھاگتے ہیں حالاں کہ غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ جن لوگوں نے بہت شہرت حاصل کی اور جنھیں تاریخ نے یاد رکھا، اُنھیں اپنی زندگی میں بے پناہ دشواریوں کا سامنا تھا۔

انبیائے کرام کے اللہ کے دوست ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ آپ ﷺ تو اللہ کے محبوب ہیں۔ انبیائے کرام کی زندگی دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پیدائشی یتیم تھے، کچھ کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد اُن کے والد کی Death ہو گئی اور کچھ کو Forced یتیمی کا سامنا کرنا پڑا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام۔

انبیا کے اِبتدائی زمانے میں بھی سخت مشکلات نظر آتی ہیں کہ جب اُنھوں نے اعلانِ نبوت کیا تو اُنھیں اپنی قوم کی طرف سے بدترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا ہی ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔ وہ بکریاں چراتے اور مشقت کی زندگی گزارتے رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قوم کے ہاتھوں کیسی کیسی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ خود آپ ﷺ کی زندگی اعلانِ نبوت کے بعد اِنتہائی کٹھن ہو گئی حتیٰ کہ آپ ﷺ کو اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ اولیائے کرام کی زندگی بھی کچھ زیادہ آسان نظر نہیں آتی۔

ارسطو ایک بار کسی بحث میں پھنس گئے اور نکتہ سلجھانے میں کچھ دن لگ گئے۔ جب وہ کافی دنوں بعد گھر آئے تو بیگم برہمی سے برس پڑیں اور ارسطو کے شاگرد کا بھی لحاظ نہ کیا جو کہ ساتھ تھا۔ ارسطو کو اپنی غلطی کا اندازہ تھا اس لیے وہ سُن کر مسکراتے رہے۔ بیگم مسکراہٹ دیکھ کر اور سیخ پا ہو گئیں اور نزدیک رکھی پانی کی بالٹی اُن پر اُلٹا دی۔ شاگرد نے اُستاد کی یہ دُرگت بنتے دیکھی تو حیران پریشان ہو کر پوچھا ”اُستادِ محترم! یہ کیا؟“ ارسطو نے بہت دلچسپ جواب دیا ”اتنی گرج کے بعد برسنا لازمی تھا۔“

دانش وروں اور سائنس دانوں کی اکثریت بھی، سوائے چند Exceptional cases کے، مشکلات کا شکار رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انعام کے طور پر اللہ نے اُنھیں ایسی عزت و شہرت عطا فرمائی کہ دُنیا اُنھیں صدیوں تک نہ بھول پائی۔ اِسی طرح جن لوگوں نے خدمتِ خلق کی یا مختلف Discoveries کیں اُنھیں بھی بعض اوقات مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انعام کے طور پر اُنھیں ایسی عزت و شہرت رب تعالیٰ نے عطا کی جو صدیوں کے بعد بھی نہیں گہنائی۔

عظمت ملتی ہی پس جانے کے بعد ہے۔ سب سے حقیر ترین چیز ہمارے نزدیک مٹی ہے جو تمام مخلوق کے پاؤں تلے روندی جاتی ہے، لیکن رب تعالیٰ اِس مٹی کو کیسی عزت بخشتا ہے کہ اِس میں سے سونا اور یورینیم نکلتا ہے...... ہیرا ابھی اِسی مٹی کے نیچے ہے اور انسان جو مٹی سے تخلیق ہوا اور جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اُس کی رُوح جب جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو وہ اِسی مٹی میں چلا جاتا ہے۔

یہ عظمت مٹی کو اِس لیے حاصل ہوئی ہے کیوں کہ وہ پاؤں تلے روندی جاتی ہے۔ شیطان اپنے علم و عبادات کے باوجود یہ نکتہ نہ سمجھ سکا۔ مٹی کے پُتلے کو اُس نے مٹی ہی سمجھا۔ اُس میں چھپی عظمت نہ دیکھ پایا اور سجدہ کرنے کے حکم سے سرتابی کر گیا۔ اگر وہ اِس مٹی میں پوشیدہ عظمت کو دیکھ لیتا تو رب کے حکم کی تعمیل کر لیتا۔ سجدہ کر لیتا اور راندۂ درگاہ نہ ٹھہرتا۔

بعض چیزیں ہمیں بہت معمولی دکھائی دیتی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ معمولی ہو کر ہی عظمت پاتی ہیں۔ پانی کو سورج کی تپش اور گرمی ملتی ہے تو وہ حدت کی وجہ سے بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے اور اِتنی بلندی پر چلا جاتا ہے کہ ہوا کے دوش پر تیرتا رہتا ہے۔ پھر رب اُسے یہ عظمت بخشتا ہے کہ وہ بارش بن کر سوکھی زمین پر برستا اور اُسے ہرا بھرا کر دیتا ہے۔ کھیتوں پر برستا ہے تو اُنھیں کھلیان میں بدل دیتا ہے۔

جو انسان بھی زندگی کی اندھیری راتوں سے نہیں گھبراتا وہ چاند کی طرح چمکتا ہے۔ چاند کی روشنی ہمیشہ ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کو سکون بخشتی ہے اور Soothing محسوس ہوتی ہے۔ اِس میں وہ تیزی نہیں ہوتی جو سورج کی روشنی میں ہے۔

جو لوگ مشکلات کو ہنس کھیل کر برداشت کرتے ہیں اور سکھ کے ساتھ ساتھ غم کو بھی زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر خوش حالی میں نے دیکھی ہے تو تنگ دستی بھی میں ہی دیکھوں گا۔ اگر میں نے تن درستی کو Enjoy کیا ہے تو بیماری پر بھی کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔ جب تکلیف سے مفر ممکن ہی نہیں اور اُسے ہر صورت

جھیلنا ہی ہے پھر ہنس کر کیوں نہ جھیل لیا جائے۔ اگر دُکھ کا وقت روتے ہوئے گزاریں اور برداشت کریں تو یہ محض برداشت ہے، صبر نہیں۔ کیوں کہ صبر تو یہ ہے کہ دُکھ کو ہنسی خوشی قبول کیا جائے اور خندہ پیشانی کے ساتھ دُکھ بھر وقت گزارا جائے۔ صبر کا انعام اللہ کا ساتھ ہے کیوں کہ اُس نے قرآن پاک میں خود فرمایا ''بے شک اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔'' جس انسان کو دُنیا میں اللہ کا ساتھ مل گیا اُس کے لیے دُنیا میں اِس سے بڑھ کر انعام کیا ہوگا! پھر شکر گزاری کا بھی ایک انداز ہے۔ محض زبان سے شکر ادا کرتے رہنا مگر لوگوں سے یہ کہتے پھرنا ''بھائی! میرا تو آج تک کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ سونے کو ہاتھ لگاؤں تو مٹی ہو جاتا ہے۔ ویسے اللہ کا بڑا شکر ہے۔'' یہ شکر نہیں شکوہ ہے۔ شکر تو یہ ہے کہ مشکل کو بھی یہ سوچ کر قبول کر لیا جائے کہ یہ میرے رب کی عطا کردہ ہے۔ جس طرح پیغمبر اپنے زخم سے گرتے کیڑے اُٹھا کر واپس زخم پر رکھ دیتے تھے کہ یہ رب کے عطا کردہ ہیں۔ مشکل کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کرنے والوں کو بڑا انعام ملتا ہے۔

سوال: آسٹریلین طوطوں کو پنجرے میں بند رکھنا مناسب ہے؟

جواب: آزاد پرندوں کو قید کرنے کا ہمیں حق نہیں۔ البتہ کچھ لوگ اگر اُنھیں پالتے ہیں تو اُنھیں چاہیے کہ اُن کی دیکھ بھال اپنی ذات سے بھی بڑھ کر کریں۔ کیوں کہ پنجرے میں اُنھیں بند کر کے ہم نے اُن کی ذمہ داری اُٹھائی ہے۔

سوال: کیا آنسو قربِ الٰہی کا قوی ذریعہ ہیں؟

جواب: رب کے حضور وہ آنسو Valuable ہیں جو اُس کی محبت اور خوف یا اپنے گناہوں پر ندامت کی وجہ سے بے اختیار ہماری آنکھوں سے بہنے لگیں۔ یا وہ آنسو بہت قیمتی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں آنکھوں سے ازخود بہنے لگیں۔

اگر مسلمان کی آنکھ سے آنسو اپنے دُکھ پر ٹپکتا ہے تو یہ لائق تحسین نہیں بلکہ کمزوری ہے۔ مسلمان مصائب سے گھبراتا نہیں بلکہ رب پر بھروسا کرتا ہے۔

رب دل میں چھپے جذبے کو دیکھتا ہے ہمارے ظاہر کو نہیں۔ اگر جذبہ صادق ہے تو پھر رب آپ کا ہے۔

سوال: مسالک میں بٹنے سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: مجھ جیسا اَن پڑھ، غیر دانش و بے عقل شخص یہ سمجھتا ہے کہ سب سے آسان اور خوب صورت راستہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے چلے جائیں۔ وہاں نہ کوئی مسلک ہے، نہ فقہی مسائل اور نہ کوئی اختلاف۔ وہاں تو صرف ایک ہی بات ہے کہ آنکھیں بند کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کی نقل کرتے جائیں تو یقیناً ہم اُس منزل پر پہنچ جائیں گے جہاں صرف خیر ہی خیر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے کوئی مسلک آڑے نہیں آئے گا۔ سب کے عقائد و مسالک قابلِ احترام ہیں۔ ہم سب کا احترام کریں لیکن چلیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر ہی۔

سوال: انشورنس کے بارے میں اِسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ نیز کمپنی سے میڈیکل کی سہولت لینا اور بینک میں جاب کرنا کیا جائز ہے؟

جواب: میں مفتی نہیں ہوں اور فتویٰ دینے کا مجاز بھی نہیں۔ پاکستان الحمدللہ اِسلامی ملک ہے۔ حکومت بھی اِسلامی ہے۔ یہاں اِسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے جو ایسے تمام معاملات پر غور وفکر کرنے کے بعد فتویٰ جاری کرتی ہے۔ جن اُمور پر فتویٰ دیا جا چکا ہے اُن کے بارے میں بار بار نہ پوچھیں۔ اِس سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ آپ اپنے سوالات کو اِسلامی نظریاتی کونسل کے فتاویٰ کی نظر میں دیکھ لیں اور اُن کے مطابق عمل کر لیں۔ اگر خدانخواستہ کچھ غلطی ہوئی بھی تو اِسلامی حکومت اُس کی ذمہ دار ہوگی۔

سوال: اللہ تعالیٰ اولیائے کرام کو یہ مقام عطا فرماتا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ جگہ پر موجود ہوتے ہیں۔ کیا ایک عامل کو بھی یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا ایک غیر مسلم محنت وکوشش سے ایسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟

جواب: کوئی ولی اللہ ولایت کے مقام ابدال پر پہنچتا ہے تو بیک وقت کئی جگہوں پر دیکھا جاتا ہے۔ جب وہ اُس سے اُوپر کے مقام پر چلا جاتا ہے تو معاملات مختلف ہو جاتے ہیں۔

عامل ایک مختلف Category ہے جب کہ مقامِ ابدال کا تعلق ولایت سے ہے۔ جہاں تک غیر مسلموں کی بات ہے تو اہلِ کتاب میں بھی کچھ صاحبانِ علم ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں، ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اگر ایک شخص ایک وقت میں دس جگہوں پر دیکھا جاتا ہے؟ اُس نے محنت کی اور اُس مقام پر جا پہنچا، اللہ اُسے مزید ترقی دے، لیکن مجھے اِس سب سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر غیر مسلم سے اِستدراج کا اظہار ہوتا ہے تو بھی میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ مجھے تو اپنے اعمال کا جواب خود ہی دینا ہے۔ اگر میں دوسروں کا مقام دیکھ کر خوش ہوتا پھروں اور اپنے اعمال کو بہتر نہ بناؤں تو کیا فائدہ؟

اِس لیے میں محض کسی کی کرامت دیکھ کر اُس کی طرف رُجوع نہ کروں بلکہ اُس کا علم دیکھ کر رُجوع کروں تاکہ علم سے فائدہ حاصل کر کے سیدھی راہ پر چل سکوں۔ ہم مستجاب الدعوات کو بہت بڑا ولی اللہ سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا کی چھ ارب آبادی میں سے آپ کو بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جن کی دُعائیں رب رد نہیں کرتا۔ وہ تو مشرکین کی دُعائیں بھی قبول کرتا ہے۔ حالاں کہ رب نے مشرک کو بہت سختی سے Condemn کیا ہے۔ ہوا میں سادھو بھی اُڑ لیتا ہے۔ اِن سب باتوں سے میری زندگی پر کیا فرق پڑتا ہے؟ فرق پڑتا ہے اگر کوئی صاحبِ علم ہو، اُس کی صحبت میں بیٹھ کر ہمیں علم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اور بات کہ دُنیاوی خواہشات کی فراوانی کی وجہ سے ہمیں صاحبِ علم کے بجائے ایسے شخص کی تلاش رہتی ہے جو ہمیں ایسے گُر بتا سکے کہ دُنیا کی دولت ہمارے گھر کی باندی ہو جائے۔

ایک صاحب کسی صاحبِ علم کے پاس جایا کرتے تھے۔ 35 ,30 سال کے بعد مرشد صاحب نے حکم دیا

کہ شہر سے باہر جنگل کے عین درمیان میں جا کر 40 دن تک وظیفہ کرو۔ وظیفہ مکمل کرنے کے بعد جب تم شہر کی طرف آنے لگو گے تو جنگل کے کنارے پر ایک فرشتہ انسان کی شکل میں تمھیں ملے گا۔ وہ تمھیں روک کر پوچھے گا تمھیں کیا چاہیے۔ وہ جتنا بھی لالچ دے، تم اُس سے علم ہی مانگنا۔

مرید چالیس دن کے چلّے کے بعد جنگل سے نکل کر جونہی اُس کے کونے پر پہنچے تو وہ آدمی ملا اور پوچھا ''کیا چاہتے ہو۔'' اب وہ صاحب شدید فاقوں کے باعث بے حال تھے۔ کیوں کہ جو کھانا ساتھ لے گئے تھے وہ چند دنوں میں ہی ختم ہو گیا تھا۔ پیاس کی شدت کی وجہ سے زبان سوکھ کر چمڑا بن چکی تھی۔ ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ حلق میں کانٹے اُگے معلوم ہو رہے تھے لیکن بجائے کھانا پانی مانگنے کے اُنھوں نے کہا مجھے علم چاہیے۔ فرشتہ کہنے لگا ''تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ شکل دیکھو بھوک پیاس سے کیسی ہو رہی ہے۔ تم علم لے کر کیا کرو گے۔ کچھ اور مانگو۔'' لیکن مرید علم ہی کی طلب پر اصرار کرتا رہا۔ فرشتہ اُسے مختلف دُنیاوی ترغیبات اور لالچ دیتا رہا لیکن مرید صاحب نے علم کی طلب کی رٹ لگائے رکھی۔ بالآخر فرشتے نے اُنھیں علم دیا اور رُخصت ہو گیا۔ یہ صاحب چلتے چلتے ایک گاؤں پہنچے تو شام ہو گئی۔ گاؤں والوں نے اُنھیں مسافر خانے میں ٹھہرا دیا۔ رات کو یہ وہاں عبادت میں مصروف تھے تو باہر سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں۔ سوچا اِن لوگوں نے میرے ساتھ نیکی کی ہے، ذرا پوچھوں تو سہی ماجرا کیا ہے۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ ہمارے سردار کا اکلوتا بیٹا طویل بیماری کے بعد جان کنی کے عالم میں ہے۔ اُن صاحب نے اپنے علم کی روشنی میں بتایا کہ تم لوگوں کے گھر کے باہر ایک بوٹی اُگی ہوئی ہے اُس کے پتوں کا رس نچوڑ کر مریض کے حلق میں انڈیلو۔ سردار کو جب یہ بتایا گیا تو اُس نے سوچا کہ بیٹا تو ہاتھ سے جا ہی رہا ہے اِس نسخے کو آزما لینے میں کیا حرج ہے۔ بوٹی کا رس جونہی لڑکے کے حلق میں ٹپکایا گیا اُس کی بگڑتی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔

سردار نے اُن صاحب سے کہا کہ آپ اب تک یہاں مسافر کی حیثیت سے مقیم تھے لیکن آج سے آپ میرے ذاتی مہمان خانے میں ٹھہریں گے۔ آپ نے جو نیکی میرے ساتھ کی ہے اُس کی وجہ سے میں آپ کی صحبت میں چند دن گزارنا چاہتا ہوں۔ صاحبِ علم نے یہ درخواست قبول کر لی اور اُن کے مہمان خانے میں مقیم ہو گئے۔ چند دنوں بعد دشمن قبیلے نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ صاحبِ علم نے کشف میں دیکھا تو سردار کا قبیلہ پسپا ہوتا دکھائی دیا۔ اُس نے سردار کو بُلا کر ایک خاص حکمتِ عملی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ سردار نے اُس پر عمل کیا اور شکست فتح میں بدل گئی۔

جب فتح کا جشن منایا جا رہا تھا تو سردار نے اعلان کیا ''بھائیو! میرے بیٹے کی زندگی اور میرے قبیلے کی فتح میری سمجھ داری یا تدبیر کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب اِس معزز مہمان کی بدولت ہے۔ میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ سردار بننے کا مستحق میں نہیں بلکہ یہ مہمان ہے۔'' یوں اُس شخص کو علم بھی مل گیا، عزت و دولت بھی اور مرتبہ بھی۔ تب اُنھیں اندازہ ہوا کہ مرشد صاحب نے علم کی طلب پر اصرار کرنے کا حکم کیوں دیا تھا۔

ہم جب بھی بزرگوں سے ملیں تو محض اُن سے دُعا کرا کے گھر نہ چلے جائیں بلکہ اُن سے علم حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کرامات و اِستدراج بے معنی ہیں۔ صاحب کشف وکرامات رب تعالیٰ کا شکر ادا تو کر رہا ہوتا

ہے کہ تُو نے مجھے یہ سب عطا فرمایا لیکن وہ اِس کشف وکرامات کو مداری کے شعبدے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیوں کہ زیادہ اہمیت دیں تو گمراہ ہونے کو خدشہ ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ کشف میں اُس شخص کی اصلیت ظاہر ہو گئی اور صاحبِ کشف نے اُسے بُرا سمجھنا شروع کر دیا۔ مردانِ حق اِن باتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اگر شیطان اُن کے دل میں ڈال بھی دے کہ یہ شخص جس سے تم ہاتھ ملا رہے ہو، باہر تمھیں گالیاں دے رہا تھا تو وہ یہ سُن کر لاحول پڑھتے اور کہتے ہیں ''مجھے اِس بات سے کیا غرض کہ یہ میرے خلاف کیا کہہ رہا تھا اور کیا کیا سازشیں کر رہا تھا۔ میرے لیے تو بس یہ بات اہم ہے کہ اللہ کا بندہ میرے پاس آیا ہے۔''

مردانِ حق کا کشف وکرامات کے حوالے سے مزاج یہ ہوتا ہے۔

شعوری اِرتقا

ہم کہتے ہیں کہ ہم مٹی سے بنے تھے اور مٹی میں ہی چلے جائیں گے۔ یہ بات حق ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں کھنکتی مٹی سے بنایا اور مرنے کے بعد ہمارا جسم اِسی مٹی میں دفن ہوکر مٹی کا حصہ بن جائے گا۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر ہم صرف مٹی ہیں تو بے شعوری کی حالت سے شعور تک کا سفر کیسے طے ہوتا ہے؟ ہمارے دماغ کی اِرتقائی منازل کا طے ہونا کیا ہے؟ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو ہمیں کوئی سمجھ اور عقل نہیں ہوتی۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ سفید کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے جس پر کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ والدین کی توجہ و تربیت، اردگرد کا ماحول اور دوسرے لوگوں کی صحبت جن میں وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے، وہ عوامل ہیں جن سے اُس بچے کی شخصیت کی تعمیر و تربیت ہوتی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی شخصیت کے حسن میں بہت بڑا دخل اُس کے شعور کو ہوتا ہے کہ کوئی کس قدر باشعور، عقل مند اور ذی فہم انسان ہوتا ہے، اُس کی شخصیت کو Polishing touch اُس کا شعور دیتا ہے۔ ہمیں خوش لباس، خوش عادات واطوار اور خوش گفتار شخص بہت بھاتا ہے۔ اگر ایسا شخص ذہین اور عقل مند بھی ہو تو سونے پر سہاگا ہے۔

ہم عموماً Mind اور Brain کو ایک ہی شے سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ Mind سوچتا ہے اور Brain اِس سوچ کو Process کرتا ہے۔ Mind کے تین حصے ہیں۔

1۔ Conscious Mind

2۔ Subconscious Mind

3۔ Unconscious Mind

اِسی طرح ذہانت اور عقل میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ذہانت ایک Tool ہے۔ عقل اُس Tool کو Proper استعمال کرتی ہے ورنہ ذہین انسان ایسے ایسے Drastic قدم اُٹھا لیتا ہے کہ تباہی آتی ہے۔ لیکن اگر ذہانت اور شعور اکٹھے ہو جائیں تو قائدِ اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے۔

ہماری شخصیت کو ذہانت، عقل اور شعور جلا بخشتے ہیں۔ اِس کی اِرتقائی منازل کیسے طے کی جائیں، یہ قابلِ غور نکتہ ہے جس پر غور وفکر کی صورت میں ہم رب تعالیٰ کی خدائی کے قائل ہو جاتے ہیں اور ہمیں رب سے پیار ہونے لگتا ہے۔

اگر ہم چاہیں کہ ہمیں رب تعالیٰ سے عشق ہو جائے تو غور وفکر بڑا ضروری ہے کیوں کہ اِس کے بعد رب تعالیٰ کی صناعی پوری طرح سمجھ نہیں آتی مگر یہ احساس پھر بھی ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ رب کتنا عظیم ہے اور وہ کس قدر زبردست طریقے سے کائنات چلا رہا ہے۔ جب ہم اِس سارے سسٹم پر غور کرتے چلے جاتے ہیں تو آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ ہمیں رب سے اور زیادہ پیار ہونے لگتا ہے۔ ہم اُس کے عشق میں ڈوبنے لگتے ہیں اور یوں شعور اِرتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

سوال: سورہ الفاتحہ قرآن پاک کا مغز ہے، اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں جو کچھ پورے قرآن پاک میں ہے وہ سورہ الفاتحہ میں سمایا ہے اور جو کچھ پوری سورہ الفاتحہ میں ہے وہ اُس کی بسم اللہ الرحمن الرحیم میں سمایا ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم میں جو کچھ ہے وہ سمایا ہے اُس کے حرف ''ب'' میں اور ''ب'' میں جو کچھ ہے وہ اُس کے نیچے موجود نقطے میں سمایا ہوا ہے۔ یہ بڑی معرفت کی بات ہے۔ رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن باتوں پر بار بار زور دیا وہ سب مختصراً ہمیں سورہ الفاتحہ میں مل جاتا ہے۔ اِسی لیے سورہ الفاتحہ کو قرآن پاک کا مغز کہا جاتا ہے۔

سوال: کیا سید کی شادی غیر سید کے ساتھ ہو سکتی ہے؟

جواب: بالکل ہو سکتی ہے۔ خود آپ ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت عثمان غنیؓ سے بیاہی گئی تھیں۔ اِسلام میں سید کی غیر سید سے شادی کرنے میں کوئی ممانعت نہیں۔

سوال: کیا والدین کی مرضی کے بغیر اپنی پسند سے شادی کر لینا مناسب ہے؟

جواب: ہم میں ہر ایک اپنے والدین کا مقروض ہے۔ اُنھوں نے ہمیں اُس وقت پالا جب ہم اپنے جسم سے مکھی اُڑانے پر بھی قادر نہ تھے۔ ماں نے دودھ پلا کر اور باپ نے اپنی خون پسینے کی کمائی ہم پر خرچ کر کے ہمیں پروان چڑھایا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم ایسے والدین کو اپنی خواہش کی خاطر دُکھ دیں۔ بہتر ہے ہم اپنے دل کی بات ماننے کے بجائے ماں باپ کی خواہشات کا احترام کریں اور اپنی خواہش کی قربانی دے دیں۔ یوں والدین بھی راضی، رب بھی خوش اور ہمارا اپنا اندر بھی پُرسکون رہے گا۔

سوال: کیا ایک شادی شدہ مرد محض کسی اور عورت سے محبت کی وجہ سے دوسری شادی کر سکتا ہے؟

جواب: اگر ایک انسان کو کسی سے پہلے سے پیار ہے تو اُس کے دل میں کسی اور کے لیے ویسا پیار جنم نہیں لے سکتا۔ اگر زندگی میں محبت کی کمی ہو یا وہ مناسب گزر رہی ہو تبھی انسان کسی اور کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ نے انصاف کی شرط کے ساتھ مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ شرط بہت کڑی ہے۔ چار بیویاں تو دُور کی بات ہے، دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنا بھی تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی شخص بھی انصاف کا یہ تقاضا پورا کر سکتا ہے اور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سوال: مؤکلات کے ذریعے کسی کے نجی معاملات جاننا کیسا ہے؟ رب تو پردہ پوشی کا حکم دیتا ہے۔

جواب: بے شک رب تعالیٰ پردہ پوشی کا حکم دیتا ہے اور اِسلام میں کسی کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے سے سختی

سے منع کیا گیا ہے۔

جسے رب تعالیٰ کشف یا کوئی اور ایسا علم عطا فرماتا ہے، اُس علم کے عطا کرنے سے پہلے اُسے اِتنا بڑا ظرف دے دیتا ہے کہ اپنے پاس آنے والے کے بارے میں سب جاننے کے باوجود وہ انجان بنا رہتا ہے۔ ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لاتا جس سے کسی کی عزت پر حرف آئے، کسی کی توہین ہو یا کسی کا راز کھل جائے۔

سوال: دو پارٹیوں میں معاہدہ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے جب کہ اللہ نے تو ہمیں اِس دُنیا میں بھیجنے سے پہلے ہم سے پوچھا ہی نہیں کہ ہم یہاں آنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اُس طرح زندگی گزارو جیسے رب چاہتا ہے۔

جواب: جناب! آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ معاہدہ ہمیشہ برابر کی پارٹیوں میں ہوتا ہے۔ طاقت ور اور کمزور میں نہیں۔ طاقت ور کی تو مرضی چلتی ہے۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ رب تعالیٰ کے معاملات میں دو پارٹیاں کبھی نہیں ہوتیں۔ رب تو ایک ہی ہے۔ ہماری نہ کوئی ملکیت ہے نہ طاقت، سب کچھ اُسی کا عطا کردہ ہے۔ ہمارا اپنا تو کچھ ہے ہی نہیں۔

ہم جاب کے لیے جاتے ہیں تو انٹرویو کے دوران ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمیں یہ جاب قبول ہے یا نہیں؟ کیوں کہ جاب دینے والا اور لینے والا دونوں انسان ہوتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود جب ہمیں جاب مل جاتی ہے تو آجر کی مرضی کے مطابق ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے ہم سے کراتا ہے۔ رب تو مالکِ کُل ہے۔ ساری کائنات اُسی کی ہے۔ ہماری حیثیت تو مخلوق کی ہے۔ ہم خالق نہیں۔ وہ آقا ہے اور ہم غلام۔ غلام کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اُس مالکِ کُل نے چاہا کہ اُس کی ایک ایسی تخلیق ہو جو اُس کی ذات کا مظہر ہو۔ سو اُس نے انسان کو پیدا کیا اور ربوبیت کے علاوہ اپنی تمام صفات کا ہلکا سا عکس انسان میں رکھ دیا۔ اُس نے چاہا اور ہمیں تخلیق کر دیا۔ ہمارا تو وجود تھا ہی نہیں۔ وہی ہمیں وجود میں لایا...... اُسی نے بطور آقا ہمیں تخلیق کیا اور آقا کا یہ حق ہے کہ غلام اُس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ سو ہم گزارتے ہیں۔

سوال: **مزارات پر حاضری کا کیا انداز ہونا چاہیے؟**

جواب: مسنون طریقہ یہ ہے کہ السلام علیکم یا اہل القبور کہیں۔ فاتحہ پڑھیں، صاحبِ قبر کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دُعا کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبروں کی حرمت کا حکم دیا ہے اور قبروں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

سوال: **جن دنوں میں خواتین نماز نہیں پڑھ سکتیں اور روزہ نہیں رکھ سکتیں، اُن دنوں میں کون سا خاص عمل اُنھیں کرنا چاہیے؟**

جواب: اُن دنوں میں وہ غربا و مساکین کو اللہ کے نام پر کھانا کھلائیں۔

سوال: **پڑھی لکھی خواتین کے لیے جاب کر کے خدمتِ خلق کرنا زیادہ افضل ہے یا گھر میں رہ کر عبادت کرنا؟**

جواب: خاتونِ خانہ کو وہ کام کرنا چاہیے جس کی اُس کا Husband اُسے اجازت دے۔ اگر خاتونِ خانہ تمام

گھریلو ذمہ داریاں پوری کر لے اور اُس کا شوہر اُسے خدمتِ خلق کی اجازت دے دے تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ خدمتِ خلق کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو بچے وسائل کی کمی کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتے اُنھیں گھر بلا کر نہ صرف تعلیم دی جائے بلکہ تربیت کا بھی بھرپور انتظام کیا جائے۔ اُن کی Civic Sense کو Develop کیا جائے تاکہ وہ مہذب اور مفید شہری بن سکیں۔ میرے خیال میں اُمتِ مسلمہ کی اِس سے بہتر خدمت نہیں ہو سکتی۔

سوال: **یقین کامل اور اعمالِ صالحہ کی کیا افادیت ہے؟**

جواب: بنیادی چیز سوچ ہے۔ ہمارے اعمال کا دارومدار سوچ پر ہے۔ جب ہم کوئی بات پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمارا ذہن لاشعوری طور پر اُس پر غور و فکر کرتا ہے۔ اگر ہم اُس پر Convince ہو جائیں تو عمل کرتے ہیں۔ یوں پہلے یقین کامل ہے اور پھر عمل۔ اگر یقین ہی نہ ہو تو عمل نہیں ہو سکتا۔

یقین اور عمل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہمیں یقین کامل پر زیادہ زور دینا چاہیے کیوں کہ اِس کے نتیجے میں اعمالِ صالحہ وجود میں آئیں گے۔

معرفتِ الٰہی

سوال: معرفتِ الٰہی کیا ہے اور یہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟

جواب: یہ سوال ہم سب کے ذہنوں میں گردش کرتا رہتا ہے اور ہم سب اِسی تجسس میں مبتلا رہتے ہیں کہ معرفتِ الٰہی حاصل ہونے کے بعد ہم کہاں سے کہاں تک جا پہنچیں گے اور ہمیں کیا کچھ حاصل ہو جائے گا! اِس تجسس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لیا اور معرفتِ الٰہی کے حوالے سے ایسے ایسے تصورات قائم ہو گئے جن کا حقیقت سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔

ہم معرفتِ الٰہی کی Term پڑھتے ہیں تو ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ معرفتِ الٰہی وہ چیزیں دیکھ لینے کا نام ہے جو عام آدمی نہیں دیکھ پاتا۔ یہ ماورائے فطرت قوتوں کے حصول یا مختلف مخلوقات پر قدرت حاصل کر لینے کا نام ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں یہ تصورات درست نہیں۔

معرفتِ الٰہی میں تین چیزیں چھپی ہیں:

1۔ معرفتِ ذاتِ جل جلالہ

2۔ معرفتِ صفاتِ الٰہی

3۔ معرفتِ مظاہرِ صفاتِ الٰہی

رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ صوفیاء کرام ذاتِ الٰہی پر غور کرنے سے منع کرتے ہیں لیکن صفاتِ الٰہی پر غور کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ مگر اللہ کی صفات پر غور کرنے کے لیے وسیع علم چاہیے ورنہ انسان بھٹک جائے گا۔ اِس لیے Safest اور آسان راستہ یہ ہے کہ انسان صفاتِ الٰہی کے مظاہر پر غور کرے۔ وہ تمام چیزیں جو اللہ نے تخلیق کی ہیں اُس کی صفات کی مظہر ہیں۔ اُن پر غور کرنے سے ہم صفاتِ الٰہی کی معرفت تک پہنچ جائیں گے۔ ہم تعلیم کا آغاز PhD سے نہیں بلکہ الف ب پ سے کرتے ہیں۔ اِسی طرح معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے ہمیں اللہ کی صفات کے مظاہر پر غور و فکر کر کے پہلے اُن کی معرفت حاصل کرنا ہوگی۔ مثلاً رب کی صفت ہے ''الخالق''۔ اُس نے ہمیں تخلیق کیا، تمام نباتات و جمادات غرض ہر شے کو تخلیق کرنے والا وہی ہے۔ جب ہم اُس کی اِس صفت کے مظاہر پر غور کریں گے، نباتات و جمادات و حیوانات کی تخلیق کے مراحل کا مطالعہ کریں گے تو اُس کا خالق ہونا ہم پر وسیع مفہوم کے ساتھ واضح ہوتا چلا جائے گا۔ اِسی

طرح وہ زمین سے اناج کو اُگاتا اور ہمیں رزق فراہم کرتا ہے۔ یہ اُس کی صفت رزاق کے مظاہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا ایک بہت بڑا مظہر قرآن پاک ہے۔ رب کی صفات کے مظاہر کو مختصراً ''مظہر حقیقت تکوینی'' یا ''مظہر صفت تکوینی'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ''مظہر حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی صفات کا سب سے بڑا مظہر ہیں۔

جب ہم کلامِ پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر سب سے زیادہ غور کرتے ہیں تو رفتہ رفتہ مظاہرِ صفاتِ الٰہی تک چلے جاتے ہیں اور صفاتِ الٰہی کے مظاہر کی معرفت کے بعد اللہ کی صفات کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں۔

حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ بہت بلند پایہ ولی اللہ اور فقیہہ و عالم تھے۔ اُن کی زوجہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ پڑوسی کی بیگم آ کر کام کر جایا کرتیں۔ دباغ صاحب کو اپنے اُس پڑوسی مرید سے بہت پیار تھا۔ ایک روز وہ مرید اُن کے گھر آئے تو اُن کی ننھی بیٹی بھی ساتھ تھی جس کے ہاتھ میں کلام پاک تھا۔ جناب عبدالعزیز دباغ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بچی کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اور اپنے مرید سے پوچھا ''آج تمھیں ایسا کیا چاہیے کہ قرآن پاک کا واسطہ لے کر آئے ہو'' مرید نے کہا ''جناب! آپ مجھے اپنا سر عطا فرما دیں۔'' جناب دباغ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے سمجھایا کہ اِتنی بڑی چیز نہ مانگو، تم اِس کے اہل نہیں ہو۔ اگر تمھیں یہ مل گیا تو تم جان سے جاؤ گے۔ لیکن مرید اصرار کرتا رہا۔ دباغ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالآخر اُس کی فرمائش پوری کر دی اور اُسے اپنا سر عطا کر دیا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جونہی مرید کو مرشد کا سر عطا ہوا، اُس نے اُن کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ وہ عجیب و غریب باتیں کرنے لگا۔ پھر دوسرے شہر چلا گیا اور وہاں بھی اِسرار و رُموز کی باتیں لوگوں کے سامنے کرتا جو سب کی سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ دراصل مرشد کا علم اُسے عطا ہو گیا تھا لیکن وہ اُسے سہار اور جذب نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گمراہ ہوتا چلا گیا اور اِسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گیا لیکن اُس کے بعد بھی وہ مافوق الفطرت باتیں کرتا رہا جو کسی کے فہم و ادراک میں نہ آتیں۔ لوگوں نے اُسے گمراہ سمجھ کر ایک روز قتل کر دیا۔

حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''جب کوئی مرید اپنے مرشد کا سر مانگتا ہے تو وہ اُس علم کو برداشت نہیں کر پاتا اور اُس علم کے عطا ہو جانے کے بعد وہ لایعنی اور پُر اسرار باتیں کرنے لگتا ہے جن کی کسی کو سمجھ نہیں آتی اور لوگ اُسے بھٹکا ہوا سمجھ کر قتل کر دیتے ہیں۔''

ضروری ہے کہ مرشد کا سر مانگنے سے پہلے اُس کی ذات مانگ لی جائے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ باوجود آپ کے مانگنے کے کبھی مرشد کی ذات کے اسرار اُس کی موت سے پہلے نہیں کھلتے۔ وہ اِسرار ہمیشہ مرشد کی وفات کے بعد کھلتے ہیں اور اُس کے بعد ہی آپ کے علم کو عروج ملتا ہے۔

ایک بار میں مرشد صاحب کے پاس بیٹھا تھا تو اُنھوں نے مجھے ایک خاص علم عطا فرمایا اور کہا یہ علم پوری دُنیا میں ایک وقت میں صرف ایک شخص کے پاس ہوتا ہے۔ میں نے کہا ''جناب! اب تو یہ دو آدمیوں کے پاس ہے۔ ایک آپ اور دوسرا میں۔'' مرشد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''یہ تمھاری غلط فہمی ہے تم اِس علم کے عُروج پر اُس وقت پہنچو گے جب مجھے دفن کر کے 72 قدم چل کر دُعا مانگو گے۔'' بعد میں ایسا ہی ہوا۔

یہ تو اُن کا بڑا پن تھا کہ اُنھوں نے مجھے وہ علم عطا فرمایا ورنہ میں کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔

مرشد صاحب کی بات دراصل اُسی راز کی طرف اشارہ تھا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ مرشد کی ذات کے اسرار ہم حاصل کریں۔ مرشد سے ہم کچھ مانگیں تو اُس کی ذات کے اسرار مانگیں لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ اسرار اُن کی زندگی میں نہیں بلکہ اُن کے دُنیا سے جانے کے بعد ظاہر ہوں گے۔ جب مرشد کی ذات کے اسرار ہم پرا ہو جاتے ہیں تو ہمارے اندر علم ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ پھر اِس مرحلے میں اگر ہمیں مرشد کا سر عطا ہو جائے تو ہم اُسے سہار پائیں گے۔ پھر ہم عام لوگوں کی موجودگی میں ایسی باتیں نہیں کریں گے جو اُن کی فہم و فراست سے بالاتر ہوں۔ اور یوں لوگ ہمیں گمراہ یا بھٹکا ہوا نہیں سمجھیں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ علما کے علم کی زیادتی کی وجہ سے Two-thirds لوگ اُن کے مخالف ہوتے ہیں۔ پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص کئی دن چپ چاپ آتا رہا۔ وہ کچھ بولے یا پوچھے بغیر چلا جاتا۔ پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا ''کوئی کام ہے؟'' وہ کہنے لگا ''کام تو کوئی نہیں۔ میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ اولیاء اللہ کے دشمن اُن کے دوستوں یا مریدوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ کے تو ہر طرف مرید اور عقیدت مند ہیں۔ دشمن تو کہیں کوئی نظر نہیں آتا۔ آپ کہاں کے ولی اللہ ہیں۔'' پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسکرا کر فرمایا ''دریائے دجلہ کے پار کوفہ جا کر دیکھیں، حقیقت کھل جائے گی۔'' وہ وہاں گیا تو اُن کے مخالفین کی کثرت نظر آئی۔ وہ واپس آیا اور اُن کی بیعت کر لی۔

ولی اللہ کے مخالفین کی تعداد اُس کے ماننے والوں سے دوگنا زیادہ ہوتی ہے۔ ہم معرفتِ الٰہی کے علم کی طرف تو جاتے ہیں لیکن اُس راہ کی مشکلات پر نظر نہیں رکھتے۔ معرفتِ الٰہی اِتنی بھی آسان نہیں ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے راہ سلوک کے مسافر انڈا، گوشت اور میٹھا کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ رُوح کو بھاری کرتے ہیں جس سے رُوحانی ترقی سست ہو جاتی ہے۔ ہیں تو یہ سب حلال چیزیں پھر پرہیز کیوں؟

جواب: ہم سب انسانی صحت پر مختلف Articles پڑھتے رہتے ہیں۔ کلینیکل سائنس کے مطابق وہ انسان کبھی بیمار نہیں ہوتا جو 70 فی صد پیٹ بھرتا اور 30 فی صد خالی رکھتا ہے۔ ہم بچپن میں یہ پڑھا کرتے تھے کہ بھوک رکھ کر کھانا کھانا سنت ہے۔

صوفیائے کرام چوں کہ ذکر الٰہی اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ شب بیدار ہوتے ہیں۔ اگر وہ مرغن اور پروٹین سے بھرپور غذا جیسے انڈا یا گوشت کھائیں تو نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور رات کی عبادت کھوٹی ہونے لگتی ہے۔ جو رب کو رات بھر پکارتے ہیں وہ ہائی پروٹین والی یا مرغن غذاؤں سے اجتناب کرتے ہیں ورنہ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اہل اللہ ایسی چیز خود پر حرام کر لے جسے اللہ نے حلال کیا ہے۔

میں اپنے مرشد کے پاس روزانہ شام کو حاضری دیتا تھا جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ دوستوں سے دُور ہوتا گیا۔ میرے ایک قریبی دوست جن پر مغربی تعلیم کا غلبہ تھا، کہنے لگے ''شاہ جی! کدھر غائب ہیں۔ آپ کی

بزرگ میاں کچھ مشکوک دکھائی دیتے ہیں۔'' اُن کے اِصرار سے تنگ آ کر میں نے اُنھیں بتایا کہ ایک فقیر آدمی ہیں اُن کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔ وہ آپ کے مطلب کے آدمی نہیں ہیں۔ کہنے لگے ''جو بھی ہو میں جا کر دیکھوں گا کہ آپ کدھر جاتے ہیں۔'' بہر حال میں اُنھیں ساتھ لے گیا۔ مرشد صاحب نے دیکھا میرے عزیز اور قریبی دوست ہیں۔ اُنھوں نے کھانا پکایا۔ لیکن جس طرح وہ کھانا پکا رہے تھے کرنل صاحب دیکھ کر بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہی Heater پر دیگچی رکھی تھی، جتنا دیسی گھی ہاتھ آیا، دیگچی میں اُنڈیل دیا، مرچوں کا پیکٹ اُٹھایا اور اُس میں اُلٹ دیا۔ غرضیکہ ہر مسالا بڑی مقدار میں ڈال دیا۔ چند منٹ بعد گوشت تیار تھا۔ کھانا شروع کیا تو کرنل صاحب کا حال بُرا تھا کہ یہ کھانا بھی پڑے گا۔ اُنھوں نے چھوٹا سا نوالہ منہ میں ڈالا۔ لیکن یہ کیا! کھانا تو بے حد لذیذ تھا۔ اگلی بار اُنھوں نے ایک بڑا نوالہ لیا۔ میں کن انکھیوں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ ایک اور صاحب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ''حضور! سُنا ہے فقیر لوگ خود مرچوں سے روٹی کھاتے ہیں اور دوسروں کو گوشت کھلاتے ہیں۔'' میں نے سمجھا کہ اُن صاحب نے بڑا علمی سوال کیا ہے۔ لیکن مرشد صاحب نے بہت تیزی سے اصل بات کو بھانپا۔ اُنھوں نے جواب دیا ''میاں! کھاتے ہوں گے مرچوں سے روٹی۔ لیکن میرا رب اگر مجھے نعمتیں عطا فرماتا ہے تو میں اُن سے منہ موڑ کر کفرانِ نعمت کیوں کروں!'' جواب سُن کر مجھے اندازہ ہوا کہ اُن صاحب نے طنزیہ سوال کیا تھا۔

بات یہ ہے کہ فقیر کبھی اللہ کی حلال نعمتوں کو خود پر حرام نہیں کرتا۔ اگر اللہ نے اُسے اچھا لباس، اچھی خوراک اور اچھا مکان عطا کیا ہے تو وہ اُن نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ کفرانِ نعمت نہیں کرتا۔

سوال: کیا تصوف چلہ کشی کے بغیر نامکمل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں تو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

جواب: یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اعلانِ نبوت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور کئی دن تک وہاں مشغولِ عبادت رہتے۔

چلہ کشی ہے کیا؟

اگر چلہ کشی سے آپ کی مراد وہ ہے جو سادھو کرتے ہیں تو اِس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں لیکن اگر اِس سے مراد یہ ہے کہ کسی کمرے میں اکیلے بیٹھ کر رب کو پکارتے رہیں تا کہ توجہ نہ بھٹکے تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بعد سب سے بڑے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُنیاوی تعلیم کے لحاظ سے اُمی تھے۔ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام علم عطا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام علم من جانب اللہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادت میں جو انہماک حاصل تھا وہ کسی ارادے کے تحت نہ تھا بلکہ اُس محبت کی وجہ سے تھا جو اللہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھی۔ جس سے محبت ہو اُس کی یاد خود بخود انہماک عطا کر دیتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اللہ کو پکارتے تو انہماک بے پناہ ہوتا تھا۔ ایسا انہماک کسی اور کو حاصل نہ ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر چلہ کشی نہ بھی کرتے تو بھی وہ انہماک موجود تھا۔

اولیاء اللہ شروع میں تنہائی میں بیٹھ کر رب کا ذکر کرتے ہیں کیوں کہ شروع میں توجہ زیادہ بھٹکتی ہے۔ پھر جب اُنھیں یک سوئی اور انہماک حاصل ہو جاتا ہے تو وہ محفل میں بھی اِسی یک سوئی کے ساتھ رب کا ذکر

کرنے لگتے ہیں۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ڈھول بھی اُن کے پاس بج رہا ہو تو اُن کے انہماک میں کمی نہیں آتی۔

سوال: خوشبوؤں کا احساس، روشنیوں کا سیلاب، جنات و موکلات کا نظر آنا، جسم میں کرنٹ محسوس ہونا، عجائبِ قدرت کا مشاہدہ، مختلف اولیائے کرام و پیغمبروں سے ملاقات، کشف کا حصول...... کیا یہ سب رُوحانیت کی راہ کے سنگِ میل ہیں یا اِن سے گزرے بغیر بھی کوئی رب تعالیٰ سے قریب ہو سکتا ہے؟

جواب: تصوف ورُوحانیت کا اصل مقصد انسان کے ذہن میں کیا ہے؟ اصل مقصد رب کی دوستی کا حصول ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو سمجھ عطا فرما دی اور وہ اِسی پر نظر رکھے ہوئے ہے کہ مجھے رب کی دوستی عطا ہو جائے تو اِس پر چلتے چلتے بہت سی ایسی چیزوں سے وہ متعارف ہو گا جن کا آپ نے ذکر کیا۔ لیکن ضروری ہے کہ اُن چیزوں میں وہ نہ اُلجھے ورنہ راہ کھوٹی ہو جاتی ہے اور رب کی دوستی حاصل نہیں ہو پاتی۔ مرشد اپنے مرید کو اِن چیزوں میں اُلجھنے، رُکنے اور بھٹکنے نہیں دیتا۔

میں اِن چیزوں کو مداری کی شعبدہ بازی کہا کرتا ہوں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اِنھیں Condemn کرتا ہوں بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی چیزیں نہیں جن پر فخر کیا جا سکے یا جنھیں گنا جا سکے کہ مجھے یہ یہ حاصل ہو گیا کیوں کہ یہ تو سب کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی رب کے کتنا قریب ہو گیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ دربارِ نبی ﷺ میں حاضری کی اجازت ہوئی یا نہیں...... مقامات تو یہ ہیں جن کی طلب اور خواہش ہونی چاہیے۔ خوشبوؤں کا احساس، رنگوں کا سیلاب، جسم میں کرنٹ محسوس ہونا یا بزرگ ہستیوں سے ملاقاتیں ہونا اِتنا اہم نہیں۔

سوال: مرشد کی موجودگی میں مرید کی رُوحانی کیفیت میں اضافہ اور عدم موجودگی میں کمی کیوں آتی ہے؟

جواب: یہ بہت اہم سوال ہے اور اِس کا جاننا بہت ضروری ہے۔ آپ نے لیبارٹری میں مختلف تجربے کیے ہوں گے جن میں سے ایک یہ بھی کیا ہو گا کہ اگر مقناطیس کے پاس لوہے کا ایک ٹکڑا دیر تک رکھا جائے تو وہ ٹکڑا بھی Magnet میں تبدیل ہو جائے گا۔ اگرچہ اُس کی قوت اصل مقناطیس سے کم ہو گی۔ اِسی طرح اگر مقناطیس کے پاس چھوٹا Magnet رکھیں اور دو Opposite poles ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیں تو فاصلے پر موجود ہونے کے باوجود چھوٹے Magnet کی قوت بے تحاشا بڑھ جائے گی۔

یہ سب اِس لیے ہوتا ہے کیوں کہ Magnet کے اِردگرد ایک غیر مرئی ہالہ بنا ہوا ہے جسے ہم سائنسی زبان میں Magnetic Field کہتے ہیں۔ جو چیز بھی اِس Magnetic Field میں آ جائے یا اُس کے قریب ہو جائے اُس پر Waves اثر انداز ہوتی ہیں۔ اِسی طرح جو فقیر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا ہے، اُس کو پکارتا رہتا ہے اُس کا ایک Magnetic Field بنتا ہے۔ 32 KVA کی جو لائن اُوپر چل رہی ہوتی ہے وہ زمین سے کافی دُور ہوتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود پول پر ایک وارننگ سائن ہوتا ہے 'Danger'۔ اِس سے دُور رہیے کیوں کہ اگر اِس تار کے چار فٹ کے دائرے میں بھی کوئی آ جائے تو اِتنا

شدید Electric shock لگتا ہے کہ بندہ مر جاتا ہے۔ آپ کا مرشد جب اللہ کو پکارتا رہتا ہے اور اللہ اُسے علم عطا کر دیتا ہے تو اُس کے اردگرد بھی ایک Magnetic Field قائم ہو جاتا ہے۔ اُس کے جسم سے Vibrations نکلتی ہیں جو اردگرد کی چیزوں پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں۔

جب آپ اپنے مرشد کے قریب بیٹھے ہوتے ہیں تو مرشد کے Magnetic Field کے اثرات آپ پر مرتب ہونے لگتے ہیں۔ مرشد کی بتائی پڑھائیوں کے نتیجے میں آپ کی اپنی رُوحانی Strength بھی ہوتی ہے جو مرشد کے Magnetic Field کے زیرِ اثر آ کر اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے آپ کو رُوحانی کیفیت میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب مرید اپنے مرشد سے دُور ہو جاتا ہے تو مرشد کی Magnetic Field کے اثر سے نکل جاتا ہے اور اُس کی صرف اپنی قوت رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ رُوحانی کیفیت میں کمی محسوس کرتا ہے۔

مرشد کی صحبت بہت ضروری ہے۔ مرید اپنے مرشد کے قریب بیٹھا رہتا ہے، اُسے Observe کرتا اور اُس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہاں پہنچ جائیں جہاں مرشد پہنچے تھے تو مرشد کے Footprints پر چلنا شروع کر دیں۔

سوال: کیا تصوف کے رُموز و اسرار بیان کرنے کے لیے کم از کم قطب ارشاد کے درجے پر فائز ہونا ضروری ہے یا کوئی بھی شخص ایسا کر سکتا ہے؟

جواب: بڑا Simple سیدھا جواب ہے۔ اگر کوئی خاص شخص ہی ایسا کر سکتا ہوتا تو پھر میں آپ کے سامنے یہ سب باتیں کیسے کر رہا ہوتا۔ بھائی! مجھے تو یہ ہی نہیں پتا کہ قطب ارشاد ہوتا کیا ہے؟ آپ لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر اُن کی باتیں سنیے، کتابیں پڑھیے اور پھر لیکچر کی ایسی محفلیں جما کر اپنا علم بیان کر دیں۔ سبھی لوگ متاثر ہو جائیں گے۔ ایک پریکٹیکل نمونہ تو آپ کے سامنے ہے کہ مُجھ جیسا گناہ گار آپ جیسے نیک لوگوں کے سامنے بیٹھ کر بولتا رہتا ہے۔

سوال: کیا ایک ولی اللہ کو یہ ڈیوٹی Assign کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں میں علم بانٹے، اُن کی تربیت کرے، اُن کے لیے دُعا کرے؟ یہ ڈیوٹی کون Assign کرتا ہے؟ اِس کے لیے Criteria کیا ہوتا ہے؟

جواب: جن صاحب نے بھی یہ سوال لکھا ہے میں اُنھیں براہِ راست مخاطب کر رہا ہوں۔ حضور! آپ لوہے کے برتن کو کسی کسوٹی پر رگڑتے رہیں کبھی پتا نہیں چلے گا یہ سونے کا بنا ہے، پلاٹینم کا یا وائٹ گولڈ کا۔ لوہا، لوہا ہی رہتا ہے۔ یہ جو آپ گھوم پھر کر ایسے سوال کر رہے ہیں جن سے پتا چل جائے کہ شاہ صاحب کیا ہیں تو میں نے ابھی عرض کیا کہ میں تو گناہ گار اور بہت معمولی و دُنیا دار شخص ہوں۔

اگر آپ اولیائے کرام کی بات سننا چاہتے ہیں تو بھائی! یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اللہ نے جسے جو علم عطا کیا ہے وہ اُسے دوسروں تک پہنچا دے۔ دین کی باتیں اور پیغامِ حق دوسروں تک پہنچانا ہر ایک مسلمان پر فرض

ہے۔ یہ تبلیغِ دین کا حصہ ہے۔

جہاں تک دُعا کی بات ہے تو دُعا تو Non-Muslims بھی کرتے ہیں۔ وہ تو رب ہے اور اُس کی شانِ ربوبیت ہے کہ وہ ہر ایک کی دُعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ بغیر یہ دیکھے کہ کوئی اُس کا ماننے والا ہے یا منکر، نیک ہے یا مجھ جیسا بد...... وہ تو سب کو عطا کرتا ہے۔

سوال: اولیاء اللہ کو اپنی ڈیوٹی Perform کرنے کے لیے کوئی Methods یا Channels بھی بتائے جاتے ہیں یا اُس کا فیصلہ اُنھیں خود ہی کرنا ہوتا ہے؟

جواب: یہ سب سوال کرنے والے صاحب کسی پکے اُستاد کے پڑھائے ہوئے ہیں پھر ویسا ہی ٹیڑھا سوال ہے۔

بھائی! اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ پرائم منسٹر کو جو کھانا دیا جاتا ہے پہلے اُسے ڈاکٹر خود چکھتا ہے تو اِس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے پرائم منسٹر بننا پڑے گا تاکہ مجھے پریکٹیکل Experience ہو جائے۔ اولیاء اللہ کو ڈیوٹی پرفارم کرنے کے لیے Methods یا Channels کہاں سے دیے جاتے ہیں، یہ بتانے کے لیے میرا ولی اللہ ہونا ضروری ہے۔ مجھے کیا معلوم یہ سب......!!

لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ رب تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ اور نائب بنایا ہے۔ رب تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ یہ انصاف پر مبنی نہیں ہوگا اگر قادرِ مطلق کا نائب کم از کم کچھ چیزوں پر قادر نہ ہو۔ رب تعالیٰ نے اِسے مجبورِ محض نہیں بنایا۔ اِسے بہت سے اعضا اور ذہنی صلاحیتوں سے نوازا ہے تاکہ وہ فیصلہ کر سکے اور عملی قدم اُٹھا سکے۔

اولیائے کرام صاحبِ علم ہوتے ہیں اور اِس علم کے نتیجے میں اُنھیں عقل وفراست عطا ہوتی ہے۔ وہ اِس سے کام لے کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں۔ جس دور میں وہ پیدا ہوئے، جس جغرافیائی خطے میں اُنھیں ولایت عطا ہوئی، وہاں کے رسم ورواج، تعلیمی وذہنی معیار اور تصورات کو سامنے رکھ کر وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مجھے کس انداز میں تبلیغ کرنا ہوگی اور اللہ نے مجھے جو علم عطا فرمایا ہے اُسے دوسروں تک کیسے Pass on کرنا ہے۔ اپنی عقل وفہم سے کام لے کر وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں۔ اُن کی گفتگو ہمیشہ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے کیوں کہ یہ سنت رسول ﷺ ہے۔ جب وہ مخاطب کی ذہنی سطح سے بلند بات کہتا ہے تو پھر وہ انا الحق کہہ بیٹھتا ہے یا مافوق الفطرت باتیں کرنے لگتا ہے جیسا کہ عبدالعزیز دباغ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید نے کیا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سرتن سے جدا ہو جاتا ہے۔

باطنی معنی

آپ ﷺ کا فرمان حدیث کہلاتا ہے۔ اللہ کا فرمان جب آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہو تو اُسے حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں آپ ﷺ نے متعدد مختلف مواقع پر بار بار بیان فرمایا۔ اُنھیں حدیث متواتر کہا جاتا ہے۔ اُن کی خاص اہمیت ہے۔ ایسی ہی ایک حدیثِ متواتر کا مفہوم ہے۔

اِس کتاب (قرآن مجید) کو سات حروف پر پیدا کیا گیا اور ہر حرف کی اپنی ایک شان ہے۔

آپ ﷺ نے یہ بات متعدد بار بیان فرمائی لیکن اِس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اِس کا مطلب کیا ہے۔

علمِ حدیث وفقہ پر عبور رکھنے والے مختلف حضرات نے اِس حدیث کے اصل مفاہیم تک پہنچنے کی کوشش کی اور اس کی چالیس تشریحات کیں۔ ایک بہت بڑے عالم، محدث اور ولی اللہ جناب احمد بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے اِن چالیس تشریحات کا بغور مطالعہ کیا لیکن مجھے ذاتی طور پر اِن میں سے صرف چار تشریحات پسند آئیں جو حقیقت سے بہت قریب لگتی اور کنفیوژن کو دُور کرتی ہیں۔ لیکن ان چاروں تشریحات سے بھی میں مکمل طور پر مطمئن نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے مرشد سید عبدالعزیز دباغ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اِس حدیثِ متواتر کے معنی پوچھے تو اُنھوں نے کہا میں انشاء اللہ کل تمھیں اِس کا جواب دوں گا۔

محترم حاضرین! میں نے ایک بار عرض کیا تھا کہ قرآن کے دو معنی ہیں:

1. ظاہری
2. باطنی

باطنی معنوں میں مزید دس معانی پوشیدہ ہیں۔ جس طرح ولایت کے دس درجے ہیں اِسی طرح باطنی معانی کے بھی دس درجات ہیں۔ جوں جوں انسان ولایت کی سیڑھیاں چڑھتا جاتا ہے توں توں درجہ بہ درجہ قرآن پاک کے باطنی معنی اُس کی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ وہ معنی براہِ راست ولایت کے درجات سے منسلک ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے جن سات حروف کا ذکر فرمایا ہے اُن کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور دوسرے باطنی۔

جہاں تک ظاہری معنی کی بات ہے تو جناب حضرت عمر فاروق ؓ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ہشام بن حکیم کو قرأت کرتے سنا۔ یہ قرأت اُس سے مختلف تھی جو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق ؓ کو سکھائی تھی۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت ہشام بن حکیم کو ساتھ لیا اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! ہشام بن حکیم آپ ﷺ کے مجھے بتائے گئے طریقے سے مختلف انداز میں قرأت فرما رہے تھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''آپ دونوں ہی صحیح قرأت کرتے ہیں۔''

مختلف اسکالرز نے اِس حدیث پر ریسرچ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اِس حدیث ''قرآن پاک کو سات حروف پر پیدا کیا گیا اور ہر حرف کی شان علیحدہ ہے'' سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کی قرأت کے سات طریقے ہیں۔ دراصل Researchers نے اِس حدیث کے یہ ظاہری معنی بیان کیے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ احمد بن مبارک کے مرشد نے اُنھیں کہا تھا کہ میں تمھیں کل اِس حدیث کے باطنی معنی بتاؤں گا۔ اگلے دن اُنھوں نے بتایا کہ آپ ﷺ کی اِن سات حروف سے مراد وہ حروف ہیں جنھیں مخفی رکھا گیا ہے۔ جیسے حروف مقطعات کی وضاحت نہیں کی گئی اور اُنھیں مخفی رکھا گیا ہے۔

حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد احمد بن مبارک کو وہ سات حروف یوں بتائے۔

1۔ حرفِ نبوت

2۔ حرفِ رسالت

3۔ حرفِ آدمیت

4۔ حرفِ رُوح

5۔ حرفِ علم

6۔ حرفِ قبض (انقباض)

7۔ حرفِ بسط

حضرت عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ نے اِن حروف کی بہت کمال تشریح کی۔ فرمایا کہ وہ آیات جن میں صرف رب تعالیٰ یا اُس کی صفات کا ذکر ہے اُن کا تعلق حرفِ رُوح سے ہے۔ جن آیات میں رب تعالیٰ نے انسان کو عذاب سے ڈرایا ہے یا عذاب کی وعید سنائی ہے اُن کا تعلق حرفِ قبض سے ہے۔ جن آیات میں رب تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر ہے، انعامات کی بات کی گئی ہے کہ اگر تم نیک عمل کرو گے تو اجر عظیم ہے۔ اِن آیات کا تعلق حرفِ بسط سے ہے۔ حرفِ آدمیت بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنے نور سے ایک حصہ لیا اُسے دو حصوں میں تقسیم کیا:

1۔ نور المومنین

2۔ نور العالمین

نور المومنین سے پیغمبروں اور نور العالمین سے عام انسانوں کی ارواح تخلیق کی گئیں۔ رب تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسا نور سمویا جس سے انسان میں گفتگو کرنے کی ایک خاص صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ایسی

صلاحیت کہ وہ گفتگو کرنے والی دوسری تمام مخلوقات مثلاً فرشتوں اور جنات سے ممتاز ہو گیا اور انسان اِس نور کی وجہ سے قادر الکلام ہو گیا۔ ہم جو گفتگو کرتے ہیں وہ مخاطب کے دل پر جب اثر کرتی ہے تو یہ اُس نور کی وجہ سے ہے۔ آپ ﷺ کو رب تعالیٰ نے ایسی مخصوص قوت عطا فرمائی جو سات انوار پر مشتمل ہے۔ ہر نور کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جو براہِ راست رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ نور ہر وقت جاری وساری رہتا ہے۔ اِس نور کا دوسرا پہلو وہ تعلق ہے جو آپ ﷺ اور رب تعالیٰ کی دوسری مخلوق کے درمیان ہے۔ ہوتا یہ رہا کہ جب آپ ﷺ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو نور کا وہ تعلق جو رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے درمیان جاری وساری رہتا تھا، اُس نور کا تھوڑا سا حصہ اِس آیت میں شامل ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات انسان کے دل پر براہِ راست اثر کرتی ہیں۔

چوں کہ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ میں وہ قوت جمع ہے جو سات انوار پر مشتمل ہے اور اِن میں سے ایک حرفِ آدمیت کا نور بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی گفتگو سے مخاطب کا دل مسحور ہو جاتا تھا۔ جب ہم کسی صاحبِ علم یا ولی اللہ سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ جواب میں کتنے ہی سادہ اور روزمرہ الفاظ کا استعمال کر رہا ہو...... اور عام طور پر اولیاء اللہ سادہ الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں...... مخاطب اِن الفاظ کا اثر براہِ راست اپنے دل پر محسوس کرتا ہے۔ یہ حرفِ آدمیت کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ وہ آیات جن میں رب تعالیٰ یا اُس کی صفات کا ذکر ہے اُن کا تعلق حرفِ رُوح سے ہے۔ انسانی رُوح ہمیشہ اپنے خالق کی طرف متوجہ رہتی ہے اِس لیے کہ جب زمین پر کسی رُوح کا متعلقہ جسم تخلیق ہوتا ہے تو اُس رُوح کو زمین پر روانگی کا حکم ملتا ہے اور وقتِ رُخصت اُسے ایک ہی ٹاسک دیا جاتا ہے کہ وہ رُوح اپنے رب سے رُجوع رکھے گی۔ رُوح چوں کہ براہِ راست حق کی طرف متوجہ رہتی ہے اور جن آیات میں حق کا ذکر ہے اُن کا تعلق حرفِ رُوح سے ہے۔

اِن سات حروف کے آگے سات سات اجزا ہیں اور ہر حرف کی 366 اقسام ہیں۔ اِن اقسام کو بیان کیا جائے تو اِن حروف کے وہ اِسرار کھلنے لگیں گے جنھیں عیاں کرنے کی اجازت نہیں۔ اولیائے کرام پر بھی ہر حرف کی 366 اقسام ظاہر نہیں ہوتیں ماسوائے اُن اولیاء اللہ کے جنھیں فتح کبیر حاصل ہو جاتی ہے۔

ہر آیت کی ایک فتح ہے اور ہر آیت کا آگے ذوق ہے۔ جب اِس ذوق سے ہر آیت کو پابندی سے ایک مخصوص تعداد میں پڑھا جاتا ہے تو اُس ولی اللہ کو فتح کبیر حاصل ہو جاتی ہے اور اُس پر راز کھلنے لگتے ہیں۔ بہت سے لوگ سورہ اخلاص کے دورۂ کبیر اور دورۂ صغیر کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ دورۂ کبیر دراصل فتح کبیر اور دورۂ صغیر فتح صغیر ہے۔

میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ پچاسویں منزل تعمیر کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے بنیادیں اور نچلی منزلیں تیار کرنا ہوں گی۔ اِسی طرح علم کی بنیادیں اُس وقت تیار ہوتی ہیں جب ہم اپنے آپ کو اُس رنگ میں ڈھال لیتے ہیں جس میں رب تعالیٰ ایک مومن کو دیکھنا چاہتا ہے۔

مومن اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟ مسلمان رب کو اور مومن رب کی مانتا ہے۔ جب ہم اپنے آپ کو، اپنی عادات واطوار، اپنی روزمرہ زندگی اور اپنے دوسروں کے ساتھ Behaviours and attitudes کو سنت کے مطابق ڈھال لیتے ہیں تو بنیادیں تعمیر ہو جاتی ہیں اور آگے بڑھنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ان بنیادوں پر تیسری چوتھی منزل طے کرتے ہوئے ہم ایک کڑی آزمائش سے گزرتے ہیں۔ وہاں ہمارا توکل آزمایا جاتا ہے۔ ایسے میں انسان کو اپنے اندر ایسا پختہ توکل پیدا کرنا پڑتا ہے کہ وہ کسی غیر اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے توقعات وابستہ نہیں کرتا۔ پھر وہ Mill (چکی) میں سے گزارا جاتا ہے اور ایسی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے جو اُسے محاورتاً سر کے بل کھڑا کر دیتی ہیں۔ لیکن اگر وہ توکل کا دامن نہ چھوڑے اور اِستقامت کا مظاہرہ کرتا رہے، اِس بات پر ڈٹا رہے کہ میرا پالنے والا میرا رب ہے، میرا حاجت روا میرا رب ہے، مجھے مشکلات سے بچانے اور نکالنے والا میرا رب ہے تو پھر اُس پر انعامات کی ایسی بارش ہونے لگتی ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے دل میں اُس کے لیے یہ خیال ڈالنے لگتا ہے کہ یہ میرا بندہ ہے۔ اِس کی خدمت کرو۔ یوں رب تعالیٰ اپنے بندے کو پالنے لگتا ہے اور اُسے ایسی ایسی جگہ سے رزق عطا کرنے لگتا ہے جہاں سے اُس بندے کو توقع بھی نہیں ہوتی۔

توکل کی راہ میں سخت ترین مقام وہی ہے جب انسان اِس Mill میں سے گزارا جا رہا ہوتا ہے۔ عموماً اِس مرحلے میں انسان پریشان ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ وہاں کھڑا وہی رہتا ہے جس کا اللہ پر توکل بے حد پختہ ہو یا جس کا مرشد مضبوط ہو۔ مرشد اپنے اُس مرید کا ہاتھ تھامے رکھتا ہے، اُسے حوصلہ دیتا رہتا ہے کہ تھوڑا کٹھن وقت ہے لیکن گزر جائے گا کیوں کہ مرشد جانتا ہے کہ مشکلات کے بعد کیسا وقت آئے گا تو وہ اپنے مرید کو مضبوطی سے توکل کے مقام پر قائم رکھتا ہے۔

ہم لوگ ذرا سے دُکھ اور تکلیف پر اُن لوگوں کی طرف دوڑے جاتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ دُعا کر دیں تو کام ہو جاتا ہے۔ اگر رب پر بھروسا ہو تو انسان پلٹ کر کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ اُسے رب پر بھروسا ہوتا ہے کہ اُس شخص کی دُعائیں بھی تو رب ہی سنتا اور پوری کرتا ہے۔ وہ میری کیوں نہیں سنے گا۔ یوں وہ رب کے در پر بیٹھا رہتا ہے رب کو پکڑے رکھتا ہے اُس کے حضور گڑگڑاتا رہتا ہے لیکن اُس کا گڑگڑانا شکرگزاری کے طور پر ہوتا ہے۔

اُس کی عنایات، رحمتوں اور انعامات کی بارش چوبیس گھنٹے انسان پر جاری رہتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہونے والی یہ رحمتیں اور عنایات ہمیں یاد نہیں رہتیں لیکن سال دو سال بعد آنے والا مشکل وقت ہمیں یاد رہتا اور بے چین رکھتا ہے۔ ہم دُعا کرنے والوں کے پاس بھاگے چلے جاتے ہیں کہ کسی طرح اِس مشکل سے نکل جائیں۔ فقیر کا تعلق رب کے ساتھ اِتنا کمزور نہیں ہوتا کہ پریشانیاں اُسے ڈانواں ڈول کر دیں۔ اُس کی نظر آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر رہتی ہے کہ کفار نے آپ ﷺ کو کس کس انداز میں نہیں ستایا لیکن آپ ﷺ کے پایۂ اِستقلال میں لغزش نہیں آئی۔

یہ ٹھیک ہے کہ آپ ﷺ جیسا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔ جس طرح رب یکتا و واحد ہے اِسی طرح رب تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ اپنی ذات میں یکتا اور Unmatched ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم بحیثیت اُمتی آپ ﷺ کے Footprints کو ایک بڑی حد تک Follow کر سکتے ہیں۔

سوال: غارِ حرا کے باہر غوث کے ساتھ میٹنگ میں جو اولیاء اللہ موجود ہوتے ہیں کیا وہ سب اپنے ظاہری اجسام کے ساتھ وہاں حاضر ہوتے ہیں یا کچھ اولیائے کرام جسمانی طور پر تو اپنے علاقے میں جب کہ رُوحانی جسم کے ساتھ اُس میٹنگ میں موجود ہوتے ہیں؟

جواب: اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ لاہور کے پی سی ہوٹل کے کمرے کیسے ہیں تو میں کیا بتا پاؤں گا کہ میں تو سڑک سے گزرتے ہوئے محض اُس کا بورڈ پڑھا کرتا ہوں۔ آپ نے جو پوچھا میں اُس کا کیا جواب دے پاؤں گا البتہ آپ کی توجہ اِس ایک بات کی طرف دلا دوں کہ آج کل جو کانفرنسز ہوتی ہیں وہ بھی ویڈیو ہوتی ہیں، ٹیلی میٹنگ کا نظام آج کل بڑا مقبول ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی ﷺ کے منبر پر کھڑے ہو کر میلوں دُور موجود صحابی کو پیغام دیا تھا کہ پہاڑ کے پیچھے ہو جاؤ۔ جو چیزیں سائنس آج Discover کر رہی ہے وہ تو رب تعالیٰ نے ازل سے تخلیق کر رکھی ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام اولیاء اللہ جسمانی طور پر وہاں موجود ہوں نہ وہاں اِتنی جگہ ہوتی ہے کہ وہ وہاں سما سکیں۔ وہاں اُن کی موجودگی رُوحانی ہوتی ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ کسی جگہ زیادہ سے زیادہ دس اولیاء اللہ اکٹھے ہوتے ہیں، اِس سے زیادہ نہیں کیوں کہ زمین اُن کے انوار برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیا یہ حقیقت ہے؟

جواب: اِس زمین پر ایک وقت میں چالیس ہزار تو صرف عمران ہوتے ہیں جنھیں اخیار بھی کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح چار قطب اور غوث بھی ہوتے ہیں۔ سب اولیاء اللہ پوری زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ زمین اُن کی اِس رُوحانی قوت کو برداشت کرتی ہے۔ اگر کہیں ارتکاز ہو جائے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب میٹنگ ہوتی ہے تو وہ جگہ بھی تو برداشت کرتی ہے۔

سوال: کیا مرحوم اولیاء اللہ بھی غوث کی میٹنگ میں موجود ہوتے ہیں؟

جواب: ایک حد تک۔

سوال: کیا مرحوم اولیاء اللہ سے زندہ لوگوں سے متعلق اُمور میں بھی مشورہ لیا جاتا ہے یا صرف مرحومین کے بارے میں؟

جواب: اولیاء اللہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر اُن سے ہر معاملے میں مشورہ نہ کرنا ہو تو اُن کی موجودگی کے کوئی معنی ہی نہیں۔ مشورہ ہوتا ہے۔

سوال: اللہ کی محبت کا رنگ جب بندے کے دل پر چڑھ جاتا ہے تو اُس بندے کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

جواب: ایک انسان 10 x 10 کے بند کمرے کے Centre (وسط) میں کھڑا ہے تو اُسے اپنا قد بہت بڑا لگتا ہے۔ اگر وہ کرکٹ کے میدان میں کھڑا ہو تو اپنے آپ کو بونا سمجھنے لگتا ہے کیوں کہ اُس کی حدِ نظر وسیع ہو جاتی

ہے۔ قد تو اُس کا چھ فٹ ہی ہوتا ہے لیکن بند کمرے میں وہ دس فٹ اور کرکٹ کے میدان میں دو فٹ لگنے لگتا ہے۔ اگر آپ اُسے Sahara Desert میں لے جائیں تو اُسے اپنا آپ ایک ذرے کی مانند لگتا ہے۔

رب کا رنگ بندے کے دل پر چڑھتا ہے تو رب اُس پر ایسی رحمت فرماتا ہے کہ حجابات اُٹھنے اور اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ اُسے اپنا آپ انتہائی چھوٹا لگتا ہے۔ یہ چیز اُس میں عاجزی لاتی ہے۔ اللہ کی محبت کا رنگ جب انسان کے دل پر چڑھتا ہے تو اُس میں عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ اُس میں رب کی مخلوق سے محبت کی صفت Develop ہونے لگتی ہے۔ وہ ہر مخلوق کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ اُسی رب کی تخلیق ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ حیوانات، نباتات، جمادات سے بھی پیار کرتے ہیں۔

اللہ کا رنگ قلب پر چڑھنے کے بعد تیسری صفت اُس انسان میں یہ پیدا ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں ایمان پیدا ہونے لگتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ اِسے کوئی رب کا بندہ بھی آکر میرے ساتھ Share کرلے۔ یوں اِس سوچ اور ایمان کی وجہ سے اُس کا ہاتھ اور دل تنگ نہیں ہوتے۔ یہ تین تبدیلیاں کسی کے ولی اللہ ہونے کی بہت اہم نشانیاں ہیں۔

سوال: وہ بزرگ جن کے وصال کو چھ سو سال کا عرصہ بیت چکا ہے، جنھوں نے آپ کو چار کوڑیاں عطا کی تھیں، اُن کا نام کیا ہے؟ بزرگوں کو یوں کسی کو کوئی چیز عطا کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

جواب: وہ کوڑیاں جناب حضرت سرکار سید علاؤ الدین علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمائی تھیں۔ کوئی بزرگ یوں کوئی چیز عطا فرما دیں تو یہ اپنائیت کا اِظہار ہوتا ہے۔ اِس کا مطلب ہوتا ہے یہ میرا ہے۔ جب بیٹے کو باپ ہی کچھ دے گا۔ دشمن کے بچے کو کبھی کوئی کچھ نہیں دیتا۔ اپنے بچے کو ہی دیتا ہے۔

سوال: 1999ء میں بہت پُرانی چیزیں آپ کو اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ملیں جیسے ٹکا، چار کوڑیاں، ربانی صاحب والا پیپر...... یہ کیا قصہ ہے؟

جواب: بھائی! آپ یہ معلوم کر کے کیا لیں گے۔ میں تو فضول آدمی ہوں۔ دیکھیے اگر کوئی شخص کسی سے پیار کرے تو ضروری نہیں وہ جس سے پیار کر رہا ہے وہ اچھا انسان ہی ہوگا۔ اکثر اوقات پیار کرنے والا انسان خود بہت بڑا ہوتا ہے وہ بلا وجہ کسی سے پیار کرنے لگتا ہے۔ جیسے اللہ کے لیے بُغض اور اللہ کے لیے محبت ہے۔

جو لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں یہ اُن کی اپنی عظمت ہے۔ میرا اِس میں کوئی کمال نہیں۔ یہ سب بزرگ جنھوں نے وہ سب چیزیں ماضی میں مجھے عطا کی تھیں اور ایک مدت بعد وہ سب مجھے اچانک میری ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ملیں۔ دراصل یہ اُن ہستیوں کا میری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کا ایک انداز تھا۔

جب میں کلاس 5 میں پڑھتا تھا بابا مجنوں سائیں صاحب نے مجھے ایک ٹکا دیا تھا یہ اُن کا تصرف تھا کہ کئی سالوں بعد کائی زدہ وہ ٹکا مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر نظر آیا۔ اُن دنوں میں سوچ رہا تھا کہ بابا مجنوں آج کل کہاں ہیں۔ پھر مجھے اُن کے عرس کا ایک اشتہار نظر آیا تو پتا چلا کہ وہ میانی صاحب میں ہوتے ہیں۔

اِسی طرح ایک زمانہ پہلے جناب سرکار علاؤ الدین علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کوڑیاں مجھے عطا کی

تھیں، دو دہائیوں بعد وہ میری ڈریسنگ ٹیبل پر آ گئیں۔ یہ سرکار علاؤ الدین علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف تھا۔ اِس میں میرا کوئی کمال نہیں۔

سوال: کیا ہر ولی اللہ لوحِ محفوظ جہاں سے چاہے پڑھ سکتا ہے یا اُسے ایک خاص حصے پر ہی نظر ڈالنے کی اجازت ہوتی ہے؟

جواب: ہر ولی اللہ لوحِ محفوظ نہیں پڑھ سکتا۔ ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد اُنھیں اجازت ملتی ہے۔ لوحِ محفوظ کا کتنا حصہ کوئی ولی اللہ پڑھ سکتا ہے؟ یہ اُس کے درجے اور مقام پر منحصر ہے، اور یہ بہت اُونچا مقام ہے۔ کم ہی لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔

اہم اعلان برائے خلافت

آج میں ایک بہت اہم بات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے سلسلے میں یہ روایت رہی ہے کہ مرشد کا ایک ہی خلیفہ ہوتا ہے۔ ہمارے دادا مرشد جناب سرکار سید علاؤ الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ہی خلیفہ تھے اور میرے اپنے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی ایک ہی خلیفہ تھے۔ میری جگہ بھی ایک ہی شخص لے پائیں گے اور وہ ہیں ”خرم“۔

اللہ انھیں اِستقامت اور ہمت عطا فرمائے تاکہ وہ یہ جگہ لے پائیں اور اِس سے انصاف کر پائیں کہ یہ پھولوں کی نہیں کانٹوں کی سیج ہے۔

انسان اپنے Enthusiasm میں یہ بھول جائے کہ مجھے علم درجہ بدرجہ لینا ہے......وہ اِنتہائی اُوپر کے علم کو ہاتھ ڈال لے......پھر گمراہی پکی ہے۔

دو دوست تھے، اُنھیں مردِ کامل کی بڑی تلاش تھی تاکہ وہ اُس سے علم حاصل کرسکیں۔ جہاں کہیں اُنھیں کسی درویش کا پتا چلتا، چلے جاتے۔ لیکن اُن کی تلاش کو منزل نہ ملی۔ ایک روز اُنھیں خبر ملی کہ بہت دُور دراز کے علاقے میں ایک ولی اللہ بیٹھتے ہیں۔ وہ ایک لمبا فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچے۔ پتا چلا وہ شیخ ایک ریستوران چلاتے ہیں۔ اُنھوں نے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مُدعا بیان کیا تو وہ کہنے لگے کہ جہاں جگہ ملے ڈیرے ڈال لو۔ اُن دونوں دوستوں نے دیکھا کہ شیخ اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ریستوران کی صفائی، پانی کا چھڑکاؤ، آگ کے لیے لکڑیاں لانا، کھانا پکانا، کسٹمر کو کھانا دینا...... جب اُن دو دوستوں کو وہاں رہتے بارہ، چودہ سال ہوگئے اور شیخ کا آخری وقت آن پہنچا، اُن پر غشی طاری ہوگئی۔ دونوں شیخ کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا ”میرا آخری وقت آگیا ہے، تم کچھ لینا چاہو تو بتادو۔“ ایک نے کہا ”مجھے آپ کا سر چاہیے۔“ انھوں نے فرمایا ”ابھی تم اِس لائق نہیں کہ تمھیں اپنا سر عطا کردوں۔ کیوں کہ اِس صورت تم گمراہ ہوجاؤ گے“ لیکن اُس شخص نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ شیخ نے بالآخر کہا ”ٹھیک ہے میں تمھیں اپنا سر دیتا ہوں۔“ دوسرے دوست سے پوچھا ”تم بتاؤ، کیا چاہیے؟“ اُس نے کہا ”حضور! اپنی خوشی سے جو آپ مناسب سمجھیں عطا فرمادیں۔“ شیخ نے کہا ”تم سر نہ مانگنا۔ اگر سر مانگنے میں صبر سے کام لو گے تو اللہ بہت کچھ عطا کر دے گا۔“

جس شخص کو سر عطا ہوا تھا وہ شیخ کی وفات کے اگلے دن وہاں سے روانہ ہوگیا لیکن جس شخص کو شیخ نے اپنی مرضی سے علم عطا کیا تھا وہ یہ سوچ کر وہیں رُک گیا کہ شیخ کی بیوہ اور تین بیٹوں کا کوئی سہارا نہیں، مجھ پر فرض ہے تب تک یہاں رہ کر شیخ کا ریستوران چلاؤں جب تک بچے بڑے نہ ہوجائیں۔ وہ بغیر کسی لالچ کے ریستوران چلانے لگا اور اُس کی آمدنی سے شیخ کی فیملی کے اخراجات پورے ہونے لگے حتیٰ کہ تینوں بیٹوں کی شادی بھی ہوگئی۔ اِس کے بعد اُس نے شیخ کی بیوہ سے اجازت مانگی۔ جاتے ہوئے سوچا شیخ کو سلام کرلوں اور اجازت طلب کرتا جاؤں۔ شیخ کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور اجازت چاہی۔ دس قدم گئے تو دل میں خیال آیا نہ جانے پھر کبھی شیخ کی قبر پر آ بھی پاؤں گا یا نہیں لہٰذا کچھ دیر اور اُن کے پاس بیٹھ جاؤں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد واپس آنے لگے تو چند قدم چلنے کے بعد پھر وہی خیال آیا پھر قبر پر جا کر بیٹھ گئے حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ وہ شیخ سے جُدا نہیں ہو پا رہے تھے۔ اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد اُن کی حضرت خضرؑ سے ملاقات ہوئی جنھوں نے ایک حرف اُنھیں پڑھنے کو عطا کیا۔ اِس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک گاؤں سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص کو زندہ جلایا جا رہا ہے۔ پوچھا کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا یہ شخص ایسی باتیں کرتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ علما کا فتویٰ ہے کہ یہ اُمت میں فساد پھیلا رہا ہے۔ اِس لیے اِس کو زندہ جلا دیا جائے۔ اُنھوں نے دیکھا یہ وہی شخص تھا جس نے شیخ کا سر مانگا تھا۔ اُنھوں نے کہا ”تم

علم ظاہر و باطن

ہم اپنی Daily life (روزمرہ زندگی) میں ایک لفظ کثرت سے سنتے اور اِستعمال کرتے ہیں، وہ ہے ”علم“۔ اکثر و بیشتر ہمارے اِستعمال میں اِس کی دو اقسام آتی ہیں:

1۔ ظاہری علم

2۔ باطنی علم

علم کی Definition بہت سے اولیائے کرام نے کی لیکن بہت کم اولیائے کرام علم کے ظاہر و باطن کے فرق کو بیان کر پائے۔

جناب احمد بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ سے پوچھا کہ علمِ ظاہر اور علم باطن کیا ہے؟ اُنھوں نے بہت کمال انداز میں اِس کی وضاحت بیان فرمائی۔ فرماتے ہیں ”علمِ باطن کی مثال یوں ہے کہ کسی نے علم کی 100 سطور تحریر کیں۔ پہلی 99 سطور سونے کے پانی سے تحریر ہوئیں اور آخری ایک سطر روشنائی (سیاہی) سے لکھی گئی۔ لیکن عالم یہ ہے کہ آخری سوویں سطر پڑھے بغیر پہلی 99 سطور سمجھ میں نہیں آتیں۔ علمِ ظاہر اور باطن میں یہی فرق ہے۔“

انھوں نے اِسے مزید یوں Elaborate کیا کہ علمِ ظاہر کی مثال یوں ہے ”جو انسان علمِ ظاہر رکھتا ہے وہ اُس آدمی کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں روشن لالٹین ہو اور وہ اندھیری رات میں اُس کی مدد سے اپنا راستہ تلاش کرتا ہو۔ جب کہ علمِ باطن کی مثال اِس طرح ہے جیسے نصف النہار پر آیا سورج جس کی روشنی میں بے پناہ چمک، تمازت اور گرمی ہوتی ہے۔ علمِ باطن رکھنے والا آدمی ایسا ہے جیسے اُس کے ہاتھ میں سورج ہو تو جس شخص کو علم باطن (سورج) حاصل ہو جائے اگر وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی لالٹین پھینک دے کہ سورج کے مقابلے میں اُس کی روشنی نہ ہونے کے برابر ہے لیکن رات ہونے پر سورج کی روشنی نہیں رہے گی تو وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھائے گا پھر وہ لالٹین تلاش کرے گا تاکہ راستہ تلاش کرسکے اور ٹھوکروں سے بچ سکے۔

علم ظاہر اور علم باطن دونوں کا حصول اہم ہے اِسی لیے شیخ کامل اپنے شاگردوں کو ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ علم جیسا بھی ہو، جہاں سے بھی ملے، اُسے حاصل کرلیں کہ مردِ کامل اُسی وقت بنا جاسکتا ہے جب یہ دونوں علوم حاصل ہو جائیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اِن علوم کے حصول میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو، یہ باتیں تو کہنے کی نہ تھیں؟'' وہ شخص بولا ''میں تو اِسرارِ الٰہی میں سے ایک بر بیان کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا لوگوں کو اِن باتوں کا علم ہو جائے۔'' یہ سُن کر شیخ کے مرید خاص نے کہا ''میں بادشاہ سے جا کر بات کرتا ہوں کہ وہ سزا کو کالعدم کر دے۔'' وہ بادشاہ کے پاس گئے اور پوچھا ''آپ اُس شخص کو زندہ جلانے کی سزا کیوں دے رہے ہیں۔'' اُس نے کہا ''یہ شر کا باعث بن رہا تھا اور علما نے فتویٰ دیا ہے کہ اِسے زندہ جلا دیا جائے۔'' اُنھوں نے بادشاہ سے کہا ''کسی شخص کی کہی بات بذاتِ خود اہم نہیں۔ اہم یہ ہے کہ اُس نے کس نیت سے وہ بات کہی اور اُس کا ارادہ کیا تھا۔ اِس لیے اُسے سزا دینے سے پہلے انصاف کے تقاضے کے تحت ہم پر لازم ہے کہ پہلے اُس کی نیت اور ارادہ پوچھا جائے۔'' علما نے یہ بات سُنی تو کہا ''یہ شخص صحیح کہتا ہے۔'' اُس آدمی کو بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے وہ بات کیوں کہی تھی؟ اُس نے کہا ''میں نے وہ بات اِس لیے کہی تھی تا کہ لوگوں کے علم میں آ جائے۔ کیوں کہ میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ اِس بات کا اُنھیں پتا نہیں ہے اور میں چاہتا تھا اُن کے علم میں اضافہ ہو۔'' جب اُس کی نیت اور ارادے کا پتا چلا تو بادشاہ نے اُس کی سزا ختم کر دی۔

اِس واقعہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک انسان خود کو تیار نہ کر لے تب تک علم کے اعلیٰ درجے کی خواہش نہ کرے ورنہ وہ پِٹ جاتا ہے اور جو شخص علم کی بنیادوں سے علم کے حصول کا آغاز کرتا ہے اُس پر اُس کی باریکیاں عیاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے ہم مکان بنانے کے لیے سب سے پہلے زمین خریدتے ہیں، نقشہ بنواتے ہیں۔ بنیادوں کی کھدائی کر کے اُن کی تعمیر کراتے ہیں۔ ہمارا Maximum وقت اور پیسہ بنیادیں بنانے پر لگتا ہے۔ بنیادیں تعمیر ہونے کے بعد عمارت تیزی سے کھڑی ہونے لگتی ہے۔ بنیادیں جتنی مضبوط ہوں گی اُن پر اُتنی ہی زیادہ منزلیں تعمیر ہو سکیں گی۔ اِس کے بعد عمارت کے رنگ و روغن اور زیبائش کا کام ساری عمر چلتا رہتا ہے۔

جب تک انسان علم کے حصول کی Foundations نہ بنا لے تب تک اعلیٰ علم کے حصول کی خواہش نہ کرے ورنہ وہ سب کچھ کھو دیتا ہے۔

حصولِ علم کی بنیادوں سے کیا مراد ہے؟ اِسے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے رویے Toward life and others قرآن و سنت کے مطابق ہو جائیں۔

بحیثیت انسان ہم میں بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں جب کہ آپ ﷺ سرتاپا کلیۃً نور تھے۔ آپ ﷺ کی تخلیق اللہ نے اپنے نور سے کی۔ آپ ﷺ سراپا نور تھے۔ چوں کہ رب تعالیٰ نے ہم سب کو تخلیق کیا اور خالق جانتا ہے کہ ہم سب میں کیسی کیسی بہانہ بازیاں اور مکر و فریب ہیں اِس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بصورتِ بشر پیدا فرمایا اور آپ ﷺ نے ایک بشر کی مانند اپنی زندگی گزاری تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ آپ ﷺ تو سراپا نور ہیں، ہم وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو ایک عام بشر کی سی زندگی عطا فرمائی لیکن آپ ﷺ بشری کمزوریوں اور نفس کی خواہشات سے پاک تھے۔ نفسانی خواہشات اور بشری کمزوریاں کہیں نہ کہیں ہمارے پاؤں لڑکھڑا دیتی ہیں۔ اِس لیے ضروری ہے کہ خود

کو ان بشری خامیوں سے حتی الامکان پاک کر دیا جائے۔ خود کو سُنت کے مطابق ڈھال لیا جائے اور جو ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا، اُسے علم باطن حاصل ہو کر ہی رہے گا۔ بنیادوں کی تعمیر ہو جانے کے بعد ہم اپنے دل میں اعلیٰ علم کے حصول کی خواہش پال لیں۔

جو شخص بنیادیں تعمیر کرنے سے لے کر اُس عمارت کے پینٹ اور ڈیکوریشن تک کا سفر خود طے کرتا ہے وہ اُس کی ایک ایک اینٹ، پتھر، کیل سے واقف ہے۔ وہ اس کی تمام باریکیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ اُس گھر کا بھیدی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کوئی آدمی کہے کہ میں گوجرانوالہ کی طرف سفر کر رہا تھا تو راستے میں اِتنے کلومیٹر بعد ایک پٹرول پمپ آیا۔ اب جو اُس راستے پر پہلے سے سفر کر چکا ہے وہ فوراً کہہ دے گا وہ فلاں کمپنی کا پٹرول پمپ ہے اور وہاں ایک ریستوران بھی ہے۔ اور جس نے اُس راستے پر سفر نہیں کیا وہ میری طرح منہ کھولے یہ سب باتیں سنتا رہے گا کہ یہ آدمی کیا بات کر رہا ہے۔

جب ہم اِس طرح علم حاصل کرتے ہیں تو ہمیں اُس پر دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر علم ہمارے گھر کی باندی ہے، جیسے چاہیں اِستعمال کریں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ عطا اور کسب میں کیا فرق ہے؟ اگر کسی نے خوش ہو کر آپ کو کشف عطا کر دیا تو ایک تو وہ Diminishing ہوگا۔ ہر گزرے دن کے ساتھ کمزور ہوتا ہوتا ایک دن ختم ہو جائے گا۔ جیسے کوئی آپ کے اکاؤنٹ میں دس لاکھ جمع کرا دے۔ آپ کچھ کماتے نہ ہوں، اُس سے خرچ کرتے رہیں تو ایک وقت آئے گا جب آپ کا بینک بیلنس زیرو ہو جائے گا۔

یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اگر کسی کو کشف حاصل ہو گیا تو وہ ہر چیز کو دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ ہم کشف میں جو دیکھتے ہیں اُسے سمجھنے کے لیے بھی علم چاہیے۔ ایک شخص کشف میں دیکھتا ہے کہ ایک علاقہ ہے جس میں Non-Muslims رہتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اُس علاقے کی عبادت گاہیں اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے مساجد میں تبدیل ہو گئی ہیں اور لوگ وہاں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر مجھ جیسا شخص جس کے پاس علم نہ ہو، کشف میں یہ سب دیکھے گا تو سمجھے گا میں ایک ایسے علاقے میں چلا گیا تھا جہاں ایسے مسلمان رہتے تھے جو بہت نیک اور عبادت گزار ہیں۔ لیکن صاحبِ کشف جانتا ہے کہ رب تعالیٰ نے مجھے روئے زمین پر ایک ایسا علاقہ دکھایا جہاں ابھی تو Non-Muslims رہتے ہیں لیکن آنے والے وقت میں وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ ایک جگہ فقیر صاحبِ کشف بھی مجبور ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ یہ تبدیلی آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ وقت کا علم اللہ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے۔

حصولِ علم کی خواہش لائقِ تحسین ہے۔ اگر کوئی شخص علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے Appreciate کیا جانا چاہیے لیکن یہ خواہش رکھنے والا جان لے کہ حصولِ علم کے لیے بنیادوں کی تعمیر بہت ضروری ہے ورنہ انسان مار کھاتا ہے۔

سوال: امرِ الٰہی کیا ہے؟ صاحبِ امر کسے کہتے ہیں۔

جواب: چوں کہ میں تعلیم یافتہ نہیں اِس لیے روزمرہ زبان میں گفتگو کرتا ہوں۔ ایک بار عرض کیا تھا کہ رب تعالیٰ

کوئی کام نہیں کرتا سوائے اپنے حبیب ﷺ پر درود بھیجنے کے۔ وہ صاحبِ قدرت و مالک ہے۔ وہ جس کام کا سوچتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ وہ کُن کہتا ہے اور کائنات وجود میں آجاتی ہے......یہی اُس کا امر ہے۔ ولایت میں مختلف Degrees ہیں۔ جیسے ہم سنتے ہیں کہ فلاں صاحب مستجاب الدعوات ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُن صاحب کی دُعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ مستجاب الدعوات سے اُوپر کا ایک درجہ ہے ''صاحبِ امر''۔ رب تعالیٰ نے اُس پر اِتنی رحمتیں فرما دیں، اپنا اِتنا قرب عطا فرما دیا، دوستی کا وہ مقام عطا فرما دیا کہ جو وہ بندہ کہہ دیتا ہے، رب کر دیتا ہے۔ اُس کے صاحبِ امر ہو جانے میں اُس بندے کی اپنی کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ تو سراسر رب کا کرم ہے، اُس کی شانِ ربوبیت اور رحمانیت ہے کہ وہ اِتنا حیا اور شان والا، اِتنا وضع دار ہے کہ اُس کا دوست ایک بات کہہ دے تو اُس کی شان گوارا ہی نہیں کرتی کہ وہ کام نہ ہو۔ یہ رب کی عظمت اور بڑا پن ہے کہ کوئی صاحبِ امر ہو جائے۔ یہ آدمی کے اپنے بس کی بات نہیں۔ رب اپنی عظمت اور حیا اور تواضع کی وجہ سے اُس کی بات کا مان رکھ لیتا ہے کہ میرے دوست نے مجھ پر بھروسا کر کے اِنتہائی مان سے یہ کہا ہے کہ میں یہ کر دوں۔ رب تعالیٰ تو اُس کی بھی بہت حیا کرتا ہے کہ جس کو رب دوست رکھتا ہے۔ اگر اُس دوست کا دوست بھی کچھ کہے تو اُسے پورا کر دیتا ہے۔ یہ رب کی وضع داری ہے۔

سوال: رب کی مغفرت کے بارے میں کچھ فرما دیجیے۔

جواب: رب تعالیٰ معاف کرنے والا، بخشنے والا، سب سے زیادہ متواضع اور حیا والا ہے۔ جب کوئی بندہ اُس سے معافی مانگتا ہے، اُس سے بخشش کی دُعا کرتا ہے تو رب کی یہ شان ہے کہ وہ کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اُس کے سوال کی شرم رکھتا ہے اور اُسے معاف کر دیتا ہے، بخش دیتا ہے۔

سوال: رب تعالیٰ کی بے نیازی کیا ہے؟

جواب: رب تعالیٰ کسی چیز کا محتاج نہیں کیوں کہ تمام خزانے اُسی کے ہیں۔ یہ کائنات اُس کی ہے۔ وہ مالکِ کُل ہے۔ اُسے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ بے نیاز وہ ہوتا ہے جس کا کام کسی کے بغیر نہ رُکے لیکن جس کے بغیر کسی کا کام نہ ہو سکے۔

حتیٰ کہ ہم پر جو عبادات فرض ہیں وہ بھی ہمارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہیں۔ اللہ کو اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی اُس کی شانِ بے نیازی ہے کہ وہ مجھ جیسے گناہ گار پر بھی گرفت نہیں کرتا، معاف کرتا رہتا ہے۔ مجھ جیسے خطا کار کی خطاؤں کے باوجود کبھی رزق کے دروازے بند نہیں کرتا، حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ بے شک وہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔

سوال: ملامت کس حد تک صحیح ہے کہ اپنا آپ بہت میلا لگے اور کبھی لگے میں وہ خوش نصیب ہوں جس سے اللہ محبت کرتا ہے۔

جواب: اگر آپ کسی چھوٹے کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو جائیں اور خود کو دیکھیں تو اپنا قد بہت لمبا محسوس کریں گے۔ لیکن کرکٹ کے میدان کے عین درمیان میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائیں تو آپ کو اپنا

آپ بہت چھوٹا لگے گا۔ اگر صحرائے اعظم میں کھڑے ہو کر خود کو دیکھیں گے تو خود کو ریت کے ذرّے کی مانند محسوس کریں گے۔

جوں جوں انسان بلندی کے زینے چڑھتا جاتا ہے، اُسے علم حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی نظر میں وسعت آتی جاتی ہے اور جوں جوں نظر میں وسعت آتی ہے، اُسے اپنا آپ بہت چھوٹا لگتا ہے کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اُس وسعت کے تناظر میں دیکھتا ہے جو اُس کی نگاہ میں پیدا ہو گئی ہے۔

نگاہ کی وسعت صرف علم سے آئے گی۔ جب وہ علم کی گہرائیوں میں اُترنے لگتا ہے تو اُسے اپنی کمزوریوں، خامیوں اور چھوٹے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جب وہ اپنے علم میں ڈوبا رہتا ہے تو اُسے اپنی ذات بہت میلی لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ خود سے یہ کہتا رہتا ہے کہ میں آج تک خود کو سنوار نہ سکا۔ ملامت اِس درجہ کی ہونی چاہیے۔

جب علم میں آگے بڑھتے بڑھتے وہ صاحبِ کشف ہو جاتا ہے تو اُس کی ملاقاتیں اُن انتہائی بزرگ ہستیوں سے ہونے لگتی ہیں جنھیں اِس دُنیا سے گزرے سینکڑوں سال ہو گئے۔ تب اُسے اپنے اندر چھپی گندگی کا احساس ہوتا ہے اور پھر یہ احساس اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلواتا ہے کہ میں بہت گناہ گار شخص ہوں۔ ملامت یہاں تک جائز ہے۔

سورہ یٰسٓ کی فضیلت
اورادووظائف کی تفویض میں شیخ کی نیت کی اہمیت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے سورہ یٰسٓ قرآن پاک کا دل ہے۔اہلِ فقر اپنے پاس آنے والوں کو اکثر اِس سورۃ کی تلاوت کرنے کا کہتے ہیں۔ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اِس سورۃ کی برکات بے پناہ ہیں۔لیکن کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ اِس کی اِتنی زیادہ فضیلت کیوں ہے اور اِسے قرآن پاک کا دل کیوں کہا گیا؟ اگر ہم غور کریں تو اِس سورۃ کے تقریباً آغاز ہی میں اللہ کے دو نام آئے ہیں ''العزیز'' اور ''الرحیم''۔آگے چل کر اِسم ''العزیز'' Repeat ہوا اور ''العلیم'' بھی آیا۔رب تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی جہاں بھی ہوں، اُن کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے 99 اسماء الحسنٰی ہیں اگر اُن کو Further explain کیا جائے تو 350 Extended names بن جاتے ہیں۔قرآن پاک میں بہت سے ناموں کا ذکر ہے۔جو اولیائے کرام بہت بلند مرتبے پر فائز ہو گئے وہ یہ جانتے ہیں اور اپنے قریبی حلقے میں کہہ بھی دیتے ہیں کہ اللہ کے نام ننانوے نہیں بلکہ سو ہیں۔ وہ نام جو تحریر میں نہیں آرہا وہی اِسم اعظم ہے۔

جب کوئی ولی اللہ بہت بلند مقام پر چلا جاتا ہے تو اُس کے علم میں وہ اِسم مبارک آجاتا ہے۔کسی شخص کو جب اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا کر کے ولایت عطا کر دیتا ہے تو ولایت میں Lowest مقام اخیار یا عمران کہلاتا ہے۔یہاں سے اُس کے حصولِ علم کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور آگے سے آگے وسیع علم اُسے حاصل ہوتا جاتا ہے۔جب ایک شخص اپنے شیخ کے پاس حصولِ علم کے لیے آنے لگتا ہے تو شیخ اُسے اللہ کا کوئی اِسم مبارک ورد کرنے کو کہہ دیتا ہے۔مثلاً ''الباقی''۔کہنے کو تو یہ ایک اِسم مبارک ہوتا ہے لیکن اِس کے انوار بے پناہ ہیں۔

جب کوئی شخص اللہ کے نام کا وِرد شروع کر دیتا ہے تو یہ انوار اُس کی مدد کرتے ہیں۔اگر یہ انوار نہ ہوں تو شیطان اُسے مختلف چیزیں دکھا کر تکبر کا شکار کر دیتا ہے۔پھر وہ شخص مختلف غلطیاں کرنے لگتا ہے اور نیکی کی راہ سے دُور ہونے لگتا ہے۔لیکن اگر وہ انوار ساتھ ہوں تو پھر شیطان اُسے بہکانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔

جب آپ کا شیخِ کامل آپ کو پڑھنے کے لیے اللہ کا کوئی نامِ مبارک دیتا ہے تو اُس اِسم مبارک کے انوار

... شیطان آپ کے قریب نہیں آتا اور نہ ہی بہکا سکتا ہے۔

...بھی ساتھ آتے ہیں۔اُس اِسم کا ورد کرنے سے شیطان آپ کے قریب ... اگر آپ کا شیخ کامل نہیں ہے تو کتاب سے پڑھ کر کوئی اِسم مبارک آپ کو دے دے گا لیکن اُس اِسم کے ... آپ کو نہیں ملیں گے۔ایک شیخ اور شیخ کامل کے پڑھائی دینے میں یہی فرق ہے۔

...ساتھ انوار آپ ... اِس میں ایک اور زبردست نکتہ ہے۔جب آپ شیخ کامل کے پاس گئے اور اُس نے دیکھا کہ آپ دُنیاوی ... مصائب سے تنگ ہیں اور اُن سے نکلنا چاہتے ہیں تو وہ اُسی نیت سے وہ اِسم مبارک آپ کو پڑھنے کے لیے دے گا اور آپ کے دُنیاوی مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔اگر وہ دیکھے گا کہ آپ کے رُوحانی احوال ... خراب ہیں اور انھیں درست ہونا چاہیے تو پھر جو اِسم مبارک وہ پڑھنے کے لیے دے گا اُس سے آپ کو رُوحانی ... حاصل ہونے لگیں گے۔شیخ کی نیت آپ کو اُس اِسم کے تمام پھل سمیٹنے میں Help کرے گی۔

...یوں اولیائے کرام کو بھی مختلف اسمائے مبارک پڑھنے کو ملتے ہیں۔کسی ولی اللہ کو ایک، کسی کو چار، کسی کو 10، کسی کو 20 اسماء مبارک کے انوار حاصل ہوتے ہیں۔جو ولی اللہ غوث کے مقام پر پہنچتا ہے اُسے 97 اسماء الحسنٰی کے انوار حاصل ہوتے ہیں۔صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں جنھیں پورے 100 اسماء الحسنٰی کے انوار حاصل تھے۔

انوار دو مقام سے حاصل ہوتے ہیں:

1۔ مقامِ رُوح سے
2۔ مقامِ سِر سے

مقامِ سِر صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاصل ہوا۔باقی سب کو مقامِ رُوح سے وہ انوار حاصل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اگر کسی انسان کو مقامِ سِرّ سے انوار حاصل ہوں تو وہ تجلیات کی تاب نہیں لا سکے گا۔اُس کی رُوح پرواز کر جائے گی اور اگر بچ جائے تو مجذوب ہو جائے گا، ہوش وحواس میں نہیں رہے گا۔اِس لیے اولیائے کرام کو مقامِ رُوح سے انوار عطا ہوتے ہیں اور اُن انوار کے اثرات جسم اور ذہنی کیفیات پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

اللہ کا ایک نام مبارک ہے ''المتعال''۔اگر کسی کو یہ عطا ہو جائے تو وہ ساری عمر مسکراتا ہی رہتا ہے۔جب بھی آپ اُس شخص کو دیکھیں گے اُس کے چہرے، چال ڈھال، Body language میں ایک سرخوشی دکھائی دے گی۔یہ دراصل اُس نام کو پڑھنے کے انوار کا نتیجہ ہے۔

ہر ولی اللہ کو جب کوئی اِسم عطا ہو جائے وہ اُسے لمبا عرصہ پڑھتا رہے، اُسے فتح حاصل ہو جائے تو اُس کے آگے تین لاکھ ساٹھ ہزار انوار کے حصے ہوتے ہیں جس میں سے نگاہ صرف ایک حصہ کو دیکھتی ہے۔باقی تین لاکھ انسٹھ ہزار انوار کو ولی اللہ کا پورا جسم دیکھ رہا ہوتا ہے۔یہ اللہ کی ایک خاص رحمت ہے لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ اللہ کے اِسم کا ورد اگر شیخ کامل سے پوچھ کر کیا جائے تو اُس کی ایسی برکات حاصل ہوتی ہیں کہ جس سے ورد کرنے والے کے احوال اور رُوحانی کیفیات درست ہونے لگتی ہیں، حجابات اُٹھنے لگتے ہیں، آنکھیں کھلنے لگتی ہیں۔

سورہ یٰسٓ کے کمالات کے حوالے سے جو تجربہ مجھے ہوا وہ عرض کر دیتا ہوں۔اِس سورۃ کو ایک بار پڑھنے سے ثواب، انوار اور ثمرات مل جاتے ہیں۔لیکن اگر اللہ ہمیں توفیق بخش دے کہ ہم نمازِ فجر کے بعد ایک نشست

میں تین بار اِسے پڑھ سکیں اور نمازِ عشاء کے بعد پانچ بار پڑھ لیں لیکن Late hours میں پڑھیں اور اِس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فرض نماز مسجد میں باجماعت ادا کر لیں اور باقی نماز Late hours میں گھر میں پڑھ لیں۔ تسبیحات کرنے کے بعد پانچ بار سورہ یٰس پڑھ کر فوری طور پر سو جائیں تو اِس کے ثمرات بہت جلدی حاصل ہونے لگتے ہیں۔

اب ہو گا کیا؟ آپ جن لوگوں کو اِس طرح سورہ یٰس پڑھنے کا بتائیں گے تو اُن میں سے چند ایک یہ کہیں گے کہ ہم ایک سال سے پڑھ رہے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تب آپ اُنھیں یاد دلائیں کہ ایک سال پہلے جب ابھی آپ نے اِس سورۃ کو پڑھنا شروع نہیں کیا تھا تب آپ کی ذہنی و جسمانی و رُوحانی کیفیات، روّیے اور احوال کیا تھے اور اب کیا ہیں؟

انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز Attitude toward life ہے۔ اگر ہمارا Attitude toward life منفی ہو تو ہمارے جسم سے Vibes بھی Negative نکلتی ہیں۔ اِن منفی لہروں کی وجہ سے لوگ ہم سے دُور بھاگتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے رویے مثبت ہوں تو ہماری Vibes بھی Positive ہوں گی اور ہماری Magnetic field بھی Positive ہو گی جس کی وجہ سے لوگ ہماری طرف Attract ہوں گے۔

جب ایک انسان سورہ یٰس پڑھتا ہے تو اُس کا Attitude toward life تبدیل ہونے لگتا ہے اور لوگ اُس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

جب ایک شخص کہہ رہا ہوتا ہے کہ ایک سال سے سورہ یٰس پڑھ رہا ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا تو ہم اُس کی توجہ اِس جانب مبذول کراتے ہیں کہ بھائی اِس ایک سال کے عرصہ میں آپ کو بہت کچھ عطا ہوا ہے۔ آپ رُوحانی، ذہنی، جسمانی، Socially اور Economically ایک مختلف مقام پر بہت بہتر جگہ کھڑے ہیں۔ آپ غور کریں تو پتا چلے گا کہ پہلے دن سے لے کر اب تک آپ ایک لمبا سفر طے کر آئے ہیں۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ سورہ یٰس پڑھنے کے اثرات اِتنے غیر محسوس انداز میں مرتب ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا اُنھیں نوٹس نہیں کر پاتا۔ نوٹس کرنے کے لیے پڑھائی شروع کرنے والے دن سے موجودہ دن تک وہ اپنا موازنہ کرے گا تو اُسے تبدیلی کی سمجھ آئے گی۔

رُوحانیت میں پرابلم ہی یہ ہے کہ اِتنی غیر محسوس انداز میں تبدیلی، ترقی یا بہتری آتی ہے کہ اُسے Judge نہیں کیا جا سکتا جیسے بچہ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑا ہوتا ہے۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اِتنا بڑا ہو گیا، ہمارے کوئی رشتہ دار پانچ سال بعد اُسے دیکھ کر کہتے ہیں اِتنا بڑا ہو گیا۔

سورہ یٰس اگر ہم پڑھنا چاہیں تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ فجر کے بعد تین اور عشاء کے بعد پانچ بار پڑھ لیں پھر اِس کے اثرات ملیں گے۔ لیکن جیسا ابھی عرض کیا کہ جس شیخ کامل نے پڑھنے کے لیے آپ کو یہ سورۃ بتائی، آپ کو بتاتے ہوئے اُس کی نیت کیا تھی۔ جیسی نیت تھی ویسے ہی اثرات اور ثمرات آپ کو حاصل ہوں گے۔

سوال: آپ کو اعلانِ خلیفہ پر مبارک باد۔ یہ تو پتا چلا کہ آپ خرم صاحب کو اپنا علم عطا کریں گے اور وہ بندگانِ خدا کی خدمت پر مامور ہو جائیں گے لیکن جو عرصۂ دراز سے آپ کی تربیت سے مستفیض ہو رہے ہیں اُن کا کیا مقام اور درجہ ہے؟ کیا وہ کسی قابل نہیں؟

جواب: پاکستانی فوج میں بھرتی کے لیے جب Selection ہوتی ہے تو ایک وقت میں کوئی ڈھائی سو نوجوان کاکول ٹریننگ کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ ٹریننگ کے بعد Almost سبھی آفیسر بن جاتے ہیں۔ کوئی قسمت کا مارا ہو تو ڈراپ ہو جاتا ہے۔ کئی لاکھ فوجیوں پر مشتمل ایک لمبی چوڑی فوج ہوتی ہے۔ سارے افسروں کو مختلف کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اُن کی ٹریننگ ہوتی رہتی ہے۔ اُن میں سے تقریباً 260 بریگیڈیئر بن جاتے ہیں۔ 124 کے قریب میجر جنرل اور 36 لیفٹیننٹ جنرل بنتے ہیں۔ ایک آدمی چیف بن جاتا ہے۔ اب کیا اِس کا مطلب یہ ہے کہ چیف کے علاوہ سبھی بے کار ہیں؟

ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جس شخص نے جتنے خلوصِ دل سے محنت کی ہے اور اپنی Duties ادا کی ہیں اُس کے مطابق وہ اُوپر چڑھتا اور جتنی اُس کی Length of service ہے اُتنا ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یوں دو چیزیں Combine ہو جاتی ہیں...... Length of service اور حصولِ علم و تربیت میں دلچسپی اور پھر اُس علم و تربیت کو پریکٹیکل لائف پر Apply کرنا، اِن دونوں کے پیشِ نظر ہی کوئی میجر جنرل تو کوئی لیفٹیننٹ جنرل کے مقام سے ریٹائر ہو گا جب کہ ایک آدمی ٹاپ پر چلا گیا۔ ہر مقام پر ہر انسان کا ایک Status ہے۔ اُس کی ایک اتھارٹی ہے، پاورز ہیں، Emoluments اور Privileges ہیں۔ سب کچھ اِنہی کے مطابق اُسے مل رہا ہوتا ہے۔

جب ہم فقیر کے پاس جاتے ہیں تو ہم میں سے جو Prove کرتا ہے کہ اُسے خاص توجہ دی جائے، اُسے خاص توجہ مل جاتی ہے۔ سبھی آنے والے فوجی افسران کی طرح اپنا اپنا مقام، Status، اتھارٹی، احترام اور Emoluments رکھتے ہیں۔ جو تربیت حاصل کرنے آئے اُسے تربیت ملنے لگتی ہے۔

جس کو خلافت دی جاتی ہے اُس میں شیخ کی اپنی مرضی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اگر مرضی اور صواب دید ہو تو شیخ سب سے پہلے اپنی اولاد کو نوازے گا کیوں کہ یہ انسانی فطرت ہے۔ لیکن رُوحانیت میں تو یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دشمن کو خلافت دے دی جاتی ہے۔ اپنے مرشد صاحب کے پاس سب سے آخر میں جانے والا میں تھا۔ باقی لوگوں کی نسبت اُن سے میری ملاقات کا عرصہ مختصر تھا۔ اُنھوں نے مجھے خلافت عطا کی تو اِس پر بہت Grumbling، چہ مگوئیاں اور Heart-burning ہوئی۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مرشد صاحب خلافت کسی اور کو دینا چاہتے تھے۔ ایک روز وہ بے خودی کے عالم میں بیٹھے تھے اور اُنھیں قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ کوئی اور بھی پاس بیٹھا ہے۔ وہ خود کلامی کر رہے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اُن کی نیت کسی اور کو خلافت دینے کی تھی لیکن دی مجھے۔ وہ کہہ رہے تھے واقعی علم والا اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے۔ اِس پر میں نے ذرا غور کیا تو بات کھل گئی۔ دراصل ایک صاحب اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ اُن سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اُن

صاحب نے مرشد صاحب کی خدمت بھی بہت کی تھی۔ لیکن خلافت دینے میں چوں کہ مرضی نہیں حکم چلتا ہے اِس لیے خلافت مجھے عطا کردی گئی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خلافت عطا کرتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس نے کتنی خدمت کی ہے۔ اِس کا معیار بالکل مختلف ہے۔ خلافت اُسے ملتی ہے جس کی تقدیر میں یہ لکھی ہوتی ہے۔ شیخ چاہے یا نہ چاہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر مرشد نے اپنے 25 مریدوں کو تربیت دی، ایک کو خلافت عطا کردی تو اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ باقی 24 مرید بے کار قرار دے دیے گئے۔ جو جس جس مقام پر ہے اُسی حساب سے اُس کا مقام، Status، اتھارٹی، پاورز، انعامات، Emoluments اور ثمرات ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کو Sincere attitude کتنا پسند ہے؟ بعض اوقات ہمیں اِس کا Response توقع کے مطابق نہیں ملتا۔

جواب: رب تعالیٰ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ یہ دراصل Sincerity ہی کی بات ہے۔ رب کی نظر تو ہمارے دل پر رہتی ہے کہ دل میں کیا ہے۔ میں زبان سے تو کسی کو دھوکا دے دوں گا کہ میں بہت خیر خواہ ہوں لیکن اصل میں میری نیت کیا ہے، رب اُسے بھی جانتا ہے۔

یہ جو آپ نے فرمایا کہ دُنیا میں Sincerity کا Response نہیں ملتا تو گزارش ہے کہ ہم ہمیشہ ٹھوکر کھا جائیں گے جب دُنیا سے Sincerity کا جواب چاہیں گے۔ لیکن جب یہ سوچیں گے کہ میں ہر کام اِس لیے کر رہا ہوں کہ اللہ کو پسند ہے، اللہ کا حکم ہے، آپ ﷺ کی سُنت ہے۔ مجھے اِس سے غرض نہیں کہ میری Sincerity کا نتیجہ کیا نکلے گا، اجر کیا ملے گا، میرا یہ کام مقبول ہوگا یا نہیں، جب یہ سوچ رکھیں گے تو اِس کا اجر کئی گنا بڑھ کر اِس دُنیا میں عطا ہو جاتا ہے اور اکثر نیکی کا بدلہ اُس جگہ سے نہیں ملے گا جہاں آپ نے یہ نیکی Sincerely کی ہوگی۔ بلکہ یہ کہیں اور سے ملے گا۔

آپ Review کرلیں کہ ہوش سنبھالنے سے اب تک جب بھی کوئی کام اللہ کا حکم اور آپ ﷺ کی سُنت سمجھ کر کیا اور اُس کے اجر کی توقع نہ رکھی تو کہیں اور سے کئی گنا بڑھ کر اجر عطا ہوگیا۔

اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ اگر کوئی اچھا کام کرتے ہوئے بدلے کی توقع ہو تو پھر یہ Sincerity نہیں خود غرضی ہے۔

سوال: بعض اوقات ہم تصوف کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں لیکن ایمان کی کمزوری اور گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتے؟

جواب: آپ نے اگر اولیائے کرام کے بارے میں پڑھا ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ بہت سے اولیائے کرام اِس راہ پر چلنے سے پہلے اپنے وقت کے نامی گرامی چور ڈاکو تھے۔ لیکن جب اللہ نے اُنھیں راہِ ہدایت عطا فرمادی تو پھر وہ غلط راہ سے ایسے پلٹے کہ صرف اللہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔

ہمیں رب تعالیٰ کے غفور الرحیم ہونے پر یقین ہونا چاہیے۔ رب تو اِسی انتظار میں رہتا ہے کہ میرا کوئی بندہ

معافی کا طلب گار ہو تو میں اُسے معاف کردوں۔ کوئی بندہ توبہ کرے تو میں اُسے راہِ ہدایت دکھادوں۔ رب اِس انتظار میں نہیں رہتا کہ کس وقت کوئی بندہ گناہ کرے اور میں اُسے جہنم میں ڈال دوں۔ اُس کی شان ہی یہ ہے کہ وہ مجھ جیسے گناہ گار بندوں کو سینے سے لگا کر رکھتا ہے بشرطیکہ سینے سے لگنے والا سینے سے لگنے کی نیت رکھتا ہو۔

رب تعالیٰ گناہوں سے بچالیتا ہے، گزشتہ گناہ معاف فرمادیتا ہے، بس سچے دل سے یہ کہہ دیں ''یا اللہ! میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں تُو مجھے معاف فرمادے اور آئندہ کے لیے اِستقامت بخش دے کہ میں اپنی توبہ پر قائم رہ سکوں۔'' ولایت دو قدم پر ہے بس ایک بار سچے دل سے ہمیشہ کے لیے گناہوں سے تائب ہوجائیں۔

اُسلوبِ دُعا

ہم دُعا کے لیے زندہ لوگوں کے علاوہ بزرگانِ دین کے مزارات پر بھی جاتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ جن صاحب کے پاس ہم دُعا کے لیے گئے ہیں اُنھیں اپنے معاملات تمام ترجزئیات اور تفصیلات کے ساتھ بیان کر دیں اور پھر آخر میں دُعا کے لیے عرض کریں۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کسی فقیر یا صاحبِ نظر کے پاس جائیں تو اُنھیں صرف ایک Indication دیں کہ ہم آئے کیوں؟ باقی تمام تفصیلات رب تعالیٰ خود دکھا دیتا ہے۔ اُنھیں تفصیلات بتا کر ہم اُن کا وقت ضائع کر رہے ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ صاحبِ علم ونظر ہے۔ اُسے رب نے اپنے علم کے ذریعے ایسی سمجھ عطا فرمائی ہے کہ ذرا سا Hint اُسے مل جائے تو وہ پوری بات خود سمجھ جائے گا۔ اِس مقام تک پہنچنے کے لیے وہ چوں کہ زیادہ تر غور وفکر اور اللہ کی عبادت میں مصروف رہا اِس لیے اُسے کم بولنے کی عادت ہو جاتی ہے اور جسے کم بولنے کی عادت ہو وہ زیادہ بولنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

چوں کہ وہ فقیر ہے اِس لیے طویل گفتگو سُن کر منہ سے تو کچھ نہیں کہے گا لیکن اندر سے جھنجھلائے گا۔

ہمارے بڑے کہا کرتے تھے فقیر کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔ ہم سوچتے تھے کہ ہم تو ایک بار ملنے جا رہے ہیں، دل جیت کر کیا کریں گے۔ بعد میں سمجھ آئی کہ اگر فقیر مجھ سے پیار کرنے لگا یا اُس کے دل میں میرے لیے Liking پیدا ہو گئی تو وہ دُعا کرے یا نہ کرے میرا خود بخود بھلا ہونے لگے گا۔ کیوں کہ رب تعالیٰ اِتنا وضع دار اور شان والا ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ میرے دوست کا پسندیدہ آدمی ہے تو اُس پر خاص کرم نوازی کرتا ہے اور اُس کے کام خود بخود ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اگر فقیر ہم سے چڑ گیا تو اگرچہ وہ پورے خلوص اور محبت سے دُعا کرے گا لیکن پھر بھی نقصان ہی ہوگا۔

ہم کسی فقیر کے پاس جاتے ہیں تو کوشش ہوتی ہے کہ نہ صرف اپنے رُکے ہوئے تمام معاملات کی تفصیل کاغذ پر لکھ کر لے جائیں بلکہ عزیزوں، پڑوسیوں کے مسائل بھی اِس میں شامل کر لیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ فقیر بھی انسان ہے۔

دُنیا میں ماں سے زیادہ بچے سے کوئی پیار نہیں کر سکتا۔ آپ صاحبِ اولاد ہیں آپ کا تجربہ ومشاہدہ ہوگا کہ

اگر بچہ ماں سے ایک سوال کرتا ہے تو ماں بڑے پیار اور دل جمعی وتوجہ سے جواب دیتی ہے۔ جب بچہ دوسرے کے بعد تیسرا سوال کرتا ہے تو وہ بے دلی سے جواب دیتی ہے۔ جب وہ پانچواں سوال پوچھتا ہے تو ماں اُسے ٹالنے لگتی ہے۔ آٹھویں اور نویں سوال پر بچے کو ایک چپت پڑتی ہے کہ خاموش بیٹھتے ہو یا نہیں۔

جب ماں کا یہ حال ہے تو فقیر کے پاس جانے والا شخص جب پچیس، چھبیس سوال لے کر جائے گا تو وہ کمپیوٹر تو ہے نہیں کہ آپ بٹن دبائیں اور کھٹ کھٹ جواب آنا شروع ہو جائیں۔ اُسے تو آپ کے لیے دُعا کرنی ہے۔ آپ کے پے در پے سوالات کی صورت وہ دل جمعی سے دُعا نہیں کر سکے گا۔

اگر ہم یہ احتیاط کر لیں کہ فقیر سے کم سے کم بات کریں تو فائدے میں رہیں گے۔ میں مزار پر جاتا ہوں تو باقاعدہ سیکریٹری کو ساتھ لے کر جاتا ہوں جس نے بریف کیس میں وہ فائل رکھی ہوتی ہے جس میں مَیں نے تین چار سو دُعائیں لکھی ہوتی ہیں۔ میں مزار پر لائن میں کھڑا سوال پر سوال کرتا جاتا ہوں۔ میری بلا سے پیچھے لائن میں لگے لوگ اپنی باری کے اِنتظار اور میرے وہاں طویل قیام کی وجہ سے جتنے بے زار ہو رہے ہوں۔ میں ساری فہرست سنا کر ہی وہاں سے ہلتا ہوں۔ یہ اور بات کہ دُعا ایک بھی پوری نہ ہو لیکن مجھے یہ تسلی رہتی ہے کہ میں نے تین چار سو سوال کر لیے۔

اِس نکتے کو شاید اِس بات کے ذریعے واضح کر پاؤں۔ ایک شخص میرے پاس آ کر کہے ”جی، میں سلام کرنے آیا ہوں۔ مجھے بڑی محبت ہے آپ سے۔“ جاتے ہوئے کہے ”میرا بھائی پولیس سٹیشن میں بند ہے، ذرا وہاں فون تو کر دیجیے تا کہ وہ چھوٹ جائے۔“ اگلے دن وہ پھر آئے کہ جی، سلام کرنے آیا ہوں۔ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے۔ جاتے ہوئے پھر وہ کوئی کام کہہ دے۔ جب وہ دسویں بار مجھے سلام کرنے آئے گا تو اُس کی شکل دیکھتے ہی میں گھبرانے لگوں گا کہ پھر کوئی کام آ رہا ہے۔

اِس کے برعکس ایک شخص آتا ہے۔ اپنا سر دروازہ سے اندر کر کے کہتا ہے ”السلام علیکم جناب! بس سلام کرنے آیا تھا۔ اب اجازت دیجیے، چلتا ہوں۔“ روز وہ اِسی طرح کرتا ہے، تیسرے چوتھے دن آپ اُسے اندر بُلا کر پوچھیں گے۔ آپ روز سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے تو مجھ سے کہیں۔ وہ کہے گا ”جناب کام تو کوئی نہیں۔ میں آپ سے محبت کی وجہ سے سلام کرنے آتا ہوں۔“ سلام کر کے وہ پھر چلا جائے۔ وہ روز یونہی آتا رہے گا حتیٰ کہ آپ اپنے ملازمین سے یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اُس آدمی کا خیال رکھنا۔ اگر یہ کوئی کام کہے تو فوراً کر دینا۔ اب یہ آپ نے اُس کے لیے از خود کہا ہے۔ جو دُعا فقیر از خود آپ کے لیے کرتا ہے وہ بہت تیزی سے کام کرتی ہے۔ جب آپ مزار پر جائیں تو وہاں فاتحہ پڑھیں۔ اللہ سے دُعا کریں۔ صاحبِ مزار سے اجازت لیں اور واپس چلے آئیں۔ اگر آپ باقاعدگی سے اِس رویے کے ساتھ جاتے رہیں گے تو آپ کے بہت سے کام خود بخود ہونے لگیں گے۔ (باقاعدگی سے مراد Daily، Weekly یا Monthly نہیں بلکہ جب ٹائم ملے چلے جائیں۔)

فقیر سے ہمیشہ بہت اِختصار سے گفتگو کریں۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر دُعا کے لیے اُس سے نہیں کہا تو میں زیادہ فائدے میں رہ گیا۔

میں ایک مزار پر بہت پابندی سے جایا کرتا تھا۔ صاحبِ مزار سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ جب بھی ملاقات ہوتی میں اپنی بے وقوفی میں ہر بار اُن کے پوچھنے پر کہہ دیتا، یہ کر دیجیے۔ وہ کر دیتے تھے۔ ایک بار نامعلوم مجھ سے یہ غلطی کیسے ہوگئی کہ عقل مندی کی بات کر دی۔ اُنھوں نے پوچھا ''کیا چاہیے؟'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''آج اپنی پسند کا تحفہ دے دیجیے۔'' فرمایا ''ابھی دیتا ہوں۔'' میں اُنھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ نام اور دل دونوں کے سلطان ہیں۔ میں اُن کے مزار سے باہر آ گیا، اِنتظار کرتا رہا کہ دیکھیں کیا ملتا ہے۔ پھر کچھ دیر گاڑی میں بیٹھ کر اِنتظار کیا لیکن کچھ نہ ملا حتیٰ کہ گاڑی چلا کر مین روڈ اور پھر فیصل آباد پہنچ گیا لیکن کچھ بھی نہ ملا۔

اُن دنوں اتوار کے بجائے جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ جمعہ کا وقت قریب تھا۔ مسجد سے نماز پڑھ کر باہر نکلا تو پیچھے سے ایک شخص کے سلام کرنے کی آواز آئی۔ کہنے لگے ''میں لاہور آپ کے پاس آتا رہتا ہوں۔ سامنے چائنیز ریسٹورنٹ ہے۔ میرے ساتھ کھانا کھایئے خوشی ہوگی۔'' میں نے سوچا یہ ساتھ کھانا کھانا چاہ رہے ہیں ٹھیک ہے بل میں دے دوں گا۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے، چلیے۔'' کہنے لگے دو تین اور حضرات بھی ہیں اُنھیں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ ہم ریسٹورنٹ چلے آئے۔ میں بظاہر اُن سے باتیں کر رہا تھا لیکن میرا ذہن اِس بات پر پھنسا ہوا تھا کہ ابھی تک کچھ نہیں ملا۔ اِسی اثنا میں ویٹر نے Menu سامنے رکھے۔ وہ صاحب کہنے لگے ''آپ آرڈر Place کیجیے۔ میرے پاس آپ کے لیے ایک تحفہ ہے وہ لے آؤں۔'' میں نے کہا ''بڑی مہربانی۔'' دراصل اُن دنوں میں کسی سے کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا تھا۔ کہنے لگے ''مجھے معلوم ہے آپ کسی سے کچھ لیتے نہیں لیکن یہ ایسا تحفہ ہے کہ آپ لے کر میرے احسان مند ہوں گے۔'' ایسا جملہ میں نے پہلی بار سُنا تھا کہ تحفہ دینے والا یہ کہے آپ تحفہ لے کر خود کو احسان مند Feel کریں گے۔ میں نے دل میں سوچا آخر ایسی کون سی چیز ہے؟ ریسٹورنٹ کے سامنے ہی اُن صاحب کا گھر تھا۔ وہ گئے اور تحفہ لے کر آ گئے۔ تحفہ ایک اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے بکرے کی ران ہو۔ میں نے سوچا ایسا تحفہ وصول کرنے میں احسان مندی کی کیا بات ہے۔ اُنھوں نے اُسے سامنے ٹیبل پر رکھا، اخبار ہٹایا۔ میں نے غور سے دیکھا، دِل سے آواز آئی، یہ تو آپ ﷺ کے روضۂ مبارک کی خاص نیچے کی کچی جگہ کا جاروپ مبارک ہے۔ میں نے اُن صاحب سے کہا ''آپ ﷺ جہاں آرام فرما رہے ہیں یہ وہاں کا جاروپ مبارک ہے؟'' کہنے لگے ''آپ نے بالکل صحیح پہچانا۔'' میں نے کہا ''جناب! میں زندگی بھر واقعی آپ کا احسان مند رہوں گا۔'' اگلے دن دفتر جانے سے پہلے مرشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر فاتحہ پڑھ رہا تھا تو اُن بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ بہت مسکرا کر کہنے لگے ''تحفہ پسند آیا تمھیں۔'' میں نے کہا ''حضور! کمال کی چیز دی آپ نے تو۔'' اب یہ یہاں ڈرائنگ روم (212 جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور) میں سجا ہوا ہے۔ آپ اُس کے پاس کھڑے ہو جائیں تو یہ خود بولتا ہے۔ تو یہ ایک غلطی ہوئی کہ میں نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے سلطان باہو سے کہہ دیا تھا آپ اپنی پسندیدہ چیز دے دیں۔ اگر ہم صاحبِ مزار یا فقیر پر بات چھوڑ دیں تو بہتر نتائج نکلتے ہیں۔

ایک Lighter note پر بات کرنے جا رہا ہوں۔ دُعا کرتے ہوئے مجھے 31 سال ہو گئے۔ آج کل ہر ہفتے اوسطاً 1600 لوگوں سے ملتا ہوں۔ ہر طرح کے لوگ دُعا کرانے آتے ہیں۔ لیکن دو دُعائیں آج تک نہیں بھولا۔ دونوں ایک ہی دن اِسلام آباد دُعا گھر آئے۔ ایک صاحب نے اندر آ کے خالص اپنی علاقائی زبان میں کہا ''السلام علیکم۔'' میں نے کہا ''وعلیکم السلام، فرمایئے کیا حکم ہے؟'' کہنے لگے ''او ماڑے کوں کاروبار میں بہوں نقصان ہوندا اے۔ میں سونے کوں ہتھ لاناں اوہ مٹی ہو ویندا۔'' میں نے پوچھا ''آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟'' کہنے لگے ''کاروبار تے کوئی نئیں کرناں جی۔'' میں نے کہا ''اچھا آپ کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ کر لیں تو تشریف لے آیئے گا۔ میں دُعا کر دوں گا۔'' کہنے لگے ''تُسیں دسو میں کیہڑا کاروبار کراں؟'' میں نے کہا ''جناب اگر میں اِتنا ہی قابل ہوتا تو کوئی شریف آدمی نہ ہوتا۔'' کہنے لگے ''بھائی جی! کس طرحاں پتا لگ سی کیہڑا کاروبار کراں؟'' میں نے کہا ''جناب! آپ پانچ چھ کاروبار سوچ کر لکھ لائیں۔ میں دُعا کر کے بتا دوں گا کہ کون سا کاروبار بہتر ہے۔'' کہنے لگے ''میں کس طرحاں سوچ ساں جی؟'' میں نے کہا ''یہ ملین ڈالر Question ہے۔ آپ کے جاننے والوں میں سے جن کے بارے میں آپ کو یہ خیال ہے یہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں اُن سے مشورہ کر لیں۔'' بولے ''ماڑے کوں کس طرحاں پتا لگ سی کیہڑا عقل مند تے کیہڑا بے وقوف اے؟'' میں نے کہا ''اچھا اگر آپ کو یہ نہیں پتا کہ آپ کے ملنے والوں میں کون عقل مند ہے تو آپ انٹرنیٹ گوگل پر لکھیں 'Business for New Entrepreneur' تو ایک لمبی لسٹ آ جائے گی۔ اُس میں سے آپ کاروبار منتخب کر لیں۔'' کہنے لگے ''ماڑے کول انٹرنیٹ کوئی نئیں۔'' میں نے کہا ''آپ کسی نیٹ کیفے پر چلے جایئے، وہ دس روپے میں آپ کو انٹرنیٹ اِستعمال کرنے دیں گے۔'' کہنے لگے ''ماڑے کوں انٹرنیٹ استعمال کرناں کوئی نئیں آندا۔'' میں نے سوچا اب آگے اگر میں نے اِن صاحب سے کچھ کہا تو کہیں یہ میرا بازو پکڑ کر اصرار نہ کرنے لگیں کہ آپ انٹرنیٹ پر مجھے بزنس Search کر کے دیں۔ میں نے اُن سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ آپ کسی روز تشریف لے آیئے گا میں آپ کو خود کاروبار بتا دوں گا۔

اُسی روز ایک صاحب آئے، بہت ہی ڈیسنٹ، Well-mannered، Refined اور Well-dressed۔ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ بولے تو لگا واقعی پھول جھڑ رہے ہوں۔ کہنے لگے ''شاہ صاحب! میں نے سی ایس ایس کا Exam دیا ہے۔ آپ دُعا کریں میں پاس ہو جاؤں۔'' میں نے کہا ''اگر مجھے صحیح یاد ہے تو اُس کا رزلٹ عام طور پر نومبر میں آتا ہے۔ آپ رزلٹ سے ایک ہفتہ پہلے تشریف لے آیئے گا میں دُعا کر دوں گا۔'' کہنے لگے ''مجھے معلوم ہے آپ رزلٹ سے ایک ہفتہ پہلے دُعا کے لیے بُلاتے ہیں لیکن میں نے سوچا شاید آپ نومبر تک زندہ نہیں ہوں گے تو ابھی دُعا کرا لوں۔''

اِس میں ہمارا قصور نہیں۔ دُنیاوی کاموں کی غرض دراصل ہمیں اِس نہج تک لے آتی ہے۔ میں تنقید نہیں کر رہا بلکہ ایسا رستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں جس میں آپ کو فائدہ ہو جائے۔ بہت سے لوگ آتے ہیں کہ میں نے Agent کو اِتنے پیسے دیئے ہیں، آپ دُعا کر دیں ویزا آ جائے۔ اب فقیر کیا دُعا کرے؟ کیوں کہ آپ ایک طرف تو Agent کو رشوت دے رہے ہیں دوسرے وہاں غیر قانونی طور پر جانا چاہ رہے ہیں۔ آپ

کی ایسی دُعا کی درخواست کے جواب میں فقیر کیا کرے؟

Illegal ویزا حاصل کر کے اگر میں کسی ملک میں چلا بھی جاؤں اور وہاں رزق کما بھی لوں تو وہ حلال اور جائز تو نہیں ہوگا۔ اگر ہم فقیر سے ایسی دُعا کرائیں تو انجام کیا ہوگا؟

سوال: سورہ اخلاص کی تلاوت کے دُنیاوی فوائد کیا ہیں؟

جواب: 1۔ سورہ اخلاص پڑھنے سے رزق کی تنگی دُور ہوتی ہے۔

2۔ دشواریاں دُور ہونے لگتی ہیں۔

3۔ سورہ اخلاص کا ورد مکمل کرنے والے کو اعلیٰ پائے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

لیکن نکتہ یہ ہے کہ اگر سورہ اخلاص کو اِس نیت سے پڑھیں تو یہ کوئی زیادہ مناسب بات نہیں کیوں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اِسے سورۃ توحید بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہمیں تعلیم دے رہی ہے کہ رب ایک ہے۔ یورپ میں مجھ سے کسی نے سوال پوچھا ''دو لفظ ہیں 'واحد' اور 'احد'۔ دونوں کے معنی ایک ہیں۔ اِن دونوں کو اِس طرح اِستعمال کیا گیا ہے کہ باوجود معنی ایک ہونے کے دونوں اپنی اپنی جگہ علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔'' میں نے عرض کی تھی ''بے شک واحد اور احد کے لفظی معنی 'ایک' کے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ 'واحد' گنتی کے ایک کو ظاہر کرتا ہے کہ رب ایک ہے دو تین نہیں۔ جب کہ 'احد' رب کے یکتا ہونے کے معنی میں اِستعمال ہوتا ہے کہ رب یکتا و لاثانی ہے اُس جیسا کوئی نہیں۔''

جب یہ سورۃ ہمیں رب تعالیٰ کے بارے میں تعلیم دے رہی ہے کہ اُسے کسی نے جنم دیا نہ اُس نے کسی کو جنم دیا۔ وہ All-time Powerful ہے۔ کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں تو پھر ہم جادو سے ایسے کیوں خوف زدہ ہوں کہ اُسے بھگانے کے لیے یہ سورۃ پڑھنے لگیں کہ ہم پر جادو نہ ہو۔ جب ہمارا ایمان یہ ہے کہ کوئی شخص مجھے فائدہ نہیں دے سکتا اگر میرا رب فائدہ نہ دینا چاہے، کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر رب تعالیٰ ایسا نہ چاہے۔ میرے پاس ایک گارنٹی رب کی طرف سے موجود ہے اور میں سمجھتا بھی ہوں کہ صرف میرا رب ہے جو مجھے فائدہ دے سکتا ہے۔ زندگی دے اور چھین سکتا ہے، عزت دے سکتا ہے۔ میرا رب تعالیٰ اِتنا پاور فل ہے کہ اگر وہ فائدہ دینا چاہے تو ساری دُنیا مل کر بھی مجھے نقصان سے بچا نہیں سکتی۔

جب ہم یہ مانتے ہیں تو جادو کیا قوت رکھتا ہے۔ اگر میرا رب یہ چاہے کہ جادو مجھے کوئی نقصان نہ دے سکے تو جادو کی کیا مجال کہ میرا کچھ بگاڑ لے۔

ایسے موقع پر لوگ جواب میں مجھے دلیل دیتے ہیں کہ آپ ﷺ پر بھی تو جادو ہو گیا تھا۔ یاد رکھیے! یہ بات درست نہیں۔ جس طرح آپ ﷺ کو بشری زندگی سے گزارا گیا تا کہ ہمارے لیے مثال قائم رہے کہ ہم نے زندگی کیسے گزارنی ہے۔ اِس طرح آپ ﷺ پر جادو کا اثر کر کے دکھایا گیا کہ جادو کا وجود ہے اور یہ اثر کرتا ہے۔ ہم حدیث کا اگلا حصہ بھول جاتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے فرمایا معوذتین پڑھیں، جادو کا اثر زائل ہو جائے گا اور وہ اثر زائل ہو گیا۔

رب تعالیٰ نے جادو کا وجود ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا توڑ بھی بتا دیا۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو

وقتی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں؟ اِس لیے کہ مسلمانوں کو سبق دینا ضروری تھا کہ آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی کی سزا کیا ہے؟ اِس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

جادو کا وجود ہے لیکن اِس کا توڑ بھی موجود ہے۔ جب ہمارا یقین ہے کہ ہمارا رب All-time Powerful اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے تو پھر خوف کس بات کا؟ رازق رب ہے، وہ جتنا رزق دینا چاہے اُسے کوئی گھٹا اور بڑھا نہیں سکتا تو پھر خوف کس بات کا؟ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ رب تعالیٰ کو دینے سے روک سکے یا رب اگر نہ دینا چاہے تو مجھے دلا دے۔

رب کا کلام دُنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ پڑھیں کیوں کہ یہ کلام تو کہتا ہے کہ دُنیا کی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ اِس دُنیا کو حقیر جانو۔ اور ہم اِسی کلام کو اگر دُنیا کے حصول کے لیے استعمال کریں تو یہ امر افسوس ناک ہے۔

ہم سورہ اخلاص ضرور پڑھیں لیکن اِس کے پڑھنے کے پیچھے محبت اور یہ جذبہ ہو کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، میرے رب کو Describe کرتا ہے کہ میرا رب ہے کیسا!

جب اِس سوچ کے ساتھ ہم سورہ اخلاص پڑھتے ہیں تو اِس کے بے تحاشا انعامات ہمیں ملتے ہیں۔ سب سے بڑا انعام قربِ الٰہی ہے اور جسے قربِ الٰہی مل گیا، ساری کائنات اُس کی ہے۔

ہم اگر رب تعالیٰ پر اپنے ایمان کو مضبوط کر لیں کہ رب ہمیشہ موجود رہنے والا ہے، ہم سے بے پناہ پیار کرتا ہے، ماں سے ستر گنا زیادہ ہمیں چاہتا ہے۔ جب ہماری ماں ہمیں نقصان میں جاتا نہیں دیکھ سکتی تو رب جو ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے، وہ کیسے دیکھے گا؟ ہاں بچے کو نقصان اُس کی اپنی کوتاہی سے ہوتا ہے کہ وہ جلتی آگ کو چھو لیتا ہے لیکن اُس پر مرہم ماں ہی رکھتی ہے۔ رب کہتا ہے انسان کو کوئی مصیبت نہیں آتی ماسوائے اُس کے اپنے ہاتھ کے۔

اگر ہم اپنی حماقت اور اعمال کی وجہ سے کسی مشکل میں گھر جاتے ہیں تو جس طرح ماں بچے کے جلتے ہاتھ کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے، اُس کے ہاتھ پر مرہم رکھتی اور تب تک اُس کی نرسنگ کرتی رہتی ہے جب تک چھالا ٹھیک نہ ہو جائے۔ رب تعالیٰ ہمیں مشکلات سے نکالنے والا ہے۔ وہ ہمیں ہر مصیبت، مشکل اور تکلیف سے نکال لیتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اُس کے حضور گڑگڑایا جائے۔ اُسی پر بھروسا کیا جائے۔

خلافت کی ضرورت، شیخِ کامل اور علم الاسماء

رُوحانیت کی راہ میں یہ روایت رہی ہے کہ اِس سلسلہ کو چلانے کے لیے شیخ عموماً اپنی زندگی ہی میں اپنے خلیفہ کا اعلان کر دیتے ہیں کیوں کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کس کو کب کس گھڑی رب کے پاس لوٹ جانا ہے، یہ کسی کے علم میں نہیں۔

مرشد اپنے پاس حصولِ علم کے لیے آنے والوں کو ناپتا تولتا رہتا ہے۔ جیسے ہم یونیورسٹی، کالج یا سکول جاتے ہیں تو ہر سال ایک فائنل ناپ تول ہوتا ہے اور اِس سے پہلے Quarterly exams بھی ناپ تول کا ایک طریقہ ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ ہم کس قدر سیکھ رہے ہیں۔ Final exams میں ہمیں اِس لحاظ سے پرکھا جاتا ہے کہ کیا ہم نے اِتنا سیکھ لیا کہ اگلے مرحلے میں داخل ہو سکیں۔

رُوحانیت کی راہ میں جو شخص مخلوقِ خدا کی خدمت کر رہا ہوتا ہے لوگ اُس کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے ہیں۔ جب وہ حل ہو جاتے ہیں تو وہ لوگ آنا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن جو علم حاصل کرنے آتے ہیں اُنھیں صاحبِ علم Evaluate کرتا رہتا ہے اور End پر فیصلہ کرتا ہے کہ اُن میں سے کون سا شخص اِتنا اہل ہے کہ میرے چلے جانے کے بعد اِس بوجھ کو اُٹھا سکے۔ اِس میں اہم بات ہے ''چلے جانے کے بعد''۔

Nomination کے اِس فیصلے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بزرگ کے چلے جانے کے بعد بھی System بہت Smoothly چلتا رہتا ہے۔ کچھ بزرگ ایک سے زائد لوگوں کو Nominate کرتے ہیں جیسے حضرت بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے لوگوں کو Nominate کیا جو اپنے اپنے علاقے میں خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اُنھوں نے بہت سے لوگوں کو خلافت عطا کی اور اُن کے خلیفہ اپنی اپنی ولایت میں جا کر ڈیوٹی کرتے رہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ایک شخص اپنے خلیفہ کا اعلان کر دیتا ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ Announcement کے اگلے لمحے سے ریٹائر ہو گیا یا اللہ کے پاس روانہ ہو گیا۔ خلیفہ کی Nomination سسٹم کو چلائے رکھنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ کسی شیخ کے رُخصت ہونے کے بعد لوگ پریشانی سے یہ نہ پوچھتے پھریں کہ اب اِس سلسلہ کا کیا بنے گا؟ اِسے کون چلائے گا؟

خلیفہ کے انتخاب کے حوالے سے ایک اور مثال عرض کر دوں۔ فرض کریں ایک شخص کے سو اُونٹ ہوں

اور وہ ہر اُونٹ کے بارے میں جانتا ہو کہ کون سا اُونٹ کتنا وزن اُٹھا کر صحرا میں چل سکتا ہے۔ کس اُونٹ کی Endurance کتنی High ہے کہ وہ سات دن بغیر کھائے پیے وزن اُٹھا کر صحرا میں چل پائے گا۔ کون سا اُونٹ ایسا ہے کہ وہ سات دن تک بغیر کھائے پیے صحرا میں چل تو سکے گا لیکن زیادہ وزن نہیں اُٹھا پائے گا۔ جو اُونٹ بغیر کچھ کھائے پیے زیادہ وزن اُٹھا کر صحرا میں سفر کر سکتا ہے سب سے پہلے وہ شخص اُس کا انتخاب کرے گا۔ سب سے زیادہ وزن اُس پر ڈال دے گا اور اُس سے کم وزن دوسرے اُونٹ پر لاد دے گا۔ رُوحانیت میں بھی یہی ہوتا ہے۔

ہم اکثر گفتگو میں 'شیخ' کا لفظ اِستعمال کرتے ہیں۔ رُوحانیت میں 'شیخ' اور 'شیخ کامل' یا 'مردِ کامل' کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ 'شیخ' اور 'شیخ کامل' میں فرق ہے۔ 'شیخ' وہ ہے جس کے پاس علم، تصرفات، کشف و کرامات ہوں۔ وہ مستجاب الدعوات ہو اور ہو سکتا ہے کہ اُس کے نو کے نو لطائف جسم میں Active ہوں جو کہ بہت بڑی بات ہے۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود شاید وہ 'شیخ کامل' یا 'مرد کامل' نہ ہو۔ 'شیخ کامل' وہ ہوتا ہے جو حالتِ کشف میں آپ ﷺ کے دیدار میں مصروف رہتا ہے۔ اُسے کشف سے اور کوئی غرض نہیں۔ اُس کے نزدیک کشف کی اہمیت مداری کے شعبدے سے زیادہ نہیں۔ اُسے اپنے صاحبِ دُعا ہونے سے بھی غرض نہیں کیوں کہ دُعائیں تو کافروں اور مشرکین کی بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اُسے اپنے صاحبِ تصرف ہونے سے بھی غرض نہیں کہ صاحبِ تصرف تو سادھو بھی ہوتے ہیں۔ اُن سب چیزوں کی Value اُس کے نزدیک پتھر کے کنکر سے زیادہ نہیں۔ وہ اِن چیزوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ وہ تو صرف دیدارِ رسول ﷺ میں غرق ہے۔

علم کے حصول کے آغاز سے لے کر شیخِ کامل بننے تک کے سفر میں وہ دراصل اِس نکتے سے واقف ہو گیا ہے کہ 'قربِ الٰہی'، 'اسرارِ الٰہی اور اِسرارِ کائنات مختلف چیزیں ہیں۔ یہ وہ باغ ہیں جن کا دروازہ عشقِ رسول ﷺ ہے۔ جیسے شالا مار باغ میں اُس کے مین گیٹ ہی سے داخل ہوا جا سکتا ہے اِسی طرح 'قربِ الٰہی'، 'اسرارِ الٰہی' اور 'اسرارِ کائنات' کے لیے شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ سے غیر مشروط محبت کی جائے۔ جب ایک شخص ہر شے کو چھوڑ کر آپ ﷺ کے دیدار میں غرق ہو جاتا ہے تو وہ شیخِ کامل بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیخ کامل کے شاگردوں میں ایک علیحدہ رنگ دکھائی دے گا۔ دُنیاوی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ ایک علیحدہ File دکھائی دے گی۔ وہ شاگردوں کا کمال نہیں بلکہ اُن کے شیخ کا کمال ہے کہ شاگردوں کو وہ کچھ عطا ہوا جو دوسروں کے لیے باعثِ حیرت تھا۔

اِس کے اندر ایک چیز بہت اہمیت کی حامل ہے کہ رُوحانیت بغیر قابلیت کے حاصل نہیں ہوتی۔ میں چوں کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں اِس لیے قرآن کی اِس آیت ''علم والا اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے'' کی تشریح یوں کر رہا ہوں کہ رُوحانیت بغیر قابلیت کے حاصل نہیں ہوتی۔

رُوحانیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم حاصل کیا جائے ورنہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ شیخ اگر مرید کے سامنے عالم جبروت، عالم ملکوت، عالم حیرت کا ذکر کرتا ہے اور مرید کے پاس علم نہیں تو یہ سب باتیں

اُس کے سر کے اُوپر سے گزر جائیں گی۔ لیکن اگر وہ علم حاصل کرنے کے بعد رُوحانیت کی راہ پر چلے گا تو بڑی جلدی آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

اب آپ سوال کریں گے کہ بہت سے لوگ تو بیٹھے بیٹھے ولی کامل ہو جاتے ہیں اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اولیاء اللہ میں سے زیادہ تعداد سیدوں کی ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

اِس کا جواب بہت سادہ ہے۔ ہر انسان کو Genetically علم ٹرانسفر ہوا ہے۔ وہ اِس طرح کہ ہم سب اولادِ آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے علم الاسماء عطا کیا گیا تھا۔ وہ علم الاسماء کیا تھا؟ یہ وہ علم تھا جو فرش کے نیچے سے لے کر عرش کے بالائی حصے تک (یعنی عرش کے اوپر موجود 70 حجابات سمیت) کی ہر شے کے بارے میں تھا۔

وہ اسماء کیا تھے؟ وہ 14 حروفِ مقطعات کا علم تھا۔ اِن 14 حروفِ مقطعات میں وہ پورا علم سمویا ہے جو فرش کے نیچے سے لے کر عرش کے بالائی مقام (70 حجابات بھی اِس میں شامل ہیں) سے متعلق ہے۔

اسماء دو قسم کے ہیں:

1۔ اِسم نازل۔ اِسے اِسم نازلی یا نزولی بھی کہا جاتا ہے۔

2۔ اِسم عالی۔

اِسم نازل وہ ہے جو ہم کسی چیز کو دیتے ہیں۔ جیسے آپ کرسی پر بیٹھے ہیں تو اُس کو کرسی کا نام ہم نے دیا ہے۔

اِسم عالی وہ ہے کہ اُس کا وہ نام لیا جائے جس سے اُس کی تمام خاصیتیں اور اصلیت ہم پر ظاہر ہو جائے اور ہمیں اُس کے استعمال کا پتا چل جائے۔

حضرت آدم علیہ السلام چیزوں کے اِسم نازل اور اِسم عالی دونوں سے واقف تھے۔ وہ سارا علم اولادِ آدم کو Genetically ٹرانسفر ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی فقیر سے پوچھیں کیا میں فقیر بن سکتا ہوں تو وہ جواب دے گا کیوں نہیں۔ ہر انسان صاحبِ علم و حال اور فقیر بن سکتا ہے۔

جب ہم نیکی کی راہ پر چلتے ہیں تو ہماری رُوح میں لطافت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُس کی پرواز بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بالائی خطوں میں جانے لگتی ہے۔ علم کے اُوپر والے درجے ہمیں حاصل ہونے لگتے ہیں۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان نیکی کے راستے پر چلے اور اُس راہ کو نیکی سے پالش کرے۔ عبادات تو انسان کر لے گا کیوں کہ اللہ نے آپ ﷺ کے ذریعے ہمیں بتا دیا کہ یہ فرض عبادات ہیں۔ یہ میرے احکامات ہیں۔ لیکن قرآن پاک نے نیکی کی جو راہ بتا دی اُس راہ پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری سوچ راست ہو جائے اِس لیے میں کہتا ہوں کوئی بھی شخص محنت کرے صاحبِ علم ہو جائے گا۔

دوسری بات کہ سیّدوں میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں کہ اُنھیں اِتنی جلدی ولایت حاصل ہو جاتی ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ جو علم حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوا تھا......فرش سے لے کر عرش تک کا......وہ علم آپ ﷺ کے نور میں لپٹا ہوا تھا۔ اِس علم پر آپ ﷺ کا نور محیط ہے۔ اِس نور کی تیزی اِتنی ہے کہ کوئی اِس کی تاب نہیں لا سکتا، بھسم ہو جائے گا۔ وہ انوار Genetically سیّدوں میں منتقل ہوئے ہیں اِس لیے وہ تھوڑی سی محنت کرتے ہیں اور رُوحانیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُنھیں علم Genetically بابا آدم علیہ السلام اور انوار آپ ﷺ سے ملے۔ ہم میں سے جو پڑھا لکھا انسان ہے وہ کہتا ہے کھنکناتی مٹی سے انسان تخلیق ہوا۔ مجھ جیسے انسان کے سامنے آپ ''کھنکناتی مٹی'' کے الفاظ اِستعمال کریں گے تو بات سر کے اُوپر سے گزر جائے گی۔

رب قادرِ مطلق ہے۔ اُسے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ وہ صرف سوچتا ہے اور کام ہو جاتا ہے پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے لیے مٹی اکٹھی کی گئی پھر اُسے گوندھا گیا اور اُس کے بعد پُتلا بنایا گیا؟ رب کے لیے کیا مشکل تھا کُن کہتا اور فیکون ہو جاتا۔ اِدھر سوچتا، ارادہ کرتا اُدھر کام ہو جاتا؟ اِسی طرح آپ یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ کائنات چھ دن اور چھ راتوں میں کیوں وجود میں آئی؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس سارے Process میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ جن فرشتوں نے اِس کائنات کو چلائے رکھنے کے لیے رب تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنا تھا اُنھیں اِس کائنات کے اجزائے ترکیبی اور Formulation کا علم ہونا ضروری تھا تا کہ وہ اِن احکامات کو صحیح طریقے سے Carry out کر سکیں۔ یوں اِس کائنات کو چھ دن اور چھ راتوں میں تخلیق کیا گیا تا کہ اُنھیں اچھی طرح سمجھ آ جائے کہ اِس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اُن کی Formation کن Lines پر ہوئی ہے۔

ہم ایک بائیسکل خریدنے جاتے ہیں۔ .To take maximum and best out of it ضروری ہے کہ بائیسکل کو سمجھیں کہ وہ کس Metal سے بنی ہے۔ اِس Metal کی Ultimate yield stress کیا ہے؟ اِس کی Elongation کیا ہے؟ ہمیں یہ بھی پتا ہو کہ اِس کے کون سے حصے Dye molded ہیں اور کون سے Cast کیے گئے ہیں۔ وہ بائیسکل کتنا بوجھ اُٹھا سکتی ہے؟ اُس کے Wheel کا ہب Axle پر کس طرح گھوم رہا ہے؟

اگر کوئی ہمارے سامنے بائیسکل بنائے یا کم از کم Assemble کرے تو پھر ہمیں بائیسکل کی سمجھ آ جائے گی اور ہم اِس سے اچھی طرح اِستفادہ کر سکیں گے۔

انسان کی تخلیق کے لیے جو مختلف مراحل آئے اُن میں بھی حکمت تھی۔ فرشتوں نے تمام Geological Stratas سے مٹی اکٹھی کی۔ اِس میں دس دن صرف ہوئے۔ ہمارے جسم میں مختلف منرلز، میٹلز، آئرن، فاسفورس، الیکٹرولائٹس، کاپر موجود ہیں۔ یہ جسم کی ضرورت ہیں۔ اِسی وجہ سے زمین کے تمام جیالوجیکل Strata سے مٹی اکٹھی کی گئی تھی۔ پھر اِس مٹی کو جس پانی سے گوندھا گیا وہ ایک بہت خاص چشمہ کا پانی تھا۔ وہ چشمہ شام میں آج بھی موجود ہے۔ اُس کی خاصیت یہ ہے کہ اُس کی Waterveins اِس Strat سے گزر کر

آتی ہیں جس میں تمام طرح کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ چوں کہ وہ Veins میں بہتا ہوا آرہا ہے اس لیے اس میں تمام Minerals اور Metals حل ہوتی رہتی ہیں۔ اِس میں 20 دن تک اِس مٹی کو گوندھ کر تیار کیا گیا۔ اِس کے بعد 40 روز تک اُسے خشک کیا گیا۔ اِس دوران انسان کے اعضا بن گئے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کھنکھناتی مٹی سے جو جسم بنایا گیا اُسے Brittle ہونا چاہیے تھا۔ جیسے اگر ہم مٹی کی کوئی چیز اوون میں پوری طرح نہ پکائیں اور اُسے ذرا سخت ہاتھ لگائیں تو وہ ٹوٹ جاتی ہے لیکن کھنکھناتی مٹی سے بنا وہ جسم لچکدار ہو گیا۔ جب اِس پتلے سے اعضا نکل آئے تو پھر اسے آسمانوں پر لے جایا گیا اور اس میں رُوح پھونکی گئی تو اِس میں Gel-like صفات پیدا ہو گئیں۔ میں جیلی نہیں بلکہ Gel-like کہہ رہا ہوں۔ آج بھی ہمارے جسم میں لچک ہے۔ یہ ہلتا اور Move کرتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کے بعد جنت میں بھیج دیا گیا۔ پھر اُنھیں اپنی پسلی میں درد محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ وہاں چھوٹا سا گومڑ بن گیا جو بڑھ کر اتنا بڑا ہو گیا کہ چند ماہ بعد اُس میں سے حضرت اماں حواؑ پیدا ہوئیں۔ رب تعالیٰ نے ان دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھی۔ جنت میں رہنے کے بعد وہ زمین پر اُتار دیے گئے۔ یہ سارا واقعہ آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی تو اُنھیں زمین پر بھیج دیا گیا جب کہ شیطان نے غلطی کی تو وہ ابلیس بنا دیا گیا۔ ایسا کیوں؟

فرق غلطی کا نہیں بلکہ غلطی کے بعد والے رویے میں ہے۔ حکم عدولی اور غلطی دونوں سے ہوئی لیکن حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا اور گڑگڑا کر معافی مانگی۔ وہ معاف کر دیے گئے۔ اس کے بعد انھیں زمین پر بھیج دیا گیا لیکن زمین پر بھیجا جانا تو پہلے سے Planned تھا کیوں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو قرآن کے مفہوم کے مطابق اللہ نے فرشتوں کو بتایا تھا کہ میں زمین میں اِسے اپنا خلیفہ بناؤں گا۔

غلطی شیطان سے بھی ہوئی لیکن اُس نے اِس پر ندامت کا اظہار کرنے یا معافی مانگنے کے بجائے تکبر کیا اور تکبر کے نتیجے میں ابلیس بن گیا۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے تکبر سے منع فرمایا ہے۔

سوال: اگر مرشد کو خلافت لینے والے کا چہرہ دکھا دیا جاتا ہے تو کیا وہ اُس شخص کو تلاش کرتے ہیں یا وہ خود ہی مرشد کے پاس پہنچ جاتا ہے؟

جواب: بھائی! یہ رب تعالیٰ کا نظام ہے۔ رب تعالیٰ کسی طریقے سے اُس شخص کو مرشد تک پہنچا دیتے ہیں۔

سوال: کیا خلافت صرف رُوحانی علم ہی کے تابع ہے یا رُوحانی گدی چل رہی ہو تو بھی خلافت وارث کو منتقل کی جا سکتی ہے؟

جواب: رُوحانیت میں خلافت قابلیت پر منحصر ہے۔ اِسلام میں خاندانی گدی کا کوئی تصور نہیں، چاہے وہ دُنیاوی خلافت ہو یا رُوحانی۔ خلافت کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔

سوال: کیا قبروں پر پاؤں رکھنا جائز ہے؟

جواب: ایسا کرنا قطعی طور پر غلط ہے۔ اِس سے قبر کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے تو قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

سوال: کیا قبروں کو تعظیماً چومنا جائز ہے؟ چومتے وقت نیت کیا ہو؟

جواب: اِسلام میں یہ روایت ہے کہ اپنے سے بڑے کے ہاتھ کو چوما جاتا ہے۔ عرب، ایران اور جنوبی انڈیا میں آج بھی یہ رواج ہے کہ چھوٹے اپنے سے بڑے کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ اگر قبر اصل میں نہیں بلکہ اُوپر اُس کا نشان بنا ہوا ہے تو قبر کو پاؤں والی سائیڈ سے احتراماً چومنے پر کچھ علما رخصت دیتے ہیں جب کہ کچھ علما منع کرتے ہیں۔

سوال: کیا بڑے شاہ صاحب کو میانی صاحب اُن کی خواہش پر دفن کیا گیا تھا؟

جواب: مرشد صاحب نے تین شرائط بیان کی تھیں۔ ایسی جگہ دفن کرنا جہاں سڑک، پانی اور مسجد بالکل پاس ہو۔ اُس وقت یہ واحد جگہ ایسی نظر آئی جو اِن شرائط پر پورا اُترتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اِس جگہ میں وسعت پیدا کرتا جا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ رب تعالیٰ مزید بہتر سبب بنا دے گا۔ اِس کا ایک حل میں اپنے ساتھیوں کو دے چکا ہوں کہ لوہے کے سٹینڈز بنوا لیے جائیں جو Collapsable ہوں۔ جب عرس آئے تو اُنھیں Assemble کر کے اِس طرح Fix کر دیا جائے کہ قبروں کے درمیانی جگہ پر اُن سٹینڈز کے پاؤں آ جائیں۔ اُن سٹینڈز کے اُوپر لکڑی کے تختے رکھے جائیں گے جو قبر سے ایک ایک فٹ بلند ہوں گے۔ اُن تختوں پر کارپٹ بچھا دیے جائیں گے۔ یوں ایک طرف تو عرس پر آئے زائرین کے لیے چلنا پھرنا، بیٹھنا آسان ہو جائے گا دوسرا قبروں کی بے حرمتی بھی نہیں ہو گی۔

یہاں آپ ایک بات Appreciate کیجیے گا کہ ہم سب انتظامات اپنے وسائل سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں چندہ جمع کرنے کی روایت نہیں ہے۔ نہ مجھے یہ پسند ہے نہ میں زندگی میں ایسا کرنا چاہوں گا۔ اپنے وسائل سے بہتر سے بہترین انتظامات کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ انتظامات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مستقبل میں مزید بہتری آ جائے گی۔ آپ دُعا کیجیے گا رب تعالیٰ وسائل پیدا کرتا جائے اور مجھے ہمت دے دے۔

سوال: کسی کام میں رُکاوٹ یا مشکلات آئیں تو کیسے معلوم ہو گا کہ یہ رُکاوٹیں ہمیں اِس کام سے باز رکھنے کے لیے ہیں؟ کیا ہمیں رُکاوٹوں کے باوجود کوشش کرتے رہنا چاہیے؟

جواب: مسلمان پر کوشش فرض ہے۔ ہم بغیر یہ سوچے کوشش کرتے رہیں کہ یہ کوئی رُکاوٹ ہے یا ہمیں اُونچا اُڑانے کے لیے تندیٔ بادِ مخالف ہے۔ ہم بھرپور محنت کرنے کے بعد اللہ سے دُعا کریں کہ تُو اِس کا بہترین ثمر عطا فرما دے۔ اِس کے بعد ہماری ڈیوٹی ختم۔ اب رب تعالیٰ کی مرضی ہے وہ ہمیں ہماری محنت کا کیا ثمر عطا کرتا ہے۔

آپ کوشش کرتے رہیں کیوں کہ انسان کا کام مشکلات سے کھیلتے چلے جانا ہے۔